مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشت کابل

مولانا عبد اللہ لغاری

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگزشتِ کابل



از
مولانا عبداللہ لغاری

مرتبہ
ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان

عباسی

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

تحفہ از
جناب علامہ مظہر عباسی

مولانا عبید اللہ سندھی کی

سرگذشتِ کابل

از

مولانا عبداللہ لغاری

مرتبہ

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

ایم اے (فارسی - اُردو)، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ
مصنف و مؤلف کتبِ کثیرہ

قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت

پوسٹ بکس ۱۲۳۰، اسلام آباد

قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت ملحقہ جامعۂ قائدِ اعظم اسلام آباد

طبع اوّل : ۱۹۸۰ء

قیمت : ۴۰ روپے

ناشر : قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت،
پوسٹ بکس نمبر ۱۲۳۰۔ اسلام آباد۔

طابع : فیض الاسلام پرنٹنگ پریس راولپنڈی

فہرستِ مضامین

مقدمہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی "ذاتی ڈائری" لاہور سے مولانا عبد القدوس قاسمی (حال صدر شعبۂ اسلامیات، پشاور یونیورسٹی) نے سنہ ۱۹۴۶ء میں شائع کی تھی۔ لیکن بعض سیاسی مصلحتوں کی بنا پر وہ نامکمل شایع ہوئی تھی۔ مولانا سندھیؒ کے رفیق مولانا عبد اللہ لغاریؒ جو سفر و حضر میں ان کے ساتھ تھے اور اپنے آخری ایام میں محترم ڈاکٹر عبد الواحد ہالی پوتہ صاحب (صدر شعبۂ ثقافتِ اسلامیہ و تقابلِ ادیان، سندھ یونیورسٹی) کے یہاں مقیم تھے۔ اس ڈائری کی شرح لکھتے اور لکھواتے رہے محترم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب (ناظمِ تعلیمات، سندھ یونیورسٹی) نے اس کے بعض حصے لکھے اور مواد کو یکجا کر کے اس کا ابتدائی مسودہ تیار کروایا۔ مولانا لغاریؒ مرحوم کی راقم الحروف پر بھی شفقت تھی۔ وہ برابر اپنی شرح کی زبان اور ربطِ مطالب کے سلسلے میں مجھے یاد فرماتے تھے۔ اور بار بار حک و اصلاح فرماتے تھے۔ چنانچہ اس نقل در نقل کے بکثرت مقامات اُن کے اور راقم الحروف کے قلم سے درست ہوتے رہے۔ بالخصوص مولانا لغاریؒ کی ترمیم و اصلاح سے کئی واقعات کی نہ صرف تکرار ہو گئی بلکہ اس تکرار کے ذیل میں ہر بار کچھ نئی معلومات کا اضافہ بھی ہوتا گیا، جو من و عن قائم رکھا گیا ہے۔

موجودہ نسخے میں مولانا سندھیؒ کی عبارتوں کو جلی قلم سے لکھوایا گیا ہے اور مولانا لغاری کی شرح کو خفی حروف میں رکھا گیا ہے۔ اس احتیاط کے باوجود دونوں کی عبارتیں کہیں کہیں خلط ملط بھی ہو گئی ہیں۔ لیکن چند جملوں کے بعد ایک قاری بڑی آسانی سے متن اور شرح میں فرق قائم کر سکتا ہے۔ بہرحال اس کی ترتیب میں اگر کوئی خامی ہے تو اس کی ذمہ داری راقم الحروف پر ہے جس کے لیے سوائے معذرت خواہی کے، کوئی چارہ نہیں۔

شروع کے صفحات میں مولانا سندھیؒ کے خود نوشت حالات، پھر بعد کے حالات کا اضافہ بھی اُسی "ذاتی ڈائری" سے ماخوذ ہے۔ کتاب کے آخر میں ڈائری کے شارح کے حالات بھی اجمالاً شامل کر دیے گئے ہیں۔ وَمَا تَوْفِیْقِی اِلَّا بِاللہِ۔

فقط۔ احقر

غلام مصطفےٰ خاں

خودنوشت حالات

میرا خاندان اور مولد :- میں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں (چیانوالی) میں پیدا ہوا۔ ہمارے خاندان کا اصلی پیشہ زرگری تھا۔ لیکن عرصہ سے ایک حصہ سرکاری ملازمت میں شامل ہوگیا۔ اور بعض افراد ساہوکارہ بھی کرتے رہے۔

میں عموماً سلمان فارسیؓ کے اتباع میں اپنا نام عبیداللہ بن اسلام لکھا کرتا ہوں۔ مگر بعض عرب دوستوں کے اصرار سے والد کی طرف منسوب کرکے لکھنا پڑا تو عبیداللہ بن ابی عائشہ لکھا۔ میری بڑی ہمشیرہ کا نام "جیونی" تھا۔ میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ اگر کسی نے اس سے زیادہ تصریح کے لیے کہا تو عبیداللہ بن رامابن رائے لکھوں گا میرے باپ دادا کا پورا نام رام سنگھ ولد جسپت رائے ولد گلاب رائے ہے۔ کہتے ہیں کہ میرے دادا سکھ حکومت میں اپنے گاؤں کے کاردار تھے۔

پیدائش اور یتیمی :- میں بہ شبِ جمعہ قبلِ صبح ۱۲ محرم ۱۲۸۹ھ - ۱۰ مارچ ۱۸۷۲ء پیدا ہوا۔ میرا باپ چار ماہ پہلے فوت ہوچکا تھا۔ دو سال بعد دادا بھی مرگیا تو میری والدہ مجھے ننھیال میں لے آئی۔ یہ ایک خالص سکھ خاندان تھا۔ میرے نانا کی ترغیب پر ہی میرا والد سکھ بن گیا تھا۔

میرے دو ماموں جام پور ضلع ڈیرہ غازی خاں میں پٹواری تھے جب نانا فوت ہوا تو ہم ان کے پاس چلے آئے۔ میری تعلیم ۱۸۷۸ء سے جام پور کے اُردو مڈل اسکول میں شروع ہوئی ۱۸۸۷ء میں مڈل کی تیسری جماعت میں پڑھتا تھا کہ اظہارِ اسلام کے لیے گھر چھوڑ دیا۔ اس دوران میں دو سال کے لیے میں ضلع سیالکوٹ میں رہا، اس لیے ایک سال اپنی جماعت سے پیچھے رہ گیا۔ ورنہ اپنے اسکول میں شروع ہی سے ممتاز طالب علم مانا جاتا تھا۔

مطالعہ اسلام :- ۱۸۸۴ء میں مجھے اسکول کے ایک آریہ سماج لڑکے کے ہاتھ سے

تحفۃ الہند ملی۔ میں اس کے مسلسل مطالعہ میں مصروف رہا اور بالتدریج اسلام کی صداقت پر یقین بڑھتا گیا۔ ہمارے قریب کے پرائمری اسکول (کوٹلہ مغلاں) سے چند ہندو دوست بھی مل گئے جو میری طرح تحفۃ الہند کے گرویدہ تھے۔ انھیں کے توسط سے مجھے مولانا اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان ملی۔ اس کے مطالعہ سے اسلامی توحید اور بر انک شرک اچھی طرح سمجھ میں آگیا۔ اس کے بعد مولوی محمد صاحب لکھوکی کی کتاب احوال الآخرۃ پنجابی ایک مولوی صاحب سے ملی۔ اب میں نے نماز سیکھ لی اور اپنا نام تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر عبید اللہ خود تجویز کیا۔ احوال الآخرۃ کا بار بار مطالعہ اور تحفۃ الہند کا وہ حصہ جس میں نومسلموں کے حالات لکھے ہیں، یہی دو چیزیں جلدی اظہارِ اسلام کا باعث بنیں، ورنہ اصلی ارادہ یہ تھا کہ جب کسی ہائی اسکول میں اگلے سال تعلیم کے لیے جاؤں گا تو اس وقت اظہارِ اسلام کروں گا۔

اظہارِ اسلام :۔ ۱۵ ؍ اگست ۱۸۸۷ء کو توکلاً علی اللہ نکل کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ کوٹلہ مغلاں کا ایک رفیق عبدالقادر تھا۔ ہم دونوں عربی مدرسہ کے ایک طالب علم کے ساتھ کوٹلہ رحم شاہ ضلع مظفر گڑھ میں پہنچے۔ ۹ ؍ ذی الحجہ ۱۳۰۴ھ کو میری سنتِ تطہیر ادا ہوئی۔ اس کے چند روز بعد جب میرے اعزہ تعاقب کرنے لگے تو میں سندھ کی طرف روانہ ہوگیا۔ عربی صرف کی کتابیں میں نے راستہ میں اسی طالب علم سے پڑھنا شروع کر دی تھیں۔

سید العارفین کی صحبت :۔ اللہ کی خاص رحمت سے جس طرح ابتدائی عمر میں اسلام کی سمجھ آسان ہوگئی اسی طرح کی خاص رحمت کا اثر یہ بھی ہے کہ سندھ میں حضرت حافظ محمد صدیق صاحب (بھر چونڈی والے) جو اپنے وقت کے جنید اور سید العارفین تھے، چند ماہ میں ان کی صحبت میں رہا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسلامی معاشرت میرے لیے اس طرح طبیعتِ ثانیہ بن گئی جس طرح ایک پیدائشی مسلمان کی ہوتی ہے۔ حضرت نے ایک روز میرے سامنے اپنے لوگوں کو مخاطب فرمایا (غالباً مولانا ابو الحسن امروٹی جن کا ذکر آگے آئے گا اس مجمع میں موجود تھے)، کہ عبید اللہ نے اللہ کے لیے ہم کو اپنا ماں باپ بنایا ہے۔ اس کلمۂ مبارکہ کی تاثیر خاص طور پر میرے دل میں محفوظ ہے۔ میں انھیں اپنا دینی باپ سمجھتا ہوں۔ اور محض اس لیے سندھ کو مستقل وطن بنایا، یا بن گیا۔ میں نے قادری راشدی طریقہ میں حضرت سے بیعت کر لی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ محسوس ہوا کہ بڑے

سے بڑے انسان سے بہت کم مرعوب ہوتا ہوں۔ تین چار ماہ بعد میں طالب علمی کے لیے رخصت ہوا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ حضرت نے میرے لیے خاص دعا فرمائی۔ "خدا کرے کہ عبیداللہ کا کسی راسخ عالم سے پالا پڑے۔" میرے خیال میں خدا نے یہ دعا قبول فرمائی۔ اور اللہ رب العزۃ نے محض اپنے فضل سے مجھے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں پہنچا دیا۔

سید العارفین کے خلیفہ:۔ "پھر چونڈی سے رخصت ہو کر میں اس طالب علم کے ساتھ ریاست بھاول پور کی دیہاتی مساجد میں ابتدائی عربی کتابیں پڑھتا رہا۔ اس نقل و حرکت میں دین پور پہنچا، جہاں سید العارفین کے خلیفۂ اول مولانا ابوالسراج غلام محمد صاحب رہتے تھے۔ ہدایۃ النحو تک کتابیں میں نے یہیں مولوی عبدالقادر صاحب سے پڑھیں۔ حضرت خلیفہ صاحب نے میری والدہ کو خط لکھوایا۔ وہ آگئیں۔ اور واپس لے جانے کے لیے بہت زور لگایا۔ مگر میں بحمداللہ ثابت قدم رہا (یہ غلط ہے کہ میری والدہ دیوبند پہنچی)۔ شوال ۱۳۰۵ھ میں دین پور متصل خان پور سے کوٹلہ رحم شاہ چلا آیا۔ اور مولوی خدا بخش صاحب سے کافیہ پڑھا۔ یہیں ایک نو وارد طالب علم سے ہندوستانی مدارسِ عربیہ کا حال معلوم ہوا، اور میں اسٹیشن مظفر گڑھ سے ریل پر سوار ہو کر سیدھا دیوبند پہنچا۔

دارالعلوم دیوبند:۔ صفر ۱۳۰۶ھ کو میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا۔ تخمیناً پانچ مہینے میں قطبی تک منطق کے رسائل متفرق اساتذہ، اور شرح جامی مولانا حکیم محمد حسن صاحب سے پڑھی۔ ایک فاضل استاد کی مہربانی سے طریقۂ مطالعہ سیکھ لیا۔ اور محنت سے ترقی کا راستہ کھل گیا۔

حکمت و منطق کی کتابیں جلدی ختم کرنے کے لیے چند ماہ مولانا احمد حسن کانپوری کے مدرسہ میں چلا گیا۔ اور پھر چند ماہ مدرسہ عالیہ رام پور میں رہ کر مولوی ناظر الدین صاحب سے کتابیں پڑھ لیں۔ اس طرح صفر ۱۳۰۷ھ کو پھر دیوبند واپس آگیا۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ:۔ دیوبند میں دو تین مہینے تک مولانا حافظ احمد صاحب سے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مولانا شیخ الہندؒ کے درس میں شامل ہو گیا۔ ۱۳۰۷ھ کو ہدایہ، تلویح، مطول، شرح عقائد، مسلم الثبوت میں امتحان دیا اور امتیازی نمبروں میں کامیاب ہوا۔ مولانا سید احمد صاحب دہلوی مدرس اول نے میرے جوابات کی بہت تعریف کی۔ فرمایا "اگر اس کو کتابیں ملیں تو شاہ عبدالعزیز ثانی ہو گا"۔

چند دوستوں نے مبشرہ خواب دیکھے۔ میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی خواب میں دیکھا۔ رمضان شریف میں اصولِ فقہ کا ایک رسالہ لکھا۔ جسے شیخ الہندؒ نے پسند فرمایا۔ اس میں بعض مسائل اس طرح تحریر کیے جن میں جمہور اہلِ علم کے خلاف محققین کی رائے کو ترجیح دی تھی۔ مثلاً تاویل المتشابہات ناممکن الحصول نہیں، بلکہ راسخین فی العلم وہ بھی علم سے جانتے ہیں۔

شوال ۱۳۰۷ھ سے تفسیر بیضاوی اور دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔ جامع ترمذی مولانا شیخ الہندؒ سے پڑھی اور سننِ ابوداؤد کے لیے حضرت مولانا رشید احمد صاحب کی خدمت میں گنگوہ پہنچا۔

جہاں آباد دہلی:۔ بیمار ہو کر گنگوہ سے دہلی چلا آیا۔ حکیم محمود خاں کے علاج سے فائدہ ہوا۔ حدیث کی باقی کتابیں مولوی عبدالکریم صاحب پنجابی دیوبندی سے جلدی جلدی ختم کر لیں۔ مجھے یاد ہے کہ سننِ نسائی اور سننِ ابنِ ماجہ میں نے چار چار دن میں پڑھی تھیں۔ اور سراجی دو گھنٹہ میں ختم کر لی۔ مولوی صاحب حضرت مولانا قاسم اور حضرت مولانا رشید احمد کے غیر معروف محقق شاگرد تھے۔ اثنائے قیام دہلی میں دو دفعہ مولانا نذیر حسین صاحب کی خدمت میں گیا۔ صحیح بخاری اور جامع ترمذی میں دو سبق بھی سنے۔

حالاتِ سندھ:۔ ۲۰ جمادی الثانیہ ۱۳۰۸ھ کو دہلی سے سیدھا بھرچونڈی ضلع سکھر پہنچا۔ (اس تمام سفر میں ایاباً و ذہاباً لاہور نہیں اترا۔ اور مسجد چینیاں نہیں گیا)۔ میرے مرشد میرے آنے سے دس دن پہلے وفات پا چکے تھے۔ رجب ۱۳۰۸ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے اجازت نامہ تحریر فرما کر بھیج دیا۔ اور مولوی کمال الدین صاحب نے مجھ سے سننِ ابی داؤد پڑھی۔

سید العارفین کے دوسرے خلیفہ:۔ شوال ۱۳۰۸ھ سے سید العارفین کے دوسرے

خلیفہ مولانا ابوالحسن تاج محمود صاحب کے پاس امروٹ ضلع سکھر میں چلا گیا۔ انھوں نے اپنے مرشد کا وعدہ پورا کر دکھایا۔ میرے لیے بمنزلۂ باپ کے تھے۔ میرا نکاح سکھر کے اسلامیہ اسکول کے ماسٹر مولوی محمد عظیم خاں یوسف زئی کی لڑکی سے کرایا۔ میری والدہ کو بلایا۔ وہ میرے پاس اخیر وقت تک میرے طرز پر رہیں۔ میرے مطالعہ کے لیے بہت بڑا کتب خانہ جمع کیا۔ میں ان کے ظل عاطفت میں ۱۳۱۵ھ تک اطمینان سے مطالعہ کرتا رہا۔

کتب خانہ پیر صاحب العلم:۔ گوٹھ پیر جھنڈا ضلع حیدرآباد میں راشدی طریقہ کے پیر صاحب العلم کے پاس علوم دینیہ کا کتب خانہ تھا۔ میں دورانِ مطالعہ میں وہاں جاتا رہا اور کتابیں مستعار بھی لاتا رہا۔ میرے تکمیل مطالعہ میں اس کتب خانہ کے فیض کا بڑا دخل تھا۔

حضرت پیر صاحب العلم کی صحبت:۔ اس کے علاوہ مولانا رشید الدین صاحب العلم الثالث کی صحبت سے مستفید ہوا۔ میں نے ان کی کرامتیں دیکھیں۔ ذکر اسماء الحسنیٰ میں نے انھیں سے سیکھا۔ وہ دعوت توحید و جہاد کے ایک مجدد تھے۔ پھر حضرت مولانا ابوالتراب رشد اللہ صاحب العلم الرابع سے علمی صحبتیں رہیں۔ وہ علم حدیث کے بڑے جیّد عالم اور صاحب تصنیف تھے۔ ان کے ساتھ قاضی فتح محمد صاحب کی علمی صحبت بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔

میری علمی تحقیقات کا مرکز:۔ اللہ کی رحمتوں میں سے ایک نعمتِ عظمیٰ جس کا شکریہ میں ادا نہیں کرسکتا یہ ہے کہ فقہ و حدیث کی تحقیق و تطبیق میں اور ایسا ہی قرآنِ کریم کی تفسیر میں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی سے شروع کرکے امام ولی اللہ دہلوی تک سلسلۂ علماء میرا راہبر بنا۔ اور ان کو میں نے اپنا امام بنا لیا۔ مجھے اپنی علمی و سیاسی ترقی میں اس سلسلہ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس سے میری تمام کوششیں ایک اصول پر منظم ہوگئیں۔ اور میں اسلام کی فلاسفی سمجھنے کے قابل ہوگیا۔ میں نے دہلی میں قبلہ نما کا مطالعہ کیا۔ اس کے معارف میری روح سے پیوست ہوگئے۔ حدیث کی تحقیق میں حجۃ اللہ البالغہ کا تعارف مولانا شیخ الہندؒ نے کرایا تھا۔ آخر میں اس طرح کے مطالعہ سے مجھے اطمینان نصیب ہوا۔ میں نے علماء کو حجۃ اللہ البالغہ پڑھائی اور کافی عرصہ بعد حضرت شیخ الہندؒ سے پڑھی۔

طریقۂ قادریہ:۔ اس عرصہ میں طریقہ قادریہ اور نقشبندیہ مجددیہ کے اشغال و اذکار بھی

حسب الاستطاعت حضرت سید العارفین کے خلیفۂ اعظم مولانا ابو السراج دین پوری سے سیکھتا رہا اگر میری کوئی دنیاوی ضرورت امروٹ میں پوری نہ ہوتی تو دین پور سے حاصل کر لیتا۔ اس طرح مجھے اپنے مرشد کی جماعت سے باہر جانے کی ضرورت نہیں ہوئی۔

میرا سیاسی میلان:۔ دورانِ مطالعہ میں مولانا اسمٰعیل شہید کی سوانح عمری دیکھی۔ اسلامی مطالعہ کی ابتدا سے میرا قلبی تعلق مولانا مرحوم سے پیدا ہو چکا تھا۔ دیوبند کی طالب علمی نے بہت سے واقعات اور حکایات سے آشنا کر دیا تھا۔ مولانا عبدالکریم دیوبندی نے سقوطِ دہلی کی تاریخ آنکھوں دیکھی بتا دی تھی۔ میرا دماغ بچپن سے خاندانی عورتوں کی صحبت میں انقلاب پنجاب کے تکلیف دہ حالات سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں ایک قسم کا انقلاب آیا۔ پہلے جو کچھ لاہور کے لیے سوچتا تھا، اب دہلی کے لیے سوچنے لگا۔ مولانا شہید کے مکتوبات میں سے ایک مضمون لے کر میں نے اپنا مختصر سیاسی پروگرام بنا لیا۔ وہ اسلامی بھی تھا اور انقلابی بھی۔ مگر ہند کے باہر مسلمانوں کی تحریک سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ میں نے حجۃ اللہ پڑھنے والی جماعت کو اس میں شامل کر لیا۔ اور اس طرح اپنے خیال کے موافق آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کر دیا۔

معاودتِ دیوبند:۔ ۱۳۱۵ھ میں دیوبند پہنچا۔ اپنے مطالعہ کا نمونہ دو رسالے لکھ کر ساتھ لے گیا۔ ایک علم حدیث میں اور دوسرا فقہ حنفی میں۔ حضرت مولانا نے دونوں رسالے پسند فرمائے اس دفعہ دس بارہ حدیث کی مشہور کتابوں کے اطراف سنا کر دوبارہ شفاہاً اجازت حاصل کی۔

بعض مسائلِ جہاد کے ضمن میں ہماری اس جماعت کا بھی ذکر آیا۔ حضرت مولانا نے اسے بہت پسند فرمایا۔ اور چند اصلاحات کا مشورہ دے کر اسے اتحادِ اسلامی کی ایک کڑی بنا دیا۔ اس کام کو جاری رکھنے کی وصیت کی۔ اس کے بعد میرے تعلیمی اور سیاسی تمام مشاغل حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ سے وابستہ رہے۔

دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈا:۔ امروٹ واپس آکر میں نے مطبع قائم کیا اور دو سال تک چلایا۔ بعض عربی و سندھی نایاب کتابیں طبع ہوئیں اور ایک ماہوار رسالہ ہدایت الاخوان چھپتا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ بنانے کی کوشش جاری کی۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ ہمارا کام بغیر مدرسے کے چل نہیں سکتا تھا۔ اس لیے دوسری جگہ کی تلاش میں تھا کہ حضرت مولانا راشد اللہ

صاحب العلم الرابع نے ۱۳۱۹ھ میں میری تجویز کے موافق مدرسہ بنانے کا ارادہ کیا۔ یہ نام بھی میری تجویز سے مقرر ہوا۔ میں اس میں شریک ہو گیا۔ سات سال تک علمی و انتظامی کامل اختیارات کے ساتھ کام کرتا رہا۔ اکابر علماء میں سے حضرت مولانا شیخ الہند اور حضرت مولانا شیخ حسین بن محسن یمانی امتحان کے لیے تشریف لائے۔ اس مدرسہ میں بھی میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں کی اور امام مالکؒ کو بھی خواب میں دیکھا۔

جمعیۃ الانصار دیوبند:- ۱۳۲۷ھ میں حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند طلب فرمایا اور مفصل حالات سن کر دیوبند رہ کر کام کرنے کے لیے حکم دیا۔ اور فرمایا کہ اس کے ساتھ سندھ کا تعلق بھی قائم رہے گا۔ چار سال تک جمعیۃ الانصار میں کام کرتا رہا۔ اس جمعیۃ کی تحریکِ تاسیس میں مولانا مولانا محمد صادق صاحب سندھی اور مولانا ابو محمد احمد لاہوری اور عزیزی مولوی احمد علی میرے ساتھ شریک تھے۔

نظارت المعارف دہلی:- حضرت شیخ الہندؒ[۱] کے ارشاد سے میرا کام دیوبند سے دہلی منتقل ہوا۔ ۱۳۳۱ھ میں نظارت المعارف قائم ہوئی۔ اس کے سرپرستوں میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ حکیم اجمل خاں اور نواب وقار الملک ایک ہی طرح شریک تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے جس طرح چار سال دیوبند میں رکھ کر میرا تعارف اپنی جماعت سے کرایا اسی طرح دہلی پہنچ کر مجھے نوجوان طاقت سے ملانا چاہتے تھے۔ اس غرض کی تکمیل کے لیے دہلی تشریف لے آئے اور ڈاکٹر انصاری سے میرا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر انصاری نے مجھے مولانا ابو الکلام اور محمد علی مرحوم سے ملایا۔ اس طرح تخمیناً دو سال مسلمانانِ ہند کی اعلیٰ سیاسی طاقت سے واقف رہا۔

---

[۱] حضرت یوسفؒ کی اقتدا میں مولانا سندھی نے ان تلخ واقعات کا تذکرہ یہاں نہیں کیا جو ان کے دیوبند چھوڑنے کا باعث بنے۔ رولٹ کمیشن کی رپورٹ میں ان کی طرف اشارہ موجود ہے۔ جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مدرسہ کے اربابِ اہتمام نے ان کی سیاسی سرگرمیوں کو روکنے کے لیے ان کے چند مسائل کو بہانہ بنا کر ان پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ اور انھیں مدرسہ سے الگ کیا۔ جس کے بعد مولانا دہلی چلے گئے۔ اور وہیں مرکز قائم کر کے مولانا شیخ الہندؒ کی ہدایات کے مطابق کام کرتے رہے۔ انھیں واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا انور شاہؒ نے دیوبند سے مولانا سندھی کے نام مکہ معظمہ پیغام بھیجا تھا کہ قیامِ دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لیے تکلیف کا باعث بنا تھا۔ اب میرے دل میں آپ کے لیے کوئی رنج نہیں۔ امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائیں گے۔

ہجرتِ کابل:۔ ۱۳۳۳ھ (۱۹۱۵ء) میں شیخ الہندؒ کے حکم سے کابل گیا۔ مجھے کوئی مفصل پروگرام نہیں بتایا گیا تھا۔ اس لیے میری طبیعت اس ہجرت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن تعمیلِ حکم کے لیے جانا ضروری تھا۔ خدا نے اپنے فضل سے نکلنے کا راستہ صاف کر دیا۔ اور میں افغانستان پہنچ گیا۔ دہلی کی سیاسی جماعت کو میں نے بتلایا کہ میرا کابل جانا طے ہو چکا ہے۔ انھوں نے بھی مجھے اپنا نمائندہ بنایا۔ مگر کوئی معقول پروگرام وہ بھی نہ بتلا سکے۔ کابل جا کر مجھے معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ قدس سرہٗ جس جماعت کے نمائندہ تھے اس کی پچاس سال کی محنتوں کے حاصل میرے سامنے غیر منظم شکل میں تعمیل حکم کے لیے تیار ہیں۔ ان کو میرے جیسے ایک خادمِ شیخ الہندؒ کی اشد ضرورت تھی۔ اب مجھے اس ہجرت اور شیخ الہند کے اس انتخاب پر فخر محسوس ہونے لگا۔

میں سات سال تک حکومتِ کابل کی شرکت میں اپنا ہندوستانی کام کرتا رہا۔ سنہ ۱۹۱۹ء میں امیر حبیب اللہ خاں نے ہندوؤں سے مل کر کام کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیل میرے لیے فقط ایک ہی صورت میں ممکن تھی کہ میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہو جاؤں۔ اس وقت سے میں کانگریس کا ایک داعی بن گیا۔ یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ امیر صاحب مرحوم اتحادِ اسلام کے کام سے ہندوستانی کام کو زیادہ پسند کرتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں امیر امان اللہ خاں کے دور میں میں نے کانگریس کمیٹی کابل بنائی جس کا الحاق ڈاکٹر انصاری کی کوششوں سے کانگریس کے گیا سشن نے منظور کر لیا۔ برٹش ایمپائر سے باہر یہ پہلی کانگریس کمیٹی ہے اور میں اس پر فخر کر سکتا ہوں کہ میں اس کا پہلا پریسیڈنٹ ہوں۔

سیاحتِ روس:۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں ترکی جاتا ہوا سات مہینہ ماسکو میں رہا۔ سوشلزم کا مطالعہ اپنے نوجوان رفیقوں کی مدد سے کرتا رہا۔ چونکہ نیشنل کانگریس سے تعلق سرکاری طور پر ثابت ہو چکا تھا اس لیے سوویٹ روس نے اپنا معزز مہمان بنایا اور مطالعہ کے لیے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائیں (یہ غلط ہے کہ میں لینن سے ملا، کامریڈ لینن اس وقت ایسا بیمار تھا کہ اپنے قریبی دوستوں کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا)۔

میرے اس مطالعہ کا نتیجہ ہے کہ میں اپنی مذہبی تحریک کو جو امام ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ کی ایک شاخ ہے اس زمانے کے لادینی حملہ سے محفوظ کرنے کی تدابیر سوچنے میں کامیاب ہوا۔

میں اس کامیابی پر اول انڈین نیشنل کانگریس دوم اپنے ہندوستانی نوجوان رفقا جن میں ہندو بھی شامل ہیں اور مسلمان بھی، سوشلسٹ بھی اور نیشلسٹ بھی سوم سوویٹ روس کا ہمیشہ ممنون اور شکرگزار رہوں گا۔ اگر ان تین طاقتوں کی مدد مجھے نہ ملتی تو میں اس تخصص اور امتیاز کو کبھی حاصل نہ کر سکتا۔ فللّٰہ الحمد وحدہٗ۔

جدید ترکیہ:۔ سنہ ۱۹۲۳ء میں انقرہ پہنچا۔ میرے لیے سفیر ترکیہ متعین ماسکو اور وزارتِ خارجہ ماسکو نے مل کر سفر کا راستہ متعین کر دیا تھا اور برطانوی کارندے اس کا پتہ نہ لگا سکے (یہ غلط ہے کہ میں استنبول اس زمانہ میں پہنچا جب برطانیہ اور فرانس اس پر قابض تھے)۔ تقریباً تین سال ترکی میں رہا ہوں میں نے تحریک اتحادِ اسلام کا تاریخی مطالعہ کیا۔ مجھے مستقبل قریب میں اس کا کوئی مرکز نظر نہیں آیا۔ اس لیے میں نے ترکوں کی طرح اپنی اسلامی مذہبی تحریک کو انڈین نیشنل کانگریس میں داخل کرنا ضروری سمجھا۔ اور کانگریس میں اپنے اصول کی ایک پارٹی کا پروگرام چھاپ دیا جس سے میری مذہبی تحریک ہر ایک مخالف انقلاب سے محفوظ رہ سکتی ہے۔

ہمارا پروگرام:۔ یورپ کو اس طرح اسلام کا تعارف کرانے میں میرا خیال ہے کہ میں استاذ الاستاذ اور اپنے امام مولانا محمد قاسم صاحب دیوبندی کی ایک قلبی خواہش کو عملی جامہ پہناتا ہوں۔

اس پروگرام کو ...۔ ترکی پریس سے شائع کرنے کے لیے انقرہ گورنمنٹ کی اجازت حاصل کی گئی۔ وزارتِ خارجہ نے دو مختلف مترجموں سے ترجمہ کرا کے جب تک اس کا حرف حرف نہیں پڑھ لیا، اجازت نہیں دی۔ بعض ہندو دوست اُردو نہیں پڑھ سکتے تھے ان کی سہولت کے لیے میں نے اس کا انگریزی ترجمہ بھی شایع کر دیا ہے۔ استنبول میں لالہ لاجپت رائے سے تبادلۂ افکار ہوا۔ اور ایسا ہی ڈاکٹر انصاری سے اچھی طرح باتیں ہوئیں۔ ہمارے بزرگ نہ اسے مان سکتے تھے نہ اس کا اچھا بدل بتلا سکتے ہیں۔ اور کوشش کریں گے کہ ہمیں ہزار دو ہزار سال پہلے زمانہ میں لا کھڑا کر دیں۔ البتہ پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک آدھ فقرہ اس کی پسندیدگی پر لکھا ہے وہ میرے لیے باعثِ سرور ہے۔

میں نے اپنے پروگرام میں عدمِ تشدد کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس میں مہاتما گاندھی کا ممنون ہوں۔ میں عدمِ تشدد کو اخلاقی اصول مانتا تھا۔ لیکن اس بنا پر پولیٹکل پروگرام کی تشکیل اور اس کی

اہمیت میں نے گاندھی جی سے سیکھی ہے۔ گاندھی جی نے مجھے حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تعلیم یاد دلادی۔ میں جانتا ہوں کہ اسلام کے پہلے دور میں اس اصول سیاسی پر عمل ہوتا رہا ہے اَلْکَلِمَۃُ الْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ حَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا۔

مکہ معظمہ :۔ ۱۳۴۴ھ موسم حج پر مکہ معظمہ میں موتمر خلافت منعقد ہوئی۔ میرے تمام دوست اس میں آرہے تھے۔ میں نے محض ان سے ملنے کی خاطر اٹلی کے راستے سے مکہ معظمہ پہنچنے کی کوشش کی۔ مگر میں موتمر ختم ہونے کے بعد صفر ۱۳۴۵ھ میں پہنچا۔ میں اپنی پوزیشن صحیح طور پر پہچانتا تھا۔ میں نے حجاز گورنمنٹ کو یقین دلایا کہ یہاں میں کوئی سیاسی پروپیگنڈا نہیں کروں گا۔ اس وجہ سے میں ایک طرح محفوظ ہوگیا۔ اگر کبھی کسی جزوی امداد کی میں نے درخواست کی تو حکومت نے اُسے پورا کردیا۔ میرے اپنے طور پر رہنے میں اولیاء امور حارج نہیں ہوئے۔ اس لیے وہ میری طرف سے بہت بہت شکریہ اور دعا کے مستحق ہیں۔ جَزَاھُمُ اللّٰہُ خَیْرًا۔

علماء مکہ سے استفادہ :۔ مجھے اہل مکہ میں سے تین ہندوستانی اور ایک عرب خاندان نے خاص طور پر علمی امداد دی۔ سب سے پہلے شیخ عبدالوہاب دہلوی (حاجی علی جان والے) دوسرے عبدالستار بن عبدالوہاب (دہلی) مرحوم۔ تیسرے ابوالمشرف مجددی۔ ان کے کتب خانوں سے میں نے استفادہ کیا۔ عرب خاندان سے میری مراد شیخ محمد بن عبدالرزاق بن حمزہ شیخ الحدیث مکہ اور شیخ ابوالسمح عبدالظاہر امام الحرم کا خاندان ہے۔

میرا علمی مشغلہ :۔ میں یقیناً ۱۲۔۱۳ سال سے قرآن عظیم اور حجۃ اللّٰہ البالغہ کا بہ نظر عمیق مطالعہ کرتا رہا۔ تفسیر قرآن عظیم میں جس قدر مقامات میرے لیے مشکل تھے، اس زمانہ میں انھیں امام ولی اللّٰہ دہلوی کے اصول پر بالاطمینان حاصل کرسکا۔ جو لوگ میری طرح امام ولی اللّٰہ دہلی کو نہیں مان سکتے ان کو مطمئن کرنے کا دعویٰ میں نہیں کرسکتا۔ لیکن مجھے اپنے اصول پر قرآن عظیم میں اس زمانہ میں قابل عمل تعلیم کا ایک علمی نصاب نظر آیا۔ اس میں اس تجلی ریز مقدس مقام کی تاثیر ضرور ماننا پڑتی ہے۔

میں نے امام ولی اللّٰہ دہلوی کی مشہور کتابوں کا خاص طور پر مطالعہ جاری رکھا۔ مثلاً بدور بازغہ، خیر کثیر، تفہیمات الٰہیہ، سطعات، الطاف القدس، لمعات وغیرہ۔

اِن کتابوں کے لیے بطور مفتاح میں نے مولانا رفیع الدین دہلوی کی تکمیل الاذہان اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ کی عبقات اور مولانا محمد قاسم کی قاسم العلوم اور تقریر دلپذیر اور آبِ حیات کو استعمال کیا۔

مجھے لوگوں کے پڑھانے کا بھی موقع ملتا رہا۔ اور ساتھ ہی مدارسۂ قرآن حکیم بھی جاری رہی۔ اس سے میرے نظریات بہت وسیع ہو گئے۔ للہ الحمد۔

امام ولی اللہ دہلوی کی حکمت کا مدرسہ:۔ اگر مجھے موقع دیا جائے کہ میں امام ولی اللہ دہلوی کو حکمت کا مجتہد مستقل فرض کر لوں، اور امام عبد العزیز دہلوی اور مولانا رفیع الدین دہلوی کو اس حکمت کے منتسب اور مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا محمد قاسم کو مجتہد فی المذہب کے مرتبہ پر تسلیم کر لوں، تو میں اس حکمت کا ایسا اسکول قائم کر سکتا ہوں جس میں (الف) قرآن عظیم (ب) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و سنت خلفاء الراشدین (ج) تاریخ اسلام کی پوری عقلی تشریح ممکن ہو۔ اس کے بعد تمام مذاہب عالم اور ان کی کتب مقدسہ کی تحقیق و تطبیق اس اصول پر آسان ہو جائے۔ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

مراجعتِ وطن:۔ ۱۹۳۶ء سے انڈین نیشنل کانگریس نے میری واپسی کے متعلق کوشش شروع کی۔ اور میرے تمام دوست اس کی تائید میں کام کرتے رہے۔ اس میں سیاسی مسلک کے اتحاد و اختلاف کا کوئی فرق نہیں رہا۔ اس طرح کی کوششوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ مجھے یکم نومبر ۱۹۳۷ء اجازتِ واپسیِ وطن کی اطلاع ملی۔ اور یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو پاسپورٹ دینے کا فیصلہ معلوم ہوا۔ حج کا موسم سر پر آگیا اس لیے ادائے مناسک کے بعد سے فراغت پر واپسی کا ارادہ ہے۔ (واللہ الموفق)۔

(اس کے بعد کے حالات مولانا عبد القدوس قاسمی صاحب نے شامل کیے ہیں)۔

ہندوستان آنے کی تمنا کیوں تھی؟ اگرچہ مولانا کا ارادہ ۱۹۳۸ء ہی میں ہندوستان آنے کا ہو گیا تھا، مگر نامعلوم واقعات کی بنا پر ان کا آنا ایک سال کے لیے معطل ہوا۔ اور وہ ۱۹۳۹ء میں سرزمینِ عرب سے روانہ ہو سکے۔ مولانا نے ایک خاص مقصد (احیائے اسلام) کے لیے اپنی زندگی وقف سمجھی تھی۔ اور زندگی کے ہر مرحلے پر ان کے مطالعہ اور ان کے تصورات کا محور اسی مقصد کا حصول تھا۔ طویل اسفار اور گرد و پیش کے افکار کا مطالعہ و تنقید اور وسیع عرصہ کے غور و فکر کے بعد بلد اللہ الحرام میں انھوں نے اپنے طور پر ایک نظامِ کار متعین کر لیا تھا۔ اور ہندوستان کی تمنائیں صرف اس لیے تھیں کہ یہاں ان کو اپنے افکار کے پھیلانے اور ایک صالح جماعت کے تیار کرنے کا موقع مل جائے گا۔ چنانچہ پچیس سال کی جلاوطنی کے بعد جب آپ ہندوستان آنے کے لیے مکہ مکرمہ سے روانہ ہوئے تو آپ کی عجیب حالت تھی۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ مولانا پر اس وقت غیر معمولی تاثر کی کیفیت طاری تھی۔ جوارِ حرم میں رہتے ہوئے بارہ سال ہو گئے تھے۔ ایک طرف اس کو چھوڑنے کا قلق تھا اور پھر وطن کی مراجعت جذبات میں تلاطم پیدا کر رہی تھی۔ ایک ہندوستانی بزرگ جو خود بہت بڑے عالم ہیں اور ان کا خاندان مستقل طور پر حجاز میں بس گیا ہے، اور ان کے کاربار کا وسیع سلسلہ ہے، بارہ سال کے عرصہ میں شاید ہی کوئی دن ہوگا کہ مولانا کی صاحب موصوف سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔ آپ مولانا کے ساتھی بھی تھے اور ایک لحاظ سے شاگرد بھی۔ ان کا اصرار تھا کہ مولانا بیت الحرام میں رہیں۔ لیکن مولانا سمجھتے تھے کہ ان کا وطن واپس جانا ضروری اور مفید ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی آخری ملاقات بڑی رقت انگیز تھی۔ رخصت ہوتے وقت مولانا نے اُن سے فرمایا کہ میرا یہ غیر متزلزل یقین اور عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل بڑا روشن اور شاندار ہے۔ بیشک اسلام پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ایک بار پھر اُبھرے گا۔ لیکن خارج میں اس کا ڈھانچہ وہ نہیں ہوگا جو اس وقت ہے۔ مجھے جس طرح اس بات پر یقین ہے کہ اسلام ایک بار

پھر ابھرے گا اسی طرح میرا یہ بھی ایمان ہے کہ ہمارا موجودہ ڈھانچہ اب چند دنوں کی چیز ہے۔ اسلام کو اپنا ایک نیا ڈھانچہ بنانا ہوگا اور مسلمان اُسے جس قدر بھی جلد بنالیں بہتر ہوگا۔ یہ دو عقیدے ہیں جو مجھے کشاں کشاں ہندوستان لے جا رہے ہیں۔ میں اب چراغِ سحری ہوں خدا معلوم زندگی کے چند دن اور ہوں گے، چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے اپنی قوم کے کانوں تک یہ حقیقت پہنچا دوں۔

ہندوستان میں آمد اور سیاسی جماعتوں سے تعلقات:۔ الغرض یہ تمنائیں لے کر وہ مارچ ۱۹۳۹ء میں ہندوستان کے ساحل پر اُترے۔ کراچی، لاہور، دیوبند اور دہلی میں ان کا شاندار استقبال کیا گیا۔ قوم کو ان سے اور ان کو قوم سے بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ مولانا کے عقیدت مندوں میں وہ لوگ بھی تھے جو مولانا احمد علی اور خواجہ عبدالحمید صاحب کے واسطہ سے ان کی تفسیر قرآن سے متاثر ہوئے تھے۔ اور وہ بھی تھے جن کو اُن کے سیاسی رجحانات کی وجہ سے ان سے عقیدت تھی چنانچہ مولانا کی آمد پر مختلف سیاسی افراد اور جماعتوں نے ان کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اور دارالعلوم دیوبند اور جامعہ ملیہ کے بہت سے طلبہ ان سے والہانہ محبت کا اظہار کرنے لگے۔ مگر مولانا کے پچیس سالہ مطالعہ اور تدبر نے ان کے اور قوم کے عام ذہن و فکر کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج پیدا کر دی تھی۔ اور جوں جوں مولانا اپنے مخصوص افکار و خیالات کا اظہار کرنے لگے عقیدت مندوں کا یہ جمگھٹا ہٹتا گیا۔ اور مسلم لیگ، کانگریس، احرار اور جمعیۃ العلماء میں سے ہر ایک جماعت نے مولانا کی خدمات سے اپنی جماعت کو الگ رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مولانا نے صرف سندھ کانگریس کمیٹی اور بنگال (جمعیۃ العلماء صوبہ) کے دو مقامات پر جلسوں کی صدارت کی اور بس۔ اس کے بعد مولانا نے اپنی الگ راہ لی اور عام شاہراہوں سے الگ ہو گئے۔

مولانا جو شیلے مجسمۂ انقلاب تو تھے ہی "چراغِ سحری" کے تصور نے ان کی طبیعت میں عجلت اور بے صبری پیدا کر دی تھی اور ہر اس نظام کو فوراً توڑ دینے کے حق میں تھے جو ان کے خیال اور ان کے مطالعہ کے مطابق ملک اور مذہب کے مستقبل کے لیے مفید نہ تھا۔ وہ کانگریس کی "مذہبی" قیادت اور دیگر اسلامی جماعتوں کی "قدامت پسندی" سے نالاں تو تھے ہی، خاکسار تنظیم کی حمایت، سر سکندر کی فوجی بھرتی کی موافقت، اشتراکی نظریوں کی تعریف، اکبر کے دینِ الٰہی کی تاویل، ہیٹ اور نیکر اور رومن رسم الخط کے پرچار نے ان کے اپنے دیرینہ وابستگان کو اُن سے

توڑ دیا۔ اور مولانا مدنی جیسے مخلص اور متحمل رفیق کو بھی ان کی وفات کے بعد ان کے متعلق اس رائے کا اظہار کرنا پڑا کہ مولانا کے افکار میں بے ترتیبی پیدا ہو گئی تھی اور ان کی طرف منسوب شدہ افکار صرف اس وقت قابل قبول ہیں جب اصول دین سے ان کی مطابقت مسلم ہو جائے۔

مولانا کا مخصوص پروگرام اور اس کی تکمیل ’جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی‘:۔

سرزمین حجاز کو چھوڑنے سے پیشتر ہی مولانا نے ہندوستانی پروگرام کے تین حصے کر لیے تھے۔ کانگریس کی ممبری، شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کی تلقین اور کانگریس میں اپنی پارٹی کا قیام۔ ہندوستان پہنچنے پر مولانا نے اپنے پروگرام کے تیسرے جزو کو جمنا، نربدا، سندھ ساگر پارٹی کے نام سے روشناس کیا۔ اس پارٹی کا نصب العین ان کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" کے آخری ورق پر مندرج ہے۔ اور لاہور و سندھ میں اس کی شاخیں بھی موجود ہیں۔ مگر سیاسی پارٹیوں کے قیام کے لیے جس گرم جوشی اور سرگرم جماعت کی ضرورت ہوتی ہے وہ مولانا کی زندگی میں مولانا کو نہ مل سکی۔ اور اس پارٹی کا وجود صرف نظریے تک محدود رہا۔

شرکت کانگریس:۔ پروگرام کے پہلے جزو (کانگریس کی ممبری) کے متعلق مولانا ہر مجلس میں فرماتے رہے کہ مجھے نیشنل کانگریس سے محبت ہے۔ کیونکہ دنیا کی نظر میں وہ ہمارے ملک کی معزز سیاسی مجلس ہے۔ میں سولہ سترہ برس کانگریس میں کام کرتا رہا ہوں۔ مولانا نے ہر خطبہ اور ہر مجلس میں اس حقیقت کا اظہار کیا کہ ہندوستان کا اور مسلمانوں کا فائدہ ہندو مسلمانوں کی مشترکہ سیاسی جدوجہد اور کانگریس کو صحیح نمائندہ جماعت بنانے میں ہے۔ ایک واحد سیاسی جماعت کی ضرورت اس لیے انھوں نے محسوس کی کہ کل ہندوستان کی سیاست اور معیشت کا نظام ایک ہی طرز پر قائم ہوا ہے ان کے خیال میں یک جہتی اور امن قائم کرنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ اس کے علاوہ بین الاقوامی معاملات میں کل ہندوستان کی نمائندگی کے لیے ایک جماعت کا ہونا ضروری تھا۔ بصورت دیگر ہندوستان کے لیے دوسری قوموں کے سامنے ذلت و رسوائی کے علاوہ دوبارہ غلامی کا خطرہ ہے۔ یہ واحد جماعت ان کے خیال میں کانگریس ہی ہو سکتی تھی۔ اس لیے مولانا کانگریسی تھے اور کانگریس میں رہنا چاہتے تھے۔ مگر ان کو کانگریس کی موجودہ نیم مذہبی و نیم سیاسی قیادت سے شکایت تھی۔ اور وہ اسے مسلمانوں کے قومی وجود کے لیے ایک مستقل خطرہ سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ اس نظام کے

تصور میں شریک ہونے کے باوجود اس میں منسلک نہ ہو سکے اور ہندوستان کے اس آخری چند سالہ قیام میں کبھی کانگریس کے پرائمری ممبر بھی نہ بنے۔

بیت الحکمۃ اور ولی اللّٰہی فلسفہ کی تلقین :- شاہ ولی اللہ کے فلسفہ کو سمجھانے اور پھیلانے کے لیے مولانا نے دہلی اور لاہور میں مراکز کھولے اور نہایت سرگرمی سے ان نوجوانوں کی تربیت کی تکمیل میں مصروف ہو گئے جو عقیدت مندوں کے جم غفیر کے الگ ہو جانے کے بعد ان سے وابستگی میں ثابت قدم رہے۔ اسی مقصد کے لیے انھوں نے پیر جھنڈا، کراچی، لاہور اور دین پور میں بیت الحکمۃ کھولے اور ان طبائع کا گرم جوشی سے خیر مقدم کیا، جو ان کے خیالات کو سننے اور ان سے استفادہ کرنے کے لیے آمادہ تھے۔ اپنے مقصد کے لیے ان کی جدوجہد اور دلی جذبات کا اندازہ کرنے کے لیے ہم ایک واقعہ کا ذکر بطور نمونہ کرتے ہیں۔ دلی میں مولانا ادریس میرٹھی کے مکان پر ہر جمعہ کے دن مقامی فضلاء دیوبند کا اجتماع اور مذاکرۂ علمی ہوتا تھا۔ مولانا بھی ان دنوں اوکھلا (جامعہ نگر) میں مقیم تھے، جو جامع مسجد سے سات میل کے فاصلہ پر ہے۔ اس اجتماع میں شرکت کے لیے مولانا بالالتزام جمعہ کی نماز سے پہلے جامع مسجد تشریف لاتے اور عصر کے بعد واپس جاتے۔ ظہر اور عصر کے درمیان مذاکرہ ہوتا۔ مولانا حجۃ اللہ البالغہ کے جستہ جستہ مقامات کا درس دیتے اور شکوک و شبہات نہایت اطمینان سے حل کراتے۔ اس التزام کو نباہنے کے لیے دو چار دفعہ ایسا بھی ہوا ہے کہ مولانا کے پاس بس کا کرایہ نہیں ہے۔ انھوں نے یہ طویل مسافت اس بڑھاپے[1] کے عالم میں پیدل طے کی اور اجتماع میں شریک ہوتے۔ مگر چہرے کی بشاشت میں فرق نہیں آنے دیا ہے۔

مولانا اور مدرسہ دیوبند :- شاید فضلاے دیوبند کے اس اجتماع کی شرکت کا التزام اس لیے بھی ہو کہ مولانا کو مدرسۂ دیوبند کے ساتھ خصوصی دلچسپی تھی۔ اور دیہات کے فضلا میں افکار

---

[1] سخت کوشی مولانا کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ پروفیسر محمد سرور صاحب لکھتے ہیں۔ ایک دفعہ دسمبر اور جنوری کے مہینوں میں مولانا کا جامعہ نگر میں قیام تھا۔ دہلی میں اس دفعہ سخت کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ بعض دفعہ صبح کو اتنی کہر چھائی رہتی کہ دن کے دس گیارہ بجے تک دھوپ دیکھنے میں نہ آتی۔ مولانا حسب معمول بہت سویرے اٹھتے اور سیر کو نکل جاتے۔ جامعہ نگر سے تین چار فرلانگ پر دریائے جمنا ہے جہاں سے ایک نہر نکلتی ہے۔ موصوف نہر پر یخ پانی سے وضو کرتے، نماز پڑھتے اور وہیں چہل قدمی کرتے کرتے ذکر و اذکار سے فارغ ہوتے۔ صبح کے ان معمولات سے جب مولانا فارغ ہوتے ہیں تو ان کی طبیعت میں بڑی تازگی اور انبساط ہوتا ہے۔ اس وقت آپ کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ طلبا موجود ہوں تاکہ آپ درس دیں۔ (مولانا عبید اللہ سندھی۔ ص ۱۰۴)

عالیہ کی ایک روح پھونکنا چاہتے تھے۔ مولانا نے اپنی زندگی کا علمی پروگرام جمعیۃ الانصار سے شروع کیا تھا۔ اور وہ اپنی زندگی کے ہر قدم پر اس جماعتِ دیوبند اور اس کے متعلقین کے لیے سوچتے رہے۔ مولانا کو اپنی واپسی پر یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ وہ دیوبند جو کبھی فقہ (مولانا رشید احمد) اور حکمت (مولانا شیخ الہندؒ) کا میدان تھا، اپنے مقام سے پیچھے ہٹ کر جمود و رجعت کا مرکز بن گیا ہے۔ اس جمود و رجعت کو ہٹانے کے لیے وہ چلّائے چیخے اور جھنجلائے اور آخر کار صرف اتنی بات پر شکرگزار ہوئے کہ مدرسہ کے تکمیل نصاب میں حجۃ اللہ البالغۃ اور مولانا محمد قاسمؒ کی کتابوں کو جگہ مل گئی۔ مولانا عبید اللہ کے فلسفہ کی تفصیلات سے ہمیں بھی اختلاف ہے۔ مگر علم و حکمت کی طرف دعوت میں وہ حق بجانب تھے۔ اور مدرسہ دیوبند کے لیے ان کی اس دعوت کو زیادہ غور کے ساتھ اہتمام دینا مناسب تھا۔

وفات :۔ ہندوستان میں مولانا کے پانچ آخری سال اس جد و جہد اور کشمکش میں گزرے۔ آخر کار اجتماعِ فکر و عمل کی اس عجوبۂ روزگار ہستی نے ۲۱ اگست ۱۹۴۴ء کو بمقام دین پور (ریاست بھاول پور) اس کارگاہِ عنصری کو الوداع کہی۔ اور سفر گزینِ مقامِ علیین ہو کر قرینِ ابد ہوئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں فردوسِ بریں میں اپنے الطافِ مخصوصہ کی نعمتوں سے مالامال فرمائے۔ آمین!

تصانیف :۔ مولانا کے ابتدائی زمانے کے رسالے اور تصانیف اب ناپید ہیں۔ ہندوستان کے اس آخری قیام میں انھوں نے "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" اور "شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ" دو کتابیں لکھ کر شایع کیں۔ ایک اور کتاب "محمودیہ" ان کی وفات کے بعد شایع ہوئی۔ ایک اور اہم کتاب "کتاب التمہید" عربی ابھی قلمی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے خطبات چھپے ہیں۔ اور ان کے افکار پر ایک بسیط کتاب "مولانا عبید اللہ سندھی" کے نام سے پروفیسر محمد سرور صاحب نے لکھی ہے جو ان کے خیالات کو ایک مرتب شکل میں دکھانے کے لیے ایک کامیاب کوشش ہے۔ (ان کی ایک تصنیف قرآن کی ضخیم تفسیر بھی ہے جو مولانا لغاریؒ کے قلم سے لکھی ہوئی ہے۔ محترم ڈاکٹر ہالی پوتہ کے پاس محفوظ ہے)۔

مولانا امام عبید اللہ سندھیؒ
کے
سفرِ کابل کے حالات

سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں ٹرکی جرمنی کا حلیف ہوگیا۔ دیوبندی جماعت کا آئیڈیل (Ideal) پان اسلامزم یعنی اتحادِ عالمِ اسلام تھا۔ اس کا مرکز ٹرکی تھا اور دیوبندی جماعت کے قائدِ اعظم مولانا محمود حسن سرپرست مدرسہ دیوبند تھے۔ وہ ٹرکی کو امداد دینے کے لیے اپنی تمام کوششوں کو جمع کرکے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے ایک طرف اپنے خاص خاص رازدار شاگردوں کو جو خاص صوبہ سرحد یا سندھ میں تھے ٹرکی کی امداد کے کام میں لگا دیا اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کو خاص رازدار اور دستِ بازو مولانا شیخ الہند محمود الحسن کے تھے، انھیں کابل روانہ کرنے کے لیے تیار کیا۔ مولانا سندھیؒ نے حسب الحکم شیخ الہند کے دہلی میں نظارت المعارف القرآنیہ قائم کر رکھی تھی، اور مولانا سندھیؒ کو نظارت المعارف سے بڑی دلچسپی تھی اُسے چھوڑ دینے کا حکم فرمادیا۔

مولانا سندھیؒ کو کابل جانے کا حکم تو فرمایا مگر کوئی پروگرام انھیں نہیں سمجھایا۔ وہ اس حیص بیص میں تھے کہ میں وہاں جاکر کیا کام کروں گا۔ ایک تو ملک بھی نیا ہے اور جانے کے لیے پاسپورٹ ملنا بھی مشکل ہے اس لیے ان کا جی نہ چاہتا تھا کہ وہ کابل جائیں۔ مولانا سندھی فرماتے تھے کہ "ایک بار ایک خاص مجلس میں شیخ الہند نے حکم کیا کہ تم کابل چلے جاؤ۔ ایک دوسری مجلس میں بھی یہی حکم کیا۔ میں حیران تھا کہ پروگرام بتاتے نہیں، میں وہاں جاکر کیا کام کروں"۔ مولانا سندھیؒ فرماتے تھے کہ مولانا شیخ الہند کے خاص خادم ثناء اللہ نے مجھ سے کہا کہ مولانا شیخ الہند فرماتے ہیں کہ مولوی عبید اللہ سندھی کو دھکّا کیوں نہیں دیتے کہ کابل چلا جائے۔ یہ لفظ سنتے ہی میری طبیعت کابل جانے کے لیے تیار ہوگئی۔ میں نے نظارت المعارف کو چھوڑ دیا اور کابل جانے کی تیاری کرنے لگا۔ نظارت المعارف کا کام مولانا احمد علی صاحب کے سپرد کر دیا۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی اور سنہ ۱۹۱۵ء میں ٹرکی جرمنی کا حلیف ہوگیا۔ برطانیہ کا خصوصاً

اور باقی یورپین سلطنتوں کا عموماً مسلم کشی کا پختہ ارادہ تھا۔ اس وقت ایک آزاد سلطنت مسلمانوں کی ٹرکی تھی۔ ترکوں نے سمجھ لیا تھا کہ اگر ہم نے اس جنگ میں شرکت نہ کی تو بعد از جنگ یہ سلطنتیں ہماری سلطنت کے حصے بخرے کر لیں گی۔ اس مجبوری کی حالت میں ٹرکی بھی جنگ میں کود پڑا۔ اور جرمنی کا حلیف ہو گیا۔ مولانا شیخ الہندؒ نے ٹرکی کی امداد دینے کا یہ طریقہ سوچا کہ ایک طرف صوبہ سرحد میں شورش پیدا کی جائے اور دوسری طرف مولوی عبید اللہ سندھیؒ کو کابل بھیج دیا جائے۔ مولانا سندھی کابل میں جا کر سلطنتِ افغانی کو ٹرکی کی امداد کے لیے تیار کریں۔ اور خود شیخ الہند مدینہ منورہ جا کر انور پاشا کو توجہ دلائیں کہ ایک لاکھ فوج کابل کو بھیج دے۔ مولانا سندھی فرماتے تھے کہ میں نے کابل جانے کے مصمم ارادے کی خبر بذریعہ ثناء اللہ خادم، شیخ الہند کو پہنچا دی۔ مولانا فرماتے تھے کہ :-

اس عرصے میں ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کا اجلاس پشاور میں ہونے والا تھا۔ اُس میں علی گڑھ کے ہمدرد اور معاون جیسے مولانا محمد علی اور شوکت علی وغیرہ شرکت کرنے والے تھے۔ مجھ کو بھی دعوت آئی تھی۔ میں بھی پشاور جا کر کانفرنس میں شریک ہوا۔ کچھ تقریر بھی کی۔ اس وقت پشاور کا کمشنر سر عبد القیوم تھا۔ اور سپرنٹنڈنٹ مسٹر افضل خاں تھا۔ یہ میرے ساتھ کانفرنس میں میرے قریب بیٹھے تھے۔ میں نے ان دونوں کو مخاطب کر کے کہا کہ میں آپ سے کچھ باتیں کرنی چاہتا ہوں۔ کچھ تخلیہ کا وقت دیجیے۔ انھوں نے قبول کر لیا۔ پھر تخلیے میں مجھ کو بلایا۔ میں نے اُن سے عرض کیا کہ مجھے کابل جانا ہے۔ کابل پہنچنے کا آسان سے آسان طریقہ میرے لیے مہیا کر دیں۔ انھوں نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا میں نے اُن سے کہا کہ میں اب سندھ جاتا ہوں۔ سندھ میں کچھ کام ہیں انھیں سرانجام کر کے واپس پشاور آؤں گا۔ اس وقفہ میں آپ راستے کی تیاری کر لیں۔

یہ تدبیر میں نے اس لیے کی تھی کہ گورنمنٹ کی توجہ ادھر ہی رہے۔ اور میں خفیہ طور پر کسی اور طریقے سے کابل پہنچ جاؤں۔ مجھ کو خبر تھی کہ میری نقل و حرکت پر کڑی نگرانی سی۔ آئی۔ ڈی کر رہی ہے اس سے بچنے کے لیے یہ تجویز سوچی تھی۔

پھر مولانا سندھ چلے آئے۔ مولانا سندھی پر کراچی کے لوگوں کا کچھ قرض تھا۔ کراچی میں مولانا سندھیؒ نے دار الرشاد کی ایک شاخ کھولی تھی۔ ایک دو معلم تعلیم دینے والے وہاں رکھے تھے۔ چار پانچ مہینے تو وہ شاخ چلتی رہی۔ مگر سرمایہ نہ ہونے کے باعث وہ بند ہو گئی۔ ان لوگوں کی

تنخواہ باقی رہ گئی تھی۔ مولانا سندھیؒ کا ارادہ تھا کہ کابل جانے سے پہلے قرض سے دامن پاک کرلیں۔ سندھ میں گوٹھ پیر جھنڈا میں تشریف لائے۔ مولوی عبداللہ لغاری "(راقم الحروف)" اس وقت مدرسہ دارالرشاد گوٹھ پیر جھنڈ کا مہتمم تھا۔ اس کو حکم دیا کہ کسی جگہ سے ایک ہزار روپیہ مجھ کو مہیا کردو۔ پھر مولانا سندھیؒ نے اُن سے کہا کہ تم مخدوم پروجام صاحب سجادہ نشین درگاہ ہالا کے پاس جاؤ۔ مخدوم پروجام صاحب بڑے سخی تھے اور مولانا سندھیؒ سے بڑی عقیدت رکھتے تھے۔ اس لیے مولوی عبداللہ لغاری کو ان کی خدمت میں بھیجا اور اپنا سارا راز کابل جانے کا بھی مولوی عبداللہ لغاری کو سمجھا دیا۔ مولوی عبداللہ لغاری مخدوم صاحب کی خدمت میں گئے۔ مخدوم صاحب کے عام مختار سے اپنی حاجت بیان کی۔ اس نے پوچھا کہ کس کام کے لیے ایک ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ مولوی عبداللہ لغاری نے عرض کیا کہ اس ضرورت کا بیان ہم نہیں کرتے۔ اگر آپ لوگ یہ رقم دے دیں گے تو کچھ عرصے کے بعد آپ کو خبر ہو جائے گی اور اس رقم دینے سے بہت خوش ہو جائیں گے۔ اگر آپ نے یہ رقم نہ دی اور پھر آپ کو خبر ہو گی کہ یہ رقم دینی ضروری تھی تو افسوس کرتے رہیں گے کہ اتنے بڑے کام کی امداد دینے میں ہم نے قصور کیا۔ جب اس روپے پیسے پر آپ کی نظر پڑے گی تو کہیں گے کہ یہ ٹھیکریاں ہم نے کیوں اچھے کام میں صرف نہ کیں۔ اس مختار عام نے لفظ بلفظ مخدوم صاحب کی خدمت میں عرض کردیا۔ مخدوم صاحب نے مولوی عبداللہ لغاری کو اپنے دربار میں بلا کر پوچھا۔ انھوں نے وہی جواب دیا۔ مخدوم صاحب ایک لمحہ تک خاموش رہے۔ پھر فرمایا کہ ہم نے ابھی چند روز ہوئے سیٹھوں کو بلا کر حساب کیا تھا۔ ہماری طرف بہتّر ہزار روپیہ قرض نکلا۔ ہم سمجھیں گے کہ ہم پر تہتّر ہزار روپے قرض تھا۔ پھر مولوی عبداللہ لغاری سے کہا کہ جا کر کھانا کھاؤ۔ ایک سیٹھ آیا، اس نے ایک ہزار روپیہ مولوی عبداللہ لغاری کو دے دیا۔ وہ اسی وقت روانہ ہو کر مولانا سندھیؒ کے پاس آئے اور روپیہ ان کے سپرد کیا۔ مولانا سندھیؒ کراچی چلے گئے۔ اور سب لوگوں کا قرض ادا کیا۔ کراچی میں سی۔ آئی۔ ڈی کے بڑے افسر نے اپنے دفتر میں مولوی صاحب کو بلا کر پوچھا کہ کس کام کے لیے تم کراچی میں آئے ہو؟ آپ نے فرمایا کچھ کام کار تھا اس لیے میں آیا ہوں اور پھر لشپاور جانا ہے۔ یہ الفاظ سن کر مولوی صاحب کو رخصت کیا۔ سر عبدالقیوم خاں اور افضل خاں نے سرکار کو اطلاع

کر دی ہو گی اس لیے اس افسر نے زیادہ کچھ نہیں پوچھا۔

اللہ تعالےٰ اپنے بندوں کے کام خود بناتا ہے اور وہی کامیابی کے راستے دکھاتا ہے۔ یہی بات اس موقع پر ہوئی۔ مولانا سندھیؒ گوٹھ پیر جھنڈا میں آکر شدید زکام میں مبتلا ہو گئے۔ وہ بات بھی نہ کر سکتے تھے۔ جناب پیر رشد اللہ صاحب جھنڈے والے نے فرمایا کہ ہمارے پاس حب شفا کی گولیاں ہیں آپ کے پاس بھیج دیتا ہوں وہ کھا لیجیے زکام سے عافیت ہو جائے گی۔ حب شفا میں بڑا جزو دھتورے کا ہوتا ہے۔ پیر صاحب نے تقریباً ایک دو تولہ حب شفا کی گولیاں بھیج دیں۔ مولانا نے ساری کی ساری ایک ہی دفعہ کھالیں۔ مولانا اس کے اثر سے بالکل بیہوش ہو گئے۔ پیر صاحب کو خبر ہوئی تو وہ علاج کرنے لگے۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ شیخ عبدالرحیم حیدرآبادی کو خبر ہوئی وہ اپنے ساتھ بڑے بڑے ڈاکٹر لے کر گوٹھ پیر جھنڈا میں حاضر ہو گئے۔ ڈاکٹر کئی دن علاج کرتے رہے تب جاکر افاقہ ہونے لگا۔

اس اثنا میں سید محمود شاہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نے اپنی منزل سعید آباد میں جو گوٹھ پیر جھنڈا سے ایک میل دُور ہے بنائی اور مولانا سندھیؒ کے ارادے معلوم کرنے لگا۔ اس کے آدمی مولانا کی خدمت میں آتے تھے۔ مولانا صاحب بتا دیتے تھے کہ میں صحت یاب ہو کر پشاور جاؤں گا۔ مولانا کو مرض سے کچھ افاقہ ہوا تو ڈاکٹروں نے یہ رائے دی کہ آپ چند دن کے لیے کوئٹہ میں جاکر رہیں۔ ورنہ یہ بیماری پھر عود کر آئے گی۔ مولانا کا اصرار تھا کہ میں پشاور جاؤں مگر ڈاکٹروں نے سخت تاکید کی کہ آپ ایک ہفتہ ضرور کوئٹہ میں رہیں۔ ان ڈاکٹروں میں حیدرآباد کا سول سرجن بھی تھا۔ آخر مولانا نے ان کی رائے مان لی۔

مولوی عبداللہ لغاری کو حکم دیا کہ جاکر اپنے اہل و عیال کو سانگھڑ میں پہنچا آؤ۔ اس وقت ان کے اہل و عیال گوٹھ پیر جھنڈا میں تھے۔ ان کو تاکید کی کہ فوراً واپس گوٹھ پیر جھنڈا میں آجائیں۔ نیز فرمایا کہ میں ریاست بھاول پور کے شہر خان پور کی بستی دین پور کو جاتا ہوں۔ وہاں سے آپ کو خط لکھوں گا۔ جو کچھ خط میں ہو اس پر عمل کریں۔ چنانچہ مولوی عبداللہ لغاری اپنے بال بچے سانگھڑ میں چھوڑ کر واپس گوٹھ پیر جھنڈا میں آئے۔ وہاں انھیں خط ملا کہ جلد دین پور رفیقراں متصل خان پور ریاست بھاول پور آکر مجھ سے ملیں۔ حسبُ الحکم مولوی عبداللہ لغاری وہاں پہنچے۔ مولانا سندھیؒ نے

فرمایا کوئٹہ جانے کے لیے کچھ بھی سفر خرچ نہیں ہے۔ مولوی عبداللہ لغاری نے مولوی عبدالقادر دین پوری سے تین گنیاں قرض لیں۔ دو گنیاں مولانا کو دیں اور ایک گنی اپنے پاس رکھ کے سیدھا بستی کو چلا گیا، تاکہ سفر خرچ کابل کا اس جگہ سے حاصل کرے۔ اس کے جانے کے بعد مولانا امروٹ آئے اور حضرت مولانا و سیدنا تاج محمود صاحب سے عرض کیا کہ میں چند دنوں کے لیے کوئٹہ جانے والا ہوں۔ انھوں نے فرمایا کہ میرا مخلص مرید کوئٹہ میں ہے اس کے پاس جا کر اترنا۔ مولانا سندھیؒ اس نام بردہ کے پاس پہنچے تو معلوم کیا کہ وہ شخص اچھا دین دار تھا۔ مگر ریٹائرڈ سب انسپکٹر سی۔ آئی۔ ڈی تھا۔ اُس نے مولوی صاحب سے حالات پوچھے۔ مولوی صاحب نے بتایا کہ میں بیمار ہوں چند دن رہوں گا پھر پشاور جاؤں گا۔ مولوی صاحب کے ساتھ ایک خادم تھا جس کا نام شیخ فتح محمد تھا۔ اب اس کو شیخ عبدالرحمن دین پوری کہتے ہیں۔ اُسے بستی بھیج کر مولوی عبداللہ لغاری کو بلایا۔ مولوی عبداللہ لغاری کے ساتھ مولانا کا بھتیجا محمد علی برادر مولوی احمد علی بھی تھا۔ دونوں کوئٹہ پہنچ گئے۔ دو سو روپیہ انھوں نے بھی جمع کر لیا تھا۔ ادھر کچھ کوئٹہ سے بھی چندہ ہو گیا۔ شیخ عبدالرحیم حیدر آبادی بھی کوئٹہ پہنچ گئے۔ شیخ عبدالرحیم کے خاندان کی عورتوں نے اپنا زیور بیچ کر شیخ عبدالرحیم کو دیا تھا کہ یہ رقم مولانا سندھی کے سفر خرچ کابل میں کام دے گی۔ مولوی محمد علی برادر مولوی احمد علی کو ایک پٹھان کے سپرد کیا کہ اسے چمن افغانی جس کو قدنی کہتے ہیں پہنچا دو اور کہو کہ یہ نومسلم ہے اور اسے چھپانے کے لیے ہم یہاں لے آئے ہیں۔ چنانچہ وہ قدنی پہنچ گیا۔

مولانا کے پاس ایک خط مولانا حضرت پیر آغا حسن جان سرہندی کا تھا، جو انھوں نے اپنے ایک مرید کو جو گلستان میں رہتا تھا لکھا تھا۔ اس میں تحریر کیا تھا کہ مولوی عبیداللہ سندھیؒ کو امن سے کابل تک پہنچا دو۔ مولوی عبداللہ لغاری کو اس کی طرف بھیجا۔ اس مرید نے کہا کہ اگر خواجہ صاحب کا خط آپ کے پاس نہ ہوتا تو میں آپ کو گرفتار کرا دیتا۔ اس سے ہمیں نا امیدی ہوئی۔ اب مولانا کو کوئٹہ میں رہتے ہفتہ بھر ہو گیا۔ کوئٹہ میں مولانا کا ایک شاگرد تھا جس کا نام عبداللہ تھا۔ اس کے بھائی کا نام نور محمد تھا۔ مولانا نے اُسے بلا کر کہا کہ ہمارے لیے افغانستان کے راستے کی تجویز کرو۔ انھوں نے ایک نوجوان لڑکا اختر نامی کو جو شرادک کا رہنے والا تھا ایک گنی پر جانے کے لیے راضی

کر لیا اور کہا کہ ان کو شراوک جو افغانستان کا علاقہ ہے لے جاؤ۔ ان بھائیوں نے مولانا کو اپنے مکان پر دعوت دی۔ مولانا نے کہا آج رات جانے کی تیاری کرو۔ اور سی۔ آئی۔ ڈی کے لوگ بھی پیچھے لگے ہوئے تھے۔ اختر مولانا سندھیؒ کے پاس آیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ہم کو اس راستے سے لے جاؤ کہ شراوک پہنچنے تک کوئی آدمی نہ دیکھ سکے۔ اس نے یہ بات قبول کی اور عشاء کے وقت مولانا کا قافلہ جس میں مندرجہ ذیل اصحاب شامل تھے روانہ ہوا۔

(۱) مولانا عبید اللہ سندھی۔ (۲) مولوی عبد اللہ لغاری۔

(۳) فتح محمد صاحب (مشہور بہ عبد الرحمٰن)۔ (۴) نور محمد صاحب برادر مولوی عبد اللہ افغان۔

(۵) رہبر اختر افغانی۔

اس اثناء میں حضرت مولانا شیخ الہندؒ، مولانا سندھیؒ کے احوال کی تفتیش کرتے رہے۔

جب مولانا سندھیؒ کوئٹہ پہنچے اور مولانا شیخ الہندؒ کو معلوم ہوا کہ وہ افغانستان جانے والے ہیں، تب انھوں نے حج کے لیے تیاری کر لی۔ جب ہم کوئٹہ میں تھے ہم کو خبر ہوئی کہ مولانا شیخ الہند بمبئی میں پہنچ گئے ہیں۔

جس رات ہم کوئٹہ سے نکلے مولانا عبد الرحیم کرپلانی اسی راستے حیدر آباد کو چلے گئے۔ اور حیدر آباد سے سیدھے بمبئی پہنچے اور شیخ الہند کو واقف کیا کہ مولانا سندھی کابل کو روانہ ہو گئے ہیں، فلاں فلاں راستے سے۔ تب شیخ الہند نے اپنا ٹکٹ حج کا خرید لیا اور مطمئن ہو گئے کہ مولانا سندھیؒ اب کابل کو چلے گئے ہیں۔

اب اختر افغانی نے ہمارے قافلے کو لے کر سیدھے مغرب کی طرف رخ کیا۔ اگرچہ ہم نے جغرافیہ کے نقشے سے دیکھ لیا تھا کہ کوئٹہ سے شراوک تک مسافت ایک سو میل ہے۔ مگر پہاڑی راستہ تھا ہم کو بہت دن اس راستے میں لگ گئے۔ اختر راستہ کا بڑا ماہر تھا۔ ہم کو ایک ایسے پہاڑی راستہ سے لے گیا کہ وہ بالکل انوکھا تھا۔ رات بھر ہم سفر کرتے رہے۔ صبح کے آٹھ بجے ایک جگہ منزل کی۔ ہمارے ساتھ نور محمد بھائی ملا عبد اللہ بھی تھا۔ وہ افغان تو تھا مگر براہی اور بلوچی زبان سے خوب واقف تھا اور اختر سوائے افغانی کے کچھ نہ جانتا تھا۔ ہمارے ساتھ کچھ آٹا اور چائے کا سامان تھا۔ دن کے آٹھ نو بجے ہم نے کھانا تیار کیا۔ اور کھا پی کر پھر چل پڑے۔ سارا دن چلتے رہے اور رات بھی ساری چلتے رہے۔

آخر سحور کے وقت ایک پانی پر جا کر اُترے۔ وہ چھوٹے تالاب کی طرح تھا۔ اس میں میٹھا پانی تھا۔ سارے راستے میں ہم کو میٹھا پانی نہ ملا تھا۔ صرف ایک جگہ ملا تھا، جہاں سے ہم نے مشک بھر لی تھی۔ جس پانی پر اب ہم اترے اس کے سردار کا نام محمد حیات تھا۔ اس کے بھائی کا نام سرگڑی تھا۔ صبح کو وہ بھی پانی پر آئے۔ اُن کا شہر پانی سے دُور ایک غنڈی (پہاڑی) پر تھا۔ ہمیں پانی پر اترا دیکھ کر وہ حیران رہ گئے، اور کہنے لگے کہ یہاں تو شیر اور بگھڑ پانی پینے کے لیے آتے ہیں۔ تم کس طرح بچ گئے۔ اس علاقے میں اس پانی کے سوا کوئی پانی میٹھا نہ تھا۔ یہاں ہی زادِ راہ سب ختم ہو گیا تھا۔ ہمارے پاس چائے اور شکر تھی لیکن آٹا بالکل نہ تھا۔ ان سے ہم نے آٹا طلب کیا۔ اول تو وہ کہنے لگے کہ ہم انگریزی علاقے میں بیٹھے ہیں۔ واللہ اعلم تم کون ہو۔ ہم کو ڈر لگتا ہے۔ ہم کچھ نہیں دیتے۔ مولوی عبداللہ لغاری نے نور محمد سے کہا کہ ہم پیر ہیں، ہمارے مرید شراوک ہیں۔ ہم اپنے مریدوں کی طرف جا رہے ہیں۔ انھوں نے ہماری لمبی لمبی داڑھیاں دیکھ کر یقین کر لیا کہ یہ ملا لوگ ہیں اور پیر ہیں، اپنے مریدوں کی طرف جا رہے ہیں۔ پھر ہم نے آٹا طلب کیا۔ انھوں نے کہا ایک روپیہ کلدار کا دو سیر دیں گے۔ پھر ہم نے ان کو سمجھایا کہ اتنا آٹا دو کہ تم بھی کھاؤ اور تمھارے بال بچے بھی کھائیں۔ پھر تو وہ بڑے خوش ہوئے۔ ہم نے ایک بکری بھی لی۔ اور پانچ روپیہ انھوں نے قیمت بتائی۔ اب وہ بال بچے بلا کر لائے اور اس پانی پر روٹی اور گوشت پکایا اور کھایا۔ پھر انھوں نے جتنی رقم مانگی ہم نے دے دی۔ ہم نے اُن سے کہا کہ بکری کی ران بھون دو۔ اور کچھ روٹیاں بھی اپنے ساتھ لیں۔

اس سخت سفر میں مولانا سندھیؒ کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے۔ اور وہ نہیں چل سکتے تھے ہم نے اُن لوگوں سے سواری طلب کی۔ انھوں نے کہا ایک گائے ہے اور ایک بیل ہے۔ جو کچھ رقم انھوں نے شراوک تک کے لیے مانگی ہم نے دے دی۔ انھوں نے کہا کہ ہم افغان سرحد کے اندر فلاں جگہ تک جا سکتے ہیں آگے سرحد کے اندر نہیں جا سکتے۔ غرض ہم نے اُن سے مویشی لیے۔ گائے پر مولوی عبداللہ لغاری سوار ہوئے اور بیل پر مولانا سندھیؒ سوار ہوئے۔ راستہ تو کوئی تھا نہیں۔ ایک پہاڑی سے اترنا ہوتا تھا اور دوسری پر چڑھنا ہوتا تھا۔ چڑھتے وقت تو ہم سوار ہوتے اور اترتے وقت سوار نہیں ہوتے تھے۔ اس پانی سے دوپہر کو روانہ ہوئے اور مغرب کی نماز ایک دشت میں، جس پر مملکتِ افغان کا نشان تھا، پڑھی۔ یہ دشت اتنا بلند تھا کہ کوئٹہ کے پہاڑ، جس پر برف پڑی

ہوئی تھی، نیچے نظر آرہے تھے۔ اور افغانستان کے پہاڑ بھی اس سے چھوٹے تھے۔ ہم مغرب کی نماز پڑھ کر بغیر پاسپورٹ کے صرف اللہ پر توکل کر کے افغانستان میں داخل ہوگئے۔ یہاں سے ہم ساری رات چلتے رہے۔ آٹھ بجے صبح کو ہم اس جگہ پہنچے جہاں سے انھوں نے کہا تھا کہ ہم آگے نہیں جاسکتے۔ چنانچہ سرگڑی برادر ملک محمد حیات وہاں سے واپس چلا گیا اور ہم پیدل روانہ ہوگئے۔ اِن پہاڑوں میں ہمیں چند افغان ملے۔ اختر نے انھیں احوال سنایا۔ انھوں نے کہا اور تو سب مسلمان ہیں مگر یہ شخص (یعنی فتح محمد) مسلمان نہیں ہے۔ ہم نے پوچھا کہ کیوں؟ کہا کہ اس کا رنگ کالا ہے۔ مسلمان کا منھ کیسے کالا ہوسکتا ہے؟ ہم کو اس پر بہت ہنسی آئی۔ وہ بے چارے بہت شرمندہ ہوئے۔ غرض چلتے چلتے ہم نے مغرب کی نماز شراوک کے علاقہ میں جاکر پڑھی۔ شراوک علاوہ آباد زمین کے ہے۔ اس میں ایک ندی ہے جو کوئٹہ کے پہاڑوں سے گھوم کر آتی ہے۔ وہاں چھوٹی سی بستی ہے۔ ہم کچھ عرصہ وہاں رہے۔ شراوک کا مرکزی شہر اس جگہ سے آٹھ دس میل دُور تھا۔ ہم اس بستی سے روانہ ہو کر اس مرکزی شہر میں پہنچ گئے۔ وہاں کا حاکم (کمشنر) دَورے پر گیا ہوا تھا۔ اس شہر کا مَلِک (بڑا آدمی) ہمارے ساتھ خوش خلقی سے پیش آیا۔

افغانستان میں شہر کے چودھری کو مَلِک کہتے ہیں۔ اس شہر کے چودھری نے ہمارا حال احوال پوچھا۔ مولانا نے بتایا کہ ہم دہلی سے آرہے ہیں۔ ہم نے انگریزوں سے بھاگ کر افغانستان میں پناہ لی ہے۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک شخص آیا۔ اُس نے چند سردے کی قسم کے خربوزے لاکر مولانا کے سامنے رکھے۔ آپ نے مولانا عبداللہ لغاری سے فرمایا کہ اسے ایک روپیہ دے دو۔ چنانچہ لغاری صاحب نے ایک کلدار روپیہ اُسے دے دیا۔ (انگریزی کلدار روپیہ دو افغانی روپوں کے برابر ہوتا ہے)۔ اب دوسرا آدمی بھاگا بھاگا آیا۔ وہ بھی بہت سے خربوزے لایا۔ مولانا نے فرمایا اسے بھی ایک روپیہ کلدار دے دو۔ چنانچہ اُسے بھی ایک روپیہ دے دیا۔ اب تیسرا آدمی آگیا اور بہت سے خربوزے اور تربوزوں کی ایک بوری لایا۔ آپ نے فرمایا اسے بھی ایک روپیہ دے دو۔ اب تو ساری بستی کے لڑکے لڑکیاں جمع ہو کر انھیں کھانے لگے۔ اس کے بعد چوتھا شخص بھاگا بھاگا آیا۔ لیکن ملک نے اسے منع کر دیا۔ وہ ڈر گیا اور سمجھا یہ مولوی نہیں ہیں بلکہ امیر افغانستان کے خویش و اقارب ہیں۔ کیونکہ اتنے روپے مولویوں کے پاس کہاں ہوتے ہیں۔

امیر عبدالرحمٰن جب افغانستان کا بادشاہ ہوا تھا تو اپنے خویشوں کو جو اس کے خیال میں اس کے مخالف تھے حکومتِ ہند کے حوالے کر دیا تھا۔ وہ ہند میں نظر بند تھے۔ جب امیر عبدالرحمٰن فوت ہوا اور اس کا بڑا بیٹا حبیب اللہ خاں والی افغانستان ہوا تو اس نے عام اعلان کر دیا کہ میرے جو خویش ہند میں جلا وطن ہیں وہ واپس آجائیں۔ وہ لوگ انگریزوں سے خفیہ بھاگ کر افغانستان میں داخل ہو جاتے تھے۔ اس لیے ملک نے سمجھا کہ یہ بھی محمد زئی قبیلہ سے ہیں۔ اور دوسرے مولانا نے بھی فرما دیا تھا کہ مجھے امیر کے بڑے بیٹے عنایت اللہ خاں معین السلطنت نے خط لکھ کر بلایا ہے۔ اس لفظ سے بھی اس کا گمان زیادہ بڑھ گیا کہ یہ شاہی خاندان سے ہیں۔ پھر اس نے ہم کو پرتکلف دعوت کھلائی۔ دوسرے دن صبح کو اس نے کہا کہ میں حاکم کو اطلاع کرنے کے لیے جاتا ہوں تمھاری خاطر داری اور مہمانی میرا بیٹا کرتا رہے گا۔ مولوی صاحب نے انکار کیا اور فرمایا۔ اب ہم گھر پہنچ گئے ہیں اس لیے اب تم، تمھارا بیٹا، مسجد کا ملّا اور مسجد کا خادم یہ سب ہمارے مہماں ہوں گے ہم نے ایک دن آپ کی ضیافت کھائی یہ کافی ہے۔ اب تم ہمارے مہمان ہو۔ وہ لاچار ہو گیا اور حاکم کے پاس چلا گیا۔ اس کا بیٹا، ملّا اور ایک طالب علم ہمارے یہاں کھانا کھانے آئے۔ مرغیاں سستی تھیں چار آنے میں مرغی ملتی تھی۔ گھی بھی ایک روپیہ سیر مل جاتا تھا۔ آٹا روپے کا چار سیر ملتا تھا۔ البتہ شکر ذرا گراں تھی۔ تیسرے دن ملک واپس آیا اور کہنے لگا کہ آپ لوگوں کو حاکم (کمشنر) بلاتا ہے۔ ہم نے اپنے داموں سے دو اونٹ کرایے پر لیے اور کمشنر کے پاس چلے گئے۔ کمشنر تین میل کے فاصلے پر منزل انداز تھا۔ ہم وہاں پہنچ گئے۔ کمشنر کے پاس ایک قاضی (جج) بھی رہتا تھا۔

افغانستان کا قاعدہ ہے کہ قاضی (جج) حاکم (کمشنر) پر حاکم ہوتا ہے۔ ہم قاضی صاحب سے ملے۔ یہ قاضی دیوبندی علمار کے شاگردوں کا شاگرد تھا۔ وہ ہم سے بڑی محبت سے پیش آیا۔ قاضی صاحب نے احوال پوچھا۔ مولانا نے فرمایا کہ عنایت اللہ خاں معین السلطنت ولی عہد افغانستان نے ہماری طرف لکھا تھا کہ تم اِدھر کابل میں آجاؤ۔ اُس نے کہا کہ خط تمھارے پاس ہے۔ مولوی صاحب نے کہا ہم نہیں لائے، ڈر تھا کہ کوئی گرفتار نہ کرلے۔ اس پر جج نے کمشنر کو سمجھایا کہ یہ لوگ معزز مہمان حکومت افغانستان کے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ اچھی طرح سفارش

لکھ کے اور سرکاری پولیس کی حفاظت میں انھیں قندھار پہنچا دو۔ شرادک کا علاقہ قندھار کے صوبہ دار کے ماتحت تھا۔ قاضی صاحب نے کچھ مسائل بھی پوچھے۔ اور ان کو معلوم ہو گیا کہ یہ بڑے عالم ہیں۔ پھر کمشنر کو سمجھایا کہ ان کے اعزاز میں ایک بڑی دعوت کا انتظام کرو اور جو گرد و نواح کے مولوی ہیں وہ آجائیں۔ دوسرے دن بہت سے مولوی گرد و نواح کے جمع ہو گئے۔ انھوں نے بھی کچھ مسئلے پوچھے۔ سب ملاؤں نے اعتراف کیا کہ یہ بڑے عالم ہیں۔

شرادک کے اس حاکم (کمشنر) پر گورنر قندھار ناراض تھا اور اس کو ریٹائرڈ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ قاضی صاحب نے اس کو سمجھایا کہ گورنر قندھار تم کو ضرور ریٹائرڈ کر دے گا اور یہ لوگ کابل میں پہنچ کر عنایت اللہ خاں معین السلطنت کے پاس رہیں گے۔ پھر اگر یہ تم کو معطل کر دے تو امید ہے کہ یہ مولوی لوگ تم کو دوسری جگہ پر حاکم بنا دیں گے۔ اس لیے ضرور تم کو ان پر احسان کرنا چاہیے۔ پھر تو وہ حاکم ہمارا معتقد ہو گیا۔

پھر مولانا سندھی کو سمجھایا کہ ہم آپ کو بڑی عزت سے قندھار پہنچا دیتے ہیں۔ قندھار میں دو آدمی بڑی عزت بڑی آبرو والے ہیں۔ ایک ملا محمد حسن درّانی۔ ہر مہینہ میں گورنر قندھار اُن کی خدمت میں آتا ہے۔ اور ملا محمد حسن درانی گورنر صاحب کو بارہ روپیہ نذرانہ دیتا ہے۔ اور گورنر اُس کا بڑا معتقد ہے۔ دوسرے صوفی جان محمد صاحب، وہ عالم بھی ہیں اور گورنر قندھار کے مرشد بھی ہیں۔ وہ کسی کے پاس آتے نہیں اور گورنر ہر روز ان کی خدمت میں آتا ہے۔ یہ دو شخص ہیں۔ اگر ان میں سے آپ کو تعارف ہو تو آپ پولیس قندھار سے بچ جائیں گے ورنہ آپ کو پولیس قندھار نے گرفتار کیا تو امیر حبیب اللہ بھی آپ کو چھڑا نہیں سکتا۔

مولانا نے فرمایا محمد حسن صاحب صحبت یافتہ سید العارفین حضرت حافظ محمد صدیق بھرچونڈی والے کا ہے۔ اور میں بھی مرید سید العارفین کا ہوں۔ اور میں نے ملا محمد حسن کو سید تاج محمود امروٹی کے پاس دیکھا تھا۔ وہ مجھ کو پہچانتا ہے۔

صوفی جان محمد تعلیم یافتہ اور صحبت یافتہ حضرت شیخ الہندؒ کا ہے۔ اس کو میں نے دیوبند میں دیکھا تھا۔ اور میری اس سے ملاقات ہے۔

قاضی (جج) نے فرمایا۔ اب یہ دونوں کافی ہیں۔ اور آزادی سے چلے جائیں آپ کو کوئی

ڈر نہیں۔ کمشنر کو کہا ان کو راہ داری لکھ دو۔ اس نے راہ داری لکھ دی اور قاضی صاحب نے بھی دستخط کیے۔ دو پولیس والے ہمارے ہمراہ کیے کہ ان کو امن وامان سے جن لوگوں کے پاس یہ رہنا چاہیں وہاں تک پہنچا دیں۔ اب ہم حاکم سے رخصت ہو کر چلے۔ پولیس والے تو پیدل تھے اور ہم نے دو اونٹ کرایے کیے۔ ایک اونٹ تھا جڑا، اس کی پشت گرم نہ ہوتی تھی اس پر مولوی صاحب سوار ہوئے۔ دو چار میل چل کر وہ کودنے لگا اور مولانا کو گرا دیا، جس سے مولانا زخمی ہو گئے۔ پھر ہم پیدل چل دیے اور شراوک تک پہنچے۔ اس سفر میں ہم کو بڑی تکلیف پہنچی۔ پھر ہم نے شراوک کے شہر سے دو اونٹ لاڈو کیے۔ اس پر سوار ہو کر ہم تیسرے دن چمن افغانستان یعنی قدنی پہنچے۔ وہاں وہ اونٹ واپس کر دیے اور قدنی کے کمشنر نے ہماری مہمانی کی! اور وہاں سے گھوڑے کرایے پر کر دیے۔ ہم تین دن چلتے چلتے قندھار تک پہنچ گئے۔

مولانا کا ارادہ تھا کہ ملا محمد حسن صاحب کے پاس نہ اُتریں، اور نہ صوفی جان محمد کے پاس اُتریں بلکہ پیر محمد فقیر جان سرہندی کے پاس جا اُتریں۔ پیر محمد فقیر جاں سرہندی مجددی۔۔۔۔ کو کبھی امیر عبدالرحمٰن نے افغانستان سے نکال دیا تھا۔ یہ قندھار کے رہتے والے تھے اور یہ سندھ میں آ کر مٹاری شہر میں، جو حیدرآباد کے اضلاع میں ہے، رہتے تھے مولانا سندھی سے ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ پھر حبیب اللہ خاں نے ان کو اجازت دی کہ تم واپس قندھار میں آ جاؤ۔

مولانا کا ارادہ تھا کہ یہ میرا دوست ہے اس کے پاس رہیں۔ میں نے (یعنی مولوی، عبداللہ لغاری نے) سخت مخالفت کی اور کہا کہ وہ بیشک تمھارا دوست ہے۔ مگر تم کو وہابی سمجھتا تھا۔ اگر اس نے گورنر قندھار کو کہہ دیا کہ عالم تو بڑے ہیں مگر وہابی ہیں تو ہم سارے گرفتار ہو جائیں گے۔ اور خلاصی مشکل ہو گی۔ میں انکار کر کے گھوڑے سے اتر کر بیٹھ گیا۔ آخر مولانا نے ناچار ہو کر میرا کہنا مان لیا۔

پولیس والے دو آدمی جو ہماری حفاظت کے لیے حاکم شراوک نے ہمراہ کیے تھے ہر ہر منزل میں آ کر کہتے تھے کہ ہم کو ایک روپیہ دو کہ ہم روٹی کھائیں۔ وہ ہم سے الگ روٹی کھاتے تھے۔ مولانا صاحب فرماتے تھے کہ ان کو دو روپیہ دو اور ہم دے دیتے۔ شراوک کی

منزل سے قندھار تک آٹھ دس دن ہم کو لگ گئے۔ ہر ہر جگہ ہم پولیس کی خدمت کرتے رہے۔ ایک جمعدار تھا اور ایک پولیس مین۔ جب ہم قندھار کے قریب پہنچے پولیس مین نے کہا کہ جناب مجھ کو پانچ روپے کی ضرورت ہے اب خالی ہاتھ کیسے گھر جاؤں۔ دونوں کا گھر قندھار میں تھا۔ مولانا نے فرمایا اس کو دس روپیہ کلدار دے دو۔ دوسرا جو جمعدار تھا اُس نے کہا میں بھی خالی ہاتھ ہوں۔ میرا گھر بھی قندھار میں ہے۔ مجھ کو دس روپے کی ضرورت ہے۔ مولانا نے فرمایا اس کو پندرہ روپیہ دے دو۔ وہاں جمعدار پولیس کی تنخواہ افغانی سکہ دس روپیہ ہوتی ہے۔ یعنی انگریزی روپے کے پانچ روپیہ کے برابر۔ اور پولیس مین کی سات روپیہ ہوتی ہے۔ ان کو اتنے روپے مل گئے تو خوشی کے مارے کودنے لگے۔ اب قندھار کے شہر کے دروازے پر پہنچے اُس نے راہ داری مانگی۔ ہم راہ داری پولیس والوں کو دی کہ تم ان کو دو۔ اس منشی نے کہا کہ میں جب تک کپتان پولیس کو اطلاع نہ کروں ان کو اندر نہ جانے دینا۔ وہ جمعدار پولیس سید تھا اور اچھے خاندان سے تھا۔ اس نے منشی کو ڈانٹا اور کہا کہ ہم کو حکم ہے کہ ہم ان کو ملا محمد حسن کے پاس پہنچا دیں۔ بس تم کو ان کے بند رکھنے کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ بہت بڑے معزز مہمان سرکاری ہیں۔ اور راہ داری پولیس مین کو دی کہ اس کو اپنے پاس رکھو۔ اور ہم کو لے کر ملا محمد حسن کے پاس پہنچا دیا۔ صبح کا وقت تھا۔ ملا محمد حسن مسجد میں بیٹھے تھے۔ وہ مولوی صاحب کو پہچان کر بہت خوش ہوئے۔ اور ان کے پاس جو جماعت تھی ان کو کہا کہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ دو شخص آتے ہیں وہ افغانستان کو انگریزوں کی غلامی سے آزاد کریں گے۔ یہ وہی دو شخص ہیں۔ ملا محمد حسن بڑے عارفِ کامل تھے اور صاحبِ کشف و کرامات تھے۔ سارے شہر قندھار کے لوگ چھوٹے خواہ بڑے سب اُن کی عزت کرتے تھے۔ اور ملا محمد حسن کسی کی دعوت نہ کھاتے تھے۔ اور نہ کسی کی کوئی چیز لیتے تھے۔ ان کا اپنا کچھ باغ تھا اس کی آمدنی پر اکتفا کرتے تھے۔ اب انھوں نے ہم کو ایک تاجرِ چرم جس کا نام محمد حسن توخسی تھا اور اس کے بھائی کا نام عبد اللہ تھا ان کے سرا چہ میں ٹھہرایا۔ وہ دونوں بھائی بڑے شریف تھے۔ ہماری انھوں نے بڑی خدمت کی بڑی عزت سے رکھتے تھے۔

اس وقت قندھار کے گورنر محمد یونس خاں تھے جو بہت بڑے عالم اور صوفی طریقے کے تھے۔

انھوں نے اپنی نظربندی کے ایام ہندوستان میں گزارے تھے اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مرید و معتقد تھے۔ اور مولانا رشید احمد مدرسہ دیوبند کے سرپرست تھے۔ جب ملا محمد حسن نے اُن کو جا کر خبر کی کہ دیوبند کے دو بڑے عالم قندھار میں آئے ہیں اور میرے پاس مہمان ہیں تو تو گورنر صاحب اپنے بیٹے کے ساتھ ہماری ملاقات کے لیے آئے۔ مولانا سے کچھ فقیری کی باتیں پوچھیں۔ آپ نے نہایت عمدہ تقریر کی جس سے گورنر صاحب بہت خوش ہوئے۔

اس کے بعد جب صوفی جان محمد صاحب کو خبر ہوئی تو وہ بھی آئے اور پر تکلف دعوت ہم کو دی۔ پھر ہم ایک دن اپنی ساری جماعت کے ساتھ گورنر کی ملاقات کو گئے۔ گورنر صاحب اپنے دربار میں تھے۔ بڑی عزت سے ہم کو بٹھایا اور خوش ہو کر فرمایا کہ ہم آپ کی ہجرت منظور کر کے آپ کو نیشنل سرٹیفکیٹ دیدیں گے۔ ملا محمد حسن صاحب اور صوفی جان محمد صاحب کی کوشش سے ایک مہینہ کے عرصے میں ہماری ہجرت سرکاری طور سے منظور ہوئی اور نیشنل سرٹیفکیٹ مل گیا۔ اب ہم افغانی ملت کے ایک فرد ہو گئے۔ اب انگریز ہم کو واپس نہیں کر سکتے جتنا بھی زور لگائیں۔

چمن افغانی میں میاں محمد علی صاحب (برادر مولانا احمد علی صاحب) تھے اُن کو بھی ہم اپنے ساتھ لیتے آئے۔ اب ہم یہاں چار اشخاص ہیں۔ ایک مولانا عبید اللہ سندھیؒ، دوسرے مولانا عبداللہ لغاری اور دو ہمارے خادم یعنی محمد علی مولانا سندھیؒ کے اور فتح محمد معروف بہ شیخ عبدالرحمٰن مولوی عبداللہ کے خادم بنے۔ ہم دونوں مولویوں کی سرکاری طور سے ڈھائی ڈھائی سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی۔ گورنر قندھار محمد یونس خاں صاحب، ان کے تمام عملے، ملا محمد حسن صاحب، صوفی جان محمد صاحب، مولوی عبداللہ وہاب قندھاری وغیرہ نے مولانا سندھیؒ سے التجا کی کہ آپ قندھار ہی میں رہیں۔ یہاں آپ کو ہر طرح آرام ملے گا۔ مگر مولانا نے انکار کیا اور کہا کہ ہم کو کابل جانا ہے ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ مولانا عبید اللہ سندھی کا پروگرام انقلابی تھا۔ اس لیے مولانا نے ان کی التجا کو رد کر دیا اور کہا کہ ہم کابل جائیں گے۔ یہاں قندھار میں ہم کو ایک مہینہ گزرا۔ اس وقت تک جو خرچ ہم اپنے ساتھ لائے تھے سب ختم ہو چکا تھا مولانا کے پاس فقط ایک گنی باقی بچی تھی۔

جب گورنر کو یہ معلوم ہوا کہ یہ ضرور کابل جائیں گے تو پانچ سو روپیہ ہم کو کابل خزانہ سے

دلوا دیے، کیونکہ ہم ایک مہینہ یہاں ٹھہرے تھے۔ ایک مہینے کی تنخواہ دی اور نیشنل سرٹفکٹ بھی سرکاری لکھ کے ہمارے حوالے کیا۔ اس سے ملا محمد حسن صاحب اور صوفی جان محمد صاحب بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا ہم کو یہ امید نہ تھی کہ آپ کو اتنی رقم دے دیں گے۔ ہم تو صرف نیشنل سرٹفکٹ کی کوشش میں تھے۔ سرکاری طور سے ہم کو سواریاں وغیرہ ملیں۔ ایک فوج کا دستہ جو قندھار سے کابل کو بدلنے والا تھا اُن کے ساتھ ہماری تیاری کی۔

ہم کو جو پانچ سو روپے کی رقم ملی تھی ہم لوگوں نے سفر خرچ اور کپڑے وغیرہ تیار کرائے۔ اکتوبر کا مہینہ تھا، نہایت سردی تھی اس لیے گرم کپڑے خرید کیے اور چائے وغیرہ کا سامان خریدا۔ الوداع کے دن گورنر صاحب اور شہر کے معززین قندھار سے باہر الوداع کہنے کے لیے آئے۔ بڑا اروح پرور نظارہ تھا۔

جناب گورنر صاحب نے ہماری راہداری پر نوٹ لکھا کہ ہر ایک مسافر خانہ میں ان کو عزت کی جگہ ملے، یہ سرکاری مہمان ہیں۔ اور ایک خط سفارش کا اپنے بھتیجے نادر خاں سپہ سالار افغان کی طرف لکھ کر دیا۔ اور صوفی جان محمد صاحب نے بھی نادر خاں کے نام ایک چھٹی دی اور اپنی ایک خاص نشانی بھی دی۔ وہ ایک کرچ تھی جس کا خول سچی سیپ کا تھا۔ اور کہا کہ جب نادر شاہ کے پاس جاؤ تو اسے اپنی کمر سے باندھ لینا۔ اور ایک خط جناب مولانا عبدالرزاق خاں صاحب سرپرست میزان العدالت و التحقیق کے نام بھی دیا۔

پھر ہم اس سارے جلوس سے وداع کر کے کابل روانہ ہو گئے۔ کابل اور قندھار کے درمیان بارہ دن کا فاصلہ ہے۔ ہر بارہ یا بیس میل پر ایک سرکاری مسافر خانہ ہوتا ہے۔ اس کے گرد ایک بڑا قلعہ ہوتا ہے۔ اس کے اندر مسافروں کی رہائش کی جگہ نہایت اعلیٰ درجہ کی بنی ہوئی ہوتی ہے۔ اور گھوڑے باندھنے کی جگہ بھی نہایت عمدہ ہوتی ہے۔ ہر مسافر خانہ کے منتظم کو سرادار کہتے ہیں۔ اور دروازے پر ہر چیز، یہاں تک کہ گھوڑے کی گھاس کا نرخ بھی لکھا ہوتا ہے۔ حرف مسافر کو سرائے دار سے ضرورت کی چیز مانگنے پر مقررہ نرخوں پر مل جاتی ہے۔ مسافر خانہ کے اندر ایک مسجد بھی ہوتی ہے۔ اور گرداگرد مسافروں کے رہنے کی جگہ پر سارے افغانستان کے مسافر خانوں کا نقشہ ہوتا ہے۔ سب مسافر خانے اسی طرز کے ہیں۔ ہم قندھار سے چل کر شاید پانچویں

دن غزنی پہنچے۔ غزنا ایک دریا کا نام ہے، اس پر یہ شہر آباد ہے۔ اب تو وہ بالکل چھوٹا ہے شاید دس بارہ ہزار ہوں گے۔ کسی زمانے میں کافی بڑا تھا۔ وہاں قافلے والوں نے کہا یہاں تین دن ٹھہریں گے۔ ہم کو اس موقع پر آثار قدیمہ دیکھنے کا شوق ہوا۔ تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ سلطان محمودؒ نے غزنی میں ایک مسجد بنائی تھی جس کا نام رشکِ فلک تھا۔ پھر تاریخ فرشتہ لکھتا ہے کہ:-

"روندگانِ ربع مسکون مثلش رانشان نہ دادند"

اس مسجد کو دیکھا۔ اس جگہ چھوٹی سی ایک آٹھ دس گز کی جگہ تھی جہاں سنگ مرمر کے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں کہ ہلاکو خاں کافر نے اس کو برباد کیا تھا۔ اس کے بعد ہم سلطان محمودؒ کے مقبرے کی طرف گئے۔ یہ مقبرہ غزنی سے دو میل پر ہے۔ جس راستے پر ہم جا رہے تھے اس کے شمال اور جنوب میں قبریں ہی قبریں تھیں۔ شمال کی طرف پہاڑ تھا۔ اس پہاڑ پر بھی قبریں نظر آرہی تھیں۔ ایک لڑکا گدھے کے ساتھ جارہا تھا۔ مولوی عبداللہ لغاری نے اس سے کہا کہ گدھا دو ہم اس پر سوار ہو کر سلطان محمود کے مقبرے پر جائیں گے۔ اس نے کہا میں اس کے عوض آدھ روپیہ کابلی لوں گا۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ گدھے پر سوار ہوئے۔ اس لڑکے سے ہم نے کہا کوئی بیت سناؤ۔ اس نے ایک بیت پڑھا۔ وہ یہ تھا:-

دریں صحرا کہ می بینی سراسر خیمۂ لیلیٰ ہست   دو صد مجنونِ سرگرداں دریں ریگِ رواں گم شد

مولانا کو وجد آگیا۔ فرمایا کہ یہ قبریں خیمۂ لیلیٰ ہیں۔ کیونکہ روح ان سے تعلق رکھتی ہے۔

خیر ہم سلطان محمودؒ کے مقبرے پر پہنچے۔ اس پر ایک گنبد سا بنا ہوا تھا، اس پر تحریر تھا کہ "میں امیر حبیب اللہ خاں بادشاہ ملک افغان نے اپنے ذاتی خرچ سے بنایا ہے نہ کہ بیت المال سے۔"

تاریخ فرشتہ حالات لکھتا ہے کہ سلطان محمودؒ کو کوشک سبز میں دفن کیا گیا تھا۔ اور ایک چشمہ پہاڑ سے کاٹ کر وہاں لایا گیا تھا۔ اس چشمہ کا نام دہانِ شیر تھا۔ چشمہ کے منہ پر شیر کا منہ بنا ہوا ہے وہاں سے پانی زمین پر گرتا ہے۔ وہ چشمہ موجود تھا۔ اور دہانِ شیر بھی اسی طرح تھا۔ مگر کوشکِ سبز کا نام ونشان نہ تھا۔ مولانا سندھیؒ اس مقبرے پر بہت دیر تک مراقبہ میں رہے۔ پھر ختم دے کر پہاڑ پر جہاں قبریں تھیں سیر کرنے چلے گئے۔ وہاں قبریں ہی قبریں تھیں۔ اس پہاڑ پر چھوٹا سا چبوترہ تھا اس چبوترے پر لکھا ہوا تھا" ہم نے ایک سنگ مزار دیکھا اس سنگِ مزار پر نام امیر ناصر الدین

سبکتگین اور اس کی وفات کا مہینہ لکھا ہوا تھا۔ اس سنگِ مزار پر ہم نے اپنے خرچ ذاتی سے نہ کہ بیت المال سے یہ چبوترہ بیادگار امیر ناصرالدین سبکتگینؒ کے لیے بنوایا"۔ نیچے نام امیر حبیب اللہ کا تھا۔
شیخ عطارؒ کی قبر دریائے غزنہ پر تھی۔ پھر حکیم سنائیؒ کی قبر کی زیارت کی۔ اس پر گنبد نہایت ہی اچھا بنا ہوا تھا۔ اور چند مجاور بھی بیٹھے تھے۔ پھر زیارتوں سے فارغ ہو کر پوسٹ آفس غزنی میں آئے۔ مولانا نے ایک خط بطرف سردار محمود خاں طرزی 'ایڈیٹر اخبار سراج الاخبار' روانہ کیا۔ اس میں لکھا کہ "از ایام بوقلمون و فتنہائے گوناگوں وطنِ مالوف را وداع کردہ رُخ باین طرف کردیم و بہ سبب تولائے مردانِ این خاک و بوم' برانگیختم خاطر از شام و روم"۔

تین دن کے بعد ہم کابل پہنچے۔ اثنائے راہ میں ایک فوجی جمعدار ہر مسافر خانہ پر ہمارے پاس آتا تھا۔ مولانا اس کو ایک روپیہ دیتے تھے۔ جب ہم کابل کے دروازے پر پہنچے تو اس جمعدار نے راہداری ہم سے لے کر منشی دربان کو دی اور ہم کو کابل کے اندر روانہ کر دیا۔ جب وہ راہداری اس نے نقل کر لی تو ہم کو واپس کر دی۔ یہ اس کی مہربانی تھی۔ ہم مسٹر ابراہیم خاںؒ جو مولوی محمد صادق صاحب کراچی والے کے چچازاد تھے اور حبیبیہ کالج میں ملازم تھے اور مولانا نے انھیں کابل کی طرف بھیجا تھا اور اُن کے ساتھ اپنا بھتیجا عزیز احمد بھی روانہ کیا تھا اُس کے پاس جا کر اترے۔ مولانا تو مسٹر ابراہیم کی جگہ پر رہے اور باقی لوگ علیا حضرت کی مسجد میں ایک کوٹھری لے کر رہنے لگے۔ اس وقت ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ ہم نے جو اسباب کپڑے وغیرہ بنائے تھے ان کو نیلام کر کے گزر کرتے رہے۔

مسٹر ابراہیم خاں نے تمام سرداروں کے نام اور مقام بتائے اور مولانا سے کہا کہ پہلے تو ولی عہد نصراللہ خاں نائب سلطنت تھا مگر اب انگریزوں نے کوشش کی ہے کہ امیر حبیب اللہ خاں کے بڑے بیٹے عنایت اللہ خاں کو ولی عہد بنائیں۔ اور امیر حبیب اللہ خاں بھی اس پر راضی ہیں۔ اور نصراللہ خاں نائب سلطنت کبیدہ خاطر ہیں۔ مگر ایک تیسری شخصیت بھی خفیہ خفیہ آگے بڑھ رہی ہے۔ وہ امان اللہ خاں ہیں، جو امیر حبیب اللہ خاں کے چھوٹے بیٹے ہیں۔ امان اللہ خاں کی والدہ ماجدہ کا خطاب عُلیا حضرت ہے۔ یہ اعتمادالدولہ کی بیٹی ہیں۔ اعتمادالدولہ شاہی خاندان کے بڑے معزز رکن ہیں۔ یہ اعتمادالدولہ امیر عبدالرحمٰن کے بڑے وزیر تھے اب پنشن خوار ہیں۔

امیر حبیب اللہ خاں عید کے ایام میں ان کی سلامی کو جاتا ہے۔ ان کو حاضر باشی معاف ہے۔

علیا حضرت امیر حبیب اللہ خاں کی بڑی بیگم ہیں۔ بادشاہوں کی عورتیں بہت ہوتی ہیں۔ مگر بیگم کا خطاب صرف ایک کو ملتا ہے اور صلاح مصلحت ملکی میں وہ شریک ہوتی ہے۔ مسٹر ابراہیم نے فرمایا اس لیے امان اللہ خاں خفیہ خفیہ آگے بڑھ رہا ہے۔

سردار محمود خاں طرزی کی لڑکی امان اللہ خان معین الدولہ کے نکاح میں تھی اور اس کو ثریا بیگم کا خطاب تھا۔ سردار محمود خاں طرزی کی وساطت سے جب ہم کابل پہنچے تو پہلے پہلے سردار محمود خاں طرزی کا آدمی ہمارے ملنے کے لیے آیا اور پھر مسٹر ابراہیم اور مولوی عبید اللہ سندھیؒ مل کر طرزی کے سلام کو گئے۔ طرزی صاحب نہایت خوش ہوئے اور انھوں نے مولانا کی ملاقات معین السلطنت عنایت اللہ خاں سے کرائی۔ بہت دنوں بعد مولانا' امان اللہ خاں معین الدولہ سے ملے اور اُن سے اس طرح گفتگو کرتے رہے جس سے وہ سمجھتا رہا کہ یہ ولی عہد مجھے سمجھ رہے ہیں آیندہ بھی ہمیشہ جب امان اللہ خاں سے مولانا سندھی کی ملاقات ہوئی اُن سے ایسے القاب سے گفتگو کرتے رہے جیسے کوئی ولی عہد سے کرتا ہے۔ ایک بار سردار محمود خاں طرزی کی معیت میں سردار عنایت اللہ خاں کے مکان پر مولانا سندھیؒ کی دعوت ہوئی۔ اس میں فقط سردار محمود خاں طرزی اور سردار عنایت اللہ خاں ہی تھے۔

اس کے بعد مولانا سندھیؒ گورنر قندھار محمد یونس خاں (عم نادر خاں) کا خط لے کر جناب سردار نادر خاں سپہ سالار کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صوفی جان محمد کا خط بھی دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سردار نادر خاں' ان کی فیملی اور تمام خاندان مولانا رشید احمد گنگوہیؒ' سرپرست مدرسہ دیوبند' کے خاص مرید تھے۔ اس لیے مولانا سندھیؒ کو ہر طرح کی امداد دینے کا وعدہ فرمایا۔ اس کے بعد مولانا سندھیؒ مولانا عبد الرزاق خاں سرپرست میزان العدالت دالتحقیق سے ملاقات کے لیے گئے۔ مولانا عبد الرزاق خاں دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے انھوں نے حدیث کا دور کیا تھا۔ اب وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے کہ آپ کی ہند سے آمد کی خبر مجھے مل گئی تھی۔ انھوں نے بھی امداد دینے کا وعدہ کیا۔ پھر عنایت اللہ خاں کی وساطت سے نصر اللہ خاں

نائب السلطنت کی ملاقات کا بندوبست کیا گیا۔ اور مولانا سندھیؒ کو ان دونوں بزرگوں یعنی مولانا عبدالرزاق اور معین السلطنت عنایت اللہ خاں نے کہا کہ آپ اپنے خیالات اور ملکی حالات و مقاصد ایک عریضے میں لکھیں اور وہ لکھا ہوا بیان نصراللہ خاں نائب السلطنت کو پیش کر دیا جائے۔ مولانا سندھی نے موجودہ حالات لکھے اور عنایت اللہ خاں کو دے دیے۔ عنایت اللہ خاں نے مولانا کا عریضہ نائب السلطنت نصراللہ خاں کو پیش کیا۔ پھر مولانا سندھی کی ملاقات نائب السلطنت سے کرائی۔ نصراللہ خاں حالات پڑھ کر بہت خوش ہوئے لیکن فرمایا کہ اصل مطلب کا فیصلہ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں کے ہاتھ میں ہے۔ ان سے ملاقات کے بعد آپ کو اپنے کام کی اجازت دے دی جائے گی۔

ایک مہینہ بڑی تنگی سے گزارا۔ پھر ایک دن شاید نائب السلطنت نے مہمانی کے طور پانچ سو روپے کابلی بھیج دیے۔ مولانا نے پچاس روپیہ مجھے (مولانا عبداللہ لغاری کو) دیا اور فرمایا کہ جا کر غربا میں تقسیم کر دو۔ میں تقسیم کر رہا تھا کہ دیکھا ایک بوڑھی عورت مکئی کی روٹی جس کو افغانستان میں جواری روٹی کہتے ہیں، نان بائی سے خرید کر لے جا رہی ہے۔ میں نے اُسے ایک روپیہ دے دیا وہ دعائیں دینے لگی اور کہا کہ ہم تین دن سے بھوکے تھے۔ آج کچھ پیسے ملے تو یہ روٹی خریدی۔ پھر اُس نے واپس لوٹ کر نان بائی سے گیہوں کی روٹی خریدی اور کچھ بھاجی لے لی۔ جب واپس ہوئی تو میں نے اُسے پانچ روپے کابلی اور دیے تو وہ اور خوش ہوئی اور دعائیں دیتی چلی گئی۔ میں نے مولانا سے ذکر کیا تو انھوں نے شکر ادا کیا کہ ایک مسکین کو ہمارے ہاتھ سے امداد مل گئی۔

جب ہم قندھار سے نکلے اسی تاریخ کو جرمنی اور ٹرکی کا مشن، جس کے ساتھ راجہ مہندر پرتاب اور مولوی برکت اللہ بھی تھے، ایران کی سرحد پار کر کے کابل کی حدود میں داخل ہو گئے تھے۔ جب ہم غزنی میں تھے اس وقت ہم کو خبر ملی کہ جرمنی ترکی کا وفد کابل پہنچ گیا ہے۔ اور اسلامیہ کالج کے چند طلبہ بھاگ کر ہم سے آگے ایک مہینہ کابل میں پہنچ گئے تھے۔ ان کو کابل میں نظر بند رکھا گیا تھا۔ اور ان کے متعلق کہا جاتا تھا کہ یہ فراری طالب العلم ہیں۔

مولانا سندھیؒ نصراللہ خاں نائب السلطنت سے ملاقات کے بعد عزت مآب منیر بیگ

ڈاکٹر سرکاری ہسپتال کے توسط سے ترکی جرمن مشن کے بعض ممبروں سے خفیہ ملاقاتیں کرتے رہے۔ ایک مہینہ گزر گیا تو بھی امیر صاحب سے ملاقات کا کوئی بندوبست نہ ہوا۔ اگرچہ مولانا سب سرداروں سے مل چکے تھے۔ اُن کی عادتِ مبارک تھی کہ صبح کی نماز بہت سویر پڑھ کر کابل کے شہر سے باہر سیر کو نکل جاتے تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہاں چہل قدمی کرتے ہوئے اپنا وردِ وظیفہ پورا کرتے تھے۔ پھر سورج نکلنے کے بعد واپس آجاتے تھے۔ غالباً دسمبر کا مہینہ تھا حسبِ عادت مجھے ساتھ لے کر شہر سے باہر گئے۔ وہاں عنایت اللہ خاں معین السلطنت گھوڑے پر سوار ہوا خوری کے لیے بڑی سڑک پر جا رہے تھے۔ ان کی نظر مولانا پر پڑی۔ گھوڑا واپس لائے اور مولانا سے باتیں کرنے لگے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے یہ بھی کہہ دیا۔ "معذور دارید کہ اعلیٰ حضرت امیر صاحب زشما آگاہ نہ پرسیدہ است۔" پھر گھوڑا موڑ کر چلے گئے۔ جب ہم واپس مسٹر ابراہیم کے مکان پر آئے تو مولانا نے ان سے ان الفاظ کا مطلب پوچھا۔ مسٹر ابراہیم نے کہا کہ امیر صاحب کی یہ عادت ہے کہ جب تک وہ خود کسی کا حال نہ پوچھیں کسی کو جرأت نہیں ہوتی کہ کسی کا حال بیان کرے اس کے بعد مولانا نے مجھ سے کہا کہ جو بوٹ اور سوٹ امیر صاحب پہنتے ہیں اسی کپڑے سے ویسے ہی سوٹ میرے لیے تیار کراؤ۔ ٹوپی بھی ویسی ہی ہو جیسی امیر صاحب پہنتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت امیر صاحب ہفتے میں ایک دن ظہر کے بعد ہوا خوری کو شہر سے باہر چلے جاتے تھے اور عصر کی نماز واپس گھر آکر پڑھتے تھے۔ ایک ایسے ہی موقع پر مولانا نے وہ سوٹ پہنا، سر پر امیری ٹوپی رکھی اور چھوٹا سا سفید کپڑا بطور عمامہ لپیٹ لیا۔ مسٹر ابراہیم اور مجھے ساتھ لے کر جدھر اعلیٰ حضرت امیر صاحب ٹینس کھیلتے تھے وہاں ایک جگہ جا کر کھڑے ہو گئے۔ ہم جہاں کھڑے تھے وہ جگہ بڑی سڑک سے بیس فٹ دُور تھی چند منٹ بعد ہم نے دیکھا کہ امیر صاحب کی موٹر آرہی ہے۔ اس پر خاص شاہی نشان تھا ہم صف باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ امیر صاحب کے پاس ہمیشہ ایک دُوربین رہتی تھی۔ امیر صاحب نے اس سے دیکھا کہ تین آدمی کھڑے ہیں۔ ان میں ایک مسٹر ابراہیم تھے انھیں پہچان لیا۔ وہ دربار میں آتے جاتے تھے۔ ایک سفید ریش سوٹ بوٹ میں ملبوس کھڑے ہیں۔ (یہ مولانا تھے) میں اپنے ہندوستانی لباس میں تھا۔ امیر صاحب نے نادر خاں کے بھائیوں، ہاشم خاں اور شاہ ولی خاں سے پوچھا کہ یہ بوڑھا کون ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہم نہیں جانتے۔ شاید عنایت اللہ خاں کو خبر ہو گی۔ حالانکہ

یہ دونوں سرسروش (باڈی گارڈ) ہمیں بخوبی جانتے تھے اور چند بار ہمارے ساتھ دعوتوں میں بھی شریک ہوئے تھے۔ مگر انھیں اجنبیوں سے ملنے کا حکم نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ سردار عنایت اللہ خاں کی موٹر امیر صاحب کی موٹر سے پیچھے تھی۔ اُسے اشارہ کیا۔ اُن کی موٹر امیر صاحب کی موٹر سے آملی۔ امیر صاحب نے عنایت اللہ خاں سے پوچھا کہ یہ بوڑھا کون ہے۔ سردار صاحب نے جواب دیا۔ "من نمی دانم"۔ پھر موٹریں چل دیں۔

ہم واپس شہر آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ عنایت اللہ خاں نے کہا تھا کہ زیادہ حقیقت نصراللہ خاں کو معلوم ہے۔ امیر صاحب نے نصراللہ خاں کو بلا کر پوچھا۔ انھوں نے سارا حال بیان کر دیا۔ اس کے بعد امیر صاحب نے ملاقات کا وقت معین فرمایا اور مولانا سندھی کو قصر دلکشا میں بلایا۔ اس ملاقات میں فقط اعلیٰ حضرت امیر صاحب تھے اور مولانا تھے۔ کمرے میں ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی، جس کے پاس دو کرسیاں تھیں۔ مولانا کا ہاتھ پکڑ کر بڑی محبت سے ایک کرسی پر بٹھایا اور دوسری کرسی پر خود تشریف فرما ہوئے۔ نائب السلطنت نصراللہ خاں نے مولانا کا لکھا ہوا مضمون اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کیا۔ اور خود دروازے پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ اعلیٰ حضرت نے وہ مضمون پڑھا اور بہت خوش ہوئے۔ اور فرمایا کہ ہندوستانی کام کرو۔ اعلیٰ حضرت امیر صاحب کو اتحاد اسلام سے زیادہ محبوب ہندوستانی کام تھا۔

اب اس سے آگے ہم مولانا سندھی کی ڈائری لکھتے ہیں، جو چھپ چکی ہے۔ اس ڈائری کا قصہ یوں ہے کہ مولانا عبداللہ لغاری نے ۱۳۵۲ھ میں ایک روز مولانا سے مکۂ مکرمہ میں عرض کیا کہ مہربانی فرما کر آپ نے کابل میں جو انقلابی کام کیا اس کا مختصر سا حال مجھے املا کرا دیں۔ اگرچہ مجھے اکثر واقعات یاد ہیں۔ لیکن میں خود لکھوں تو شاید غلطی کر جاؤں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ آپ لکھاتے جائیں اور میں لکھتا جاؤں۔ حضرت مولانا نے منظور فرما لیا۔ اور ڈائری کا مضمون املا کرایا۔

اس میں اکثر واقعات وہی ہیں جو بعض لوگوں کو خصوصاً حکومتِ ہند کو معلوم تھے۔ لیکن بعض باتیں اشارۃً بھی لکھی ہیں۔ پھر وہ کتاب یا ڈائری میں نے ایک حاجانی عورت کو جو حج اکبری میں آئی تھی حوالے کر دی اور ان کو کہا کہ یہ ڈائری میرے گھر میں پہنچا دینا اور میرے گھر والوں کو کہنا کہ اس کو نہایت احتیاط سے چھپا کر رکھیں۔ پھر جب مولانا عبیداللہ سندھیؒ مارچ ۱۹۳۹ء میں واپس

ہندوستان آئے۔ کئی دن کراچی میں رہ کر پھر دہلی، دیوبند اور کلکتہ سے ہوتے ہوئے واپس سندھ میں تشریف لائے تو ایک دن میرے پاس میرپور میں آکر فرمایا کہ وہ ڈائری مجھ کو دے دو۔ ایک صوبہ سرحد کا آدمی جو یاغستان میں رہتا ہے اُس نے وعدہ کیا ہے کہ اسے طبع کرا کر شایع کروں گا میں نے عرض کیا مجھے نقل کر لینے دیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں اب دہلی جانے والا ہوں اور وقت تنگ ہے۔ اس وقت ریل تیار ہے مجھے ڈائری دے دو۔ آخر میں نے وہ ڈائری ان کے حوالے کر دی آپ لے کر چلے گئے۔ شاید آپ نے مولانا تسلیم الحق فاضل دیوبند زیارت کا کا صاحب کو دی تھی انھوں نے اس وقت نہیں چھاپی۔ مولانا کی زندگی میں یہ شائع نہیں ہوئی۔ جب ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہوا اور پاکستان بن گیا۔ اس وقت انھوں نے مولانا عبدالقدوس قاسمی زیارت کا کا صاحب ضلع پشاور کو یہ ڈائری دی اور انھوں نے اس کو شائع کیا۔ اس میں بہت سی باتیں چھوڑ دی گئی ہیں اور ترتیب کو بھی آگے پیچھے کر دیا ہے۔ اس وقت جس ترتیب سے یہ ڈائری چھپی ہے اسی ترتیب سے ہم ناچار ہو کر لکھتے ہیں۔ اور جو اشارات ہیں انھیں کھول کر بیان کریں گے۔ میرا حافظہ کم ہے۔ اس وقت میری عمر ۹۰ سال کے قریب ہے اور مولانا امام عبیداللہ سندھیؒ کی وفات حسرت و یاس سے دل شکستہ ہے۔ اس لیے جو کچھ یاد ہے اپنی یاد کے مطابق لکھتے ہیں۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ مولانا شیخ الہند کی تحریک سے ہندوستان آزاد ہوا ہے۔ اس تحریک کو چلانے والے مولانا عبیداللہ سندھیؒ تھے۔ مہاتما گاندھی بھی اس تحریک سے پیدا ہوئے ہیں۔ مولانا کے ریشمی خطوط ظاہر ہوئے اور بہت سی گرفتاریاں ہوئیں۔ اس کے بعد رولٹ ایکٹ بنا۔ رولٹ ایکٹ کے دفعات بہت سخت تھے۔ اگرچہ رولٹ ایکٹ میں صاف لکھا تھا کہ مولوی عبیداللہ سندھیؒ کی تحریک کو دبانے کے لیے یہ ایکٹ بنایا جاتا ہے۔ مگر اس کا اثر ہندو انقلابیوں پر بہت پڑا۔ جب یہ رولٹ ایکٹ سنہ ۱۹۱۹ء میں شایع ہوا تو ہندو اور مسلمان سب اس ایکٹ کے خلاف جلسے کرنے لگے اس سے پہلے گاندھی جی انگریزی لشکر جمع کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور خلوص دل سے گورنمنٹ کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔

گاندھی جی نے افریقہ میں ستیہ گرہ کر کے کامیابی حاصل کی تھی۔ اس وقت گاندھی نمودار ہوئے

اور کہا کہ میرے پیچھے لگو تو میں اس رولٹ ایکٹ کو منسوخ کرا تا ہوں۔ ایک تو اس بات پر ہندو اور مسلمان جمع ہو گئے۔ دوسرے ترکی کو شکست ہوئی اس کو حکم برداری کے ماتحت کرنے کے لیے یورپین سلطنتیں گفت و شنید کر رہی تھیں۔ ان کا مطلب تھا کہ ترکی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے اس کے بعد عرب کے ٹکڑے جدا کر لیے تھے۔ کچھ ٹکڑے برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں رکھے اور شام فرانسیسیوں کو دے دیا۔ اس سے مسلمانوں کا دل شکستہ ہو گیا۔ وہ انگریزوں کے برخلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور کانگریس میں شریک ہو کر برطانیہ کے خلاف پروپیگنڈے میں شامل ہو گئے۔ گاندھی جی نے سمجھایا کہ ستیہ گرہ سے یہ مشکلیں سب حل ہو جائیں گی۔ اس زمانے میں جلیان والا باغ امرتسر میں فساد ہوا اور لاہور میں بھی فساد ہوا، وزیر آباد کا اسٹیشن جلایا گیا۔ اور اسی طرح احمد آباد میں بھی سخت فساد ہوا۔

یہ گاندھی جی کے ظاہر ہونے کی تاریخ ہے۔ اگر ہم یوں کہیں کہ گاندھی بھی مسلمانوں کی ٹھوکر سے نمودار ہوا ہے تو درست ہوگا۔ یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ دوسری عالمگیر جنگ میں برطانیہ نے ہندوستان کو آزاد کر دیا، انڈونیشیا آزاد ہوا۔ یہ بھی مولانا شیخ الہند اور مولانا عبید اللہ سندھیؒ کی تحریک کے نتیجے ہیں۔ اس وقت بھارت کے نوجوان یا پاکستان کے نوجوان ادھر توجہ نہیں کرتے اور ان کی تحریکوں کو نہیں سوچتے۔ مگر آئندہ نوجوانوں کی نسل متفقہ فیصلہ صادر کریں گے کہ ہندوستان کی آزادی، انڈونیشیا کی آزادی اور ترکی کی آزادی دلانے والے یہ لوگ تھے۔

اب ہم اس کے آگے ڈائری لکھتے ہیں۔ اس کی ترتیب وہی رکھیں گے جو کہ چھپی ہوئی ہے، تاکہ مطالعہ کرنے والوں کو آسانی ہو اور اس میں جو بڑے بڑے رازوں پر اشارہ ہے وہ کھول کر لکھیں گے۔

جس وقت یہ ڈائری لکھی گئی تھی اس وقت ہندوستان غلام تھا اور اس راز کو افشا کرنا مناسب نہ تھا۔ لیکن اگر ہم اب بھی اس کو ظاہر نہ کریں تو یہ بڑی غلطی ہوگی۔

ہندوستان سے روانگی

یہاں سے مولانا سندھیؒ کا املا شروع ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں :-

"شوال ۱۳۳۳ھ مطابق اگست ۱۹۱۵ء کو میں کابل روانہ ہوا۔ اس سے تخمیناً چار مہینے پہلے ہندوستان چھوڑنے کا ارادہ مصمم کر چکا تھا۔ اپریل ۱۹۱۵ء کے شروع میں دہلی سے سندھ چلا آیا اور چار ماہ مختلف مقامات پر گزرے۔"

(آپ پشاور گئے اور سردار عبدالقیوم خاں اور افضل خاں سپرنٹنڈنٹ سے باتیں کیں اس وقت پشاور میں ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کی منعقد ہوئی تھی۔ اور سندھ میں آنا دو سبب سے ہوا۔ ایک تو کچھ قرضہ دینا تھا وہ ادا کیا تھا۔ اور دوسرا یہ تھا کہ بلوچستان کے راستے کوئٹہ سے کابل کی حد میں پہنچیں)۔

"دوستوں سے آخری ملاقاتیں اور ضمناً راستے کے خطرات سے محفوظ رہنے کی تدابیر میں مصروف رہا۔ اللہ تعالےٰ کے فضل سے بلوچستان سے گزر کر ۱۵ راگست کی نمازِ مغرب افغانستان کی سرحد میں پڑھی۔ اور بتوکل الی اللہ کسی پاسپورٹ کے بغیر افغانستان میں داخل ہوئے۔"

(اس کی حقیقت آگے لکھ چکے ہیں)۔

افغانستان میں داخلہ :- جس حصہ ملک میں ہم داخل ہوئے وہ شرادک کا علاقہ تھا۔ وہاں کے حاکم سے ملے تو پاسپورٹ نہ ہونے کی وجہ سے انھیں شکوک پیدا ہوئے مگر ہماری درخواست سن کر کہ آپ ہمیں سرکاری حفاظت میں قندھار پہنچا دیں۔ ہم وہاں جا کر حکومت کو مطمئن کر دیں گے۔ حاکم نے چند سوالات ہم سے پوچھے اور چونکہ ہمارا جواب رفع شبہات کے لیے کافی تھا اس لیے ہمیں حکومت کا معزز مہمان قرار دیا۔"

(یہ سب مہربانی قاضی صاحب (جج) جو حاکم کے ساتھ تھے ان کی طرف سے وقوع میں آئی۔ اس کی حقیقت ہم لکھ چکے ہیں)۔

اور ہمارے قندھار پہنچنے کا سب انتظام کر دیا۔ قندھار میں ہمارے بعض آشنا

مل گئے" ان کا حکومت میں اچھا رسوخ تھا"۔

(ایک تو صوفی ملا محمد حسن درانی جو باکمال اولیا میں سے تھے۔ اور حضرت سید العارفین حافظ محمد صدیق صاحبؒ کے خاص مصاحب تھے۔ وہ مولانا سندھیؒ کو خوب پہچانتے تھے۔ دوسرے صوفی جان محمد جو بہت بڑے عالم اور ولی اللہ تھے، مولانا کی ان سے بھی جان پہچان تھی۔ حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار صوفی جان محمد صاحب دیوبند میں حضرت شیخ الہند کی ملاقات کے لیے آئے تھے اس وقت میں "الانصار" کا ناظم تھا۔ اور اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ ان کو لے کر میرے دفتر میں آئے اور باتوں باتوں میں فرمایا کہ یہ مولوی عبیداللہ سندھی ہیں۔ یہ میرے سب کاموں اور ارادوں سے مکمل واقف ہیں۔ اور میرے دست و بازو ہیں۔ بس اتنی ملاقات کر کے چلے گئے۔ ہم یہاں صوفی مولانا محمد حسن کے یہاں اُترے۔ اس کی حقیقت پہلے لکھ چکے ہیں)۔

"وہ ہمیں اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اس لیے نائب الحکومت نے چند روز نہایت احترام سے ہمیں مہمان رکھا"۔

(ہمیں نیشنل سارٹیفکیٹ دیا۔ ہم وہاں ایک مہینہ رہے۔ انھوں نے ہماری ہجرت منظور کر کے پانچ سو روپیہ کابلی عنایت کیا)۔

"اور فقط کابل کی سند ہی نہیں بلکہ چند روز کابل میں رہنے کا بھی انتظام کر دیا"۔

اپنے بھتیجے سردار نادر خاں کو خط لکھا۔ اسی طرح صوفی جان محمد صاحب نے بھی سردار نادر خاں سپہ سالار کے نام خط لکھ کر دیا۔

"اس طرح ہم ۱۵ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچے۔ اتفاقِ زمانہ سے یہ بات بھی عجیب تھی کہ تاریخ ۱۵ر اکتوبر ہی کو ہمیں کابل سے روس کی طرف سفر کرنے کا پاسپورٹ مل گیا۔ اگرچہ ہماری روانگی ۲۲ر اکتوبر کو عمل میں آئی"۔

(یہ دیر اس لیے ہوئی کہ اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں چاہتے تھے کہ مولانا کے سفر کا راستہ ایسا تجویز کیا جائے جس میں سپہ سالار نادر خاں کو نہ مل سکیں۔ سیدھا راستہ مزار بلخ سے ہوتا تھا۔ اس پر اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں نے سردار نادر خاں سپہ سالار کو محصول وصول کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ وہ وہاں محصول جمع کر رہے تھے۔ اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں کو خوف تھا کہ اگر ان کی

ملاقات سردار نادر خاں سپہ سالار سے ہو گئی تو وہ کبھی ان کو افغانستان چھوڑنے کی اجازت نہ دیں گے۔ دوسرے سردار نادر خاں سپہ سالار اور اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں کے درمیان کچھ رنجشیں بھی تھیں۔ کیونکہ جب جنگِ افغانستان کی صلح کے لیے اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان وفد بھیجنا چاہتے تھے تو سردار نادر خاں کی تمنا تھی کہ ان کو اس وفد کا سردار مقرر کریں۔ مگر امیر صاحب نے سردار محمود خاں طرزی کو اس وفد کا سردار بنایا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ مجھ کو اس تدبیر پر خوشی نہ ہوئی۔ لیکن میں نے اعلیٰ حضرت کو کچھ نہیں کہا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جب ہم کو دشوار گزار راستہ پر جانے کو مجبور کیا تو امیر صاحب کا ایک قاصد میرے پاس آیا۔ وہ کہنے لگا کہ شاید تم راستے میں قتل کئے جاؤ گے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے جواب دیا کہ اگر اس طرح میں قتل ہو گیا تو یقین کرنا کہ نوجوان انقلابی ہندوستان کے آکر میری لاش افغانستان سے نکال کر ہندوستان لے جائیں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ افغانستان سے ہندوستان لڑ جائے گا، اور اپنا انتقام لے گا۔ یہ بات شاید قاصد نے اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں سے کہی تھی۔ اس لیے ہم خیر سلا سے روس کی سرحد میں پہنچ گئے۔ اصل بات یہ تھی کہ انگریزوں نے اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں سے وعدہ کیا تھا کہ آپ جنگِ عظیم میں غیر جانب دار رہیں اس کے صلہ میں گورنمنٹ ہند آپ کو تین کروڑ پونڈ دے گی۔ جب اعلیٰ حضرت حبیب اللہ خاں شہید ہو گئے اور بادشاہِ افغانستان اعلیٰ حضرت امان اللہ خان ہوئے تو افغانستان کی آزادی کے لیے انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ جب انگریزوں نے افغانستان کو آزاد کیا، اور صلح ہو گئی تو اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے اس تین کروڑ کا مطالبہ شروع کیا۔ آخر بہت بحث مباحثہ کے بعد آپس میں اس بات پر صلح ہوئی کہ یا تو مولانا عبید اللہ سندھی کی تحریکِ انقلابی کو بند کر دو یا اس کو اپنے ملک سے باہر نکال دو۔ مولانا سندھی کو تحریک بند کرنے کے لیے بہت کہا مگر مولانا نے انکار کر دیا۔ آخر ان کو حکم دیا کہ آپ ہمارے ملک سے نکل جائیں۔ جب مولانا روس پہنچے اور انگریزوں کو خبر ہوئی اس وقت وہ تین کروڑ کا وعدہ پورا کر دیا گیا۔ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے اعلان کیا کہ آئندہ جماعت دیوبندی کا افغانستان میں کوئی اثر نہیں رہنے دیا جائے گا۔ یہ تھی حقیقت۔ اب تقدیر اور اتفاقِ زمانہ سے یہ واقعہ ظاہر ہوا کہ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں افغانستان کے تخت سے سبکدوش

ہو کر اٹلی میں پناہ گزین ہوئے۔ پہلی بار جب اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں حج کے لیے مکۂ مکرمہ میں آئے تو مولانا نے ان سے ملاقات نہیں کی۔ جب دوسری بار آئے تو ہم لوگوں کو مولانا سندھی نے فرمایا کہ تم لوگ جاکر ملاقات کرو۔ انھوں نے ہم سے پوچھا کہ مولانا سندھی مجھ سے ملاقات کیوں نہیں کرتے؟ ہم نے جاکر مولانا سے ذکر کیا۔ مولانا ملاقات کے لیے گئے۔ اور ان کے درمیان کچھ خاص باتیں ہوئیں۔

مولانا کا بیان: "ان سات سالوں اور سات دنوں میں جو کچھ ہم نے دیکھا اور کام کیا اس کا اکثر حصہ اس قابل نہیں کہ عام طور پر کتابوں میں لکھا جائے۔ لیکن کسی قدر واقعات لکھنے کو ہمارا دل چاہتا ہے۔ اس سے پہلے چند فصول افغانستان اور اس کی سلطنت کے متعلق لکھتے ہیں تاکہ ہمارا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو۔

تمہید:۔ پشتو ایران اور ہندوستان کی سرحد پر ایک زبان بولنے والی قوم آباد ہے۔ اسے فارسی میں پوشتانہ اور ہندی میں پٹھان کہا جاتا ہے۔ پوشتانہ کے معنی مختلف اقوام ہے، کیونکہ اس ملک میں مختلف عناصر محفوظ ہیں۔ جیسے ترک، ایرانی، یونانی، ارمنی، یہودی، عرب، سب قوموں کے آثار ملتے ہیں۔ اس لیے پشتو زبان کو پوشتانہ کہتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہم تحقیق کرسکے ہم اس قوم کو قدیم اقوام کا ایک حصہ مانتے ہیں۔ تاریخ یمینی اور کامل ابن الاثیر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑی قومیں اس وقت سلطان محمود کی فوج میں داخل ہوئیں جبکہ سلطان محمود نے راجہ جے پال لاہور کو شکست دے کر نعمان کے علاقہ پر قبضہ کرلیا۔ جہاں اس وقت تک ہندو بت خانے موجود ہیں۔ باوجودے کہ یہ لوگ فوج میں داخل ہوئے تھے مگر سب نے اسلام قبول نہ کیا تھا۔ اور سلطان شہاب الدین غوری کے زمانے میں انھوں نے اسلام قبول کیا تھا۔

پشتو گرامر فارسی کے مقابلہ میں سنسکرت سے زیادہ ملتی ہے۔ فعل کا مفرد اور جمع فارسی میں فاعل کے تابع ہے اور ہندی میں مفعول کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح پشتو گرامر میں ہے۔

پشتو ـــــ بھی ہندی کی تابع ہے کہ پشتو حروفِ ہجا میں ایک ایسا حرف پایا

جاتا ہے جیسے بعض قبائلی شین سے پڑھتے ہیں اور دوسرے اُسے خ کی طرح تلفظ کرتے ہیں۔ بعینہٖ یہ حرف ہندی حروفِ ہجا میں پایا جاتا ہے۔ پٹھانوں کے بعض قبائل ایسے ناموں سے مشہور ہیں جس نام کی ہندو قومیں ہندوستان میں بستی ہیں۔ جیسے بہروغ لودھی، سوری ایک ہی قبیلے کے افراد ہیں جو قندھار میں بستے ہیں، وہ سب کے سب مسلمان ہیں۔ اور جو بلوچستان میں بستے ہیں وہ ہندو ہیں۔

افغانستان :- اصل میں پشتو بولنے والے علاقے کا نام افغانستان ہے۔ پرانا لفظ اوگانستان تھا۔ اس علاقہ کا ایک حصہ سلطنتِ افغانیہ کا اساسی قطعہ سمجھا جاتا ہے۔ قندھار، قلات، غلزائی، جلال آباد اس کے بڑے شہر ہیں۔ اس کا دوسرا حصہ بدقسمتی سے ہند کی برطانوی سلطنت میں داخل ہے جسے شمالی مغربی صوبہ کہا جاتا ہے۔ ہم اسے پشتانیہ کہتے ہیں۔ پشاور، کوہاٹ، بنوں، ڈیرہ اسماعیل خاں اس کے بڑے شہر ہیں۔ سوات، باجوڑ اس کی سرحدی ریاستیں ہیں۔ مہمند، وزیر محسود — قومی حکومتیں ہیں۔ سلطنتِ افغانیہ کا مشرقی حصہ افغانستان ہے۔ اور شمال میں ہندوکش پہاڑ سے اوپر افغانی ترکستان ہے جس میں مہمند، بلخ، بخارا اور بدخشاں واقع ہے۔ مغربی حصہ ہرات صوبہ ایران کا ایک حصہ ہے، جو افغانوں نے فتح کر لیا تھا۔

سلطنت کے اساسی نظام میں دہلی کے اکبر شاہی نظام کے دھندلے سے نشان ملتے ہیں۔ سالوں کے نام اور سنہ اور ہندو مسلمانوں کو برابر سمجھنا اور نوکریوں میں ان کو برابر جگہ دینا یہ اکبر شاہی نظام کے نشان ہیں۔ اور بھی بہت ہیں۔ حکومت کی زبان فارسی ہے جس میں ہندی الفاظ کثرت سے مستعمل ہیں۔ اسی طرح ترکی الفاظ کی آمیزش بھی کثرت سے پائی جاتی ہے۔

دار السلطنت کابل۔ کابل کا لفظ اصل میں گاؤپال تھا۔ (یہاں گاؤرکشا کا ایک مندر تھا)، جو بگڑ کر کابل ہو گیا ہے۔ دار السلطنت کابل میں ایرانی، افغانی ترک اور ہندی آباد ہیں۔ تجارت میں، زراعت میں، ملازمت میں سب شریک ہیں۔ اس وقت ہندی سے ہماری مراد ہندو اور سکھ ہیں۔ جو افغانستان کی آبادی کا ایک

اہم عنصر ہیں۔ ہم جس وقت کابل پہنچے اس وقت ان کے علاوہ دار السلطنت میں اور بھی ہندوستانی ملے تھے جنھیں ہم مختلف حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ ہندوستان کے ہندو اور مسلمان تجارت کے لیے افغانستان میں کثرت سے ہیں۔ اور آمد و رفت رکھتے ہیں۔ سندھی ہندو اور پشاوری مسلمان ممتاز نظر آتے ہیں۔ پشاوریں مسلمانوں کا ایک حصہ انگریزی سرمایہ سے تجارت کرتا ہے۔ ان کے گماشتے افغانستان پر چھائے ہوئے ہیں۔

۲۔ بہت پرانے زمانے سے لے کر افغانستان سے عربی زبان میں تکمیل علم دین کے لیے اکثر طالب علم ہندوستان کے دینی مدارس میں آتے ہیں۔ یہ لوگ ہندی زبان جانتے ہیں۔ اور ہندوستانیوں سے زیادہ مانوس ہو جاتے ہیں۔

۳۔ جب سے اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے یورپین علوم و فنون کی ترویج پر توجہ فرمائی اس وقت سے معلمین کی ایک جماعت کابل میں ہمیشہ رہتی ہے۔ یہ لوگ اکثر پنجابی ہیں۔

۴۔ ان کے ساتھ ساتھ پنجابی طبیبوں کی بھی ایک جماعت ہے جن میں ایک آدھ اچھا ڈاکٹر ہے۔ باقی سب کے سب کمپونڈر یا ڈاکٹر نما طبیب ہیں۔ انھیں بہت اچھی تنخواہیں ملتی ہیں۔ اور پرائیوٹ معالجہ سے بھی کافی روپیہ کما لیتے ہیں۔

۵۔ کابل میں چند ہندوستانی معلم ایک سیاسی سازش کے الزام میں مشروطیت پسند (آزادی پسند) افغانوں کے ساتھ جیل میں مقید ہیں۔

۶۔ پنجاب کے کالجوں سے چند تعلیم یافتہ نوجوان ترکی کی حمایت میں ہندوستان چھوڑ کر افغانستان کا سفر کرتے ہوئے پکڑے گئے جو پولیس کی حفاظت میں رہتے ہیں۔

(ان نوجوانوں کو مولانا سندھیؒ نے کوشش کرکے آزاد کرایا اور اپنی جگہ پر ان کے رہنے کا انتظام کیا۔ یہ ساری کوشش سردار نادر خاں اور سردار محمود طرزی کی تھی)۔

اس زمانے میں میرے دو معزز دوست شیخ ابراہیم ایم۔ اے اور مولوی محمد علی قصوری ایم۔ اے تعلیمی صیغے میں ملازمتوں کے لیے کابل پہنچ گئے تھے، اور حبیبیہ کالج

یا اسکول میں کام پر لگائے گئے۔ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ میں نے اپنا عزیز بھتیجا عزیز احمد برادرم مولوی احمد علی لاہوری کو بھی کابل روانہ کر دیا تھا کہ وہیں حبیبیہ اسکول میں تعلیم حاصل کرے۔"

(یہ شیخ ابراہیم ایم۔ اے مولانا محمد صادق کراچی والے کے خویشوں میں سے ہیں۔ جب مولانا سندھ میں آئے تھے اور ان کا خیال کابل جانے کا تھا تو انھوں نے شیخ ابراہیم کو تیار کیا کہ تم کابل میں جاکر حبیبیہ کالج میں پروفیسر بنو۔ اس نے عرض کیا مجھ پر کچھ قرضہ ہے اگر وہ اتارا جائے تو میں جانے کے لیے تیار ہوں۔ یہ قصہ مولانا سندھی نے سید عبداللہ ہارون سے کہا۔ اُس نے کہا یہ رقم میں ادا کروں گا۔ اور یہ رقم مفت دوں گا۔ شاید یہ رقم ایک ہزار کے برابر تھی۔ مولانا نے یہ رقم وصول کر کے شیخ محمد ابراہیم کو دی۔ مگر افسوس کی بات ہے کہ جب سیٹھ عبداللہ ہارون کو خبر ہوئی کہ وہ کابل سے روس کو سفر کرتے ہوئے راستے میں شہید ہو گئے ہیں تو سیٹھ عبداللہ ہارون نے شیخ صاحب کی بیوی کی بیماری کے باوجود اس کے مکان پر دعویٰ کر کے نیلام کرانا چاہا۔ جب سیٹھ عبداللہ ہارون نے یہ رقم دی تھی اس وقت مولانا محمد صادق بھی موجود تھے۔ قرضہ کی صورت ہی نہ تھی بلکہ امداد تھی۔ مولوی محمد صادق نے سیٹھ صاحب کو بہت سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے اور اس کا مکان نیلام کر کے اپنی رقم وصول کر لی۔

۷۔ اکتوبر سنہ ۱۹۱۵ء کے پہلے ہفتہ میں ہندوستانیوں کا ایک سیاسی مشن کابل پہنچ چکا تھا جس میں ترک اور جرمن بھی شریک تھے۔

اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں شہید :۔ اگر اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں کی پرائیویٹ زندگی سے قطع نظر کیجیے تو انھیں شاہِ اصلاح پسند کہنا چاہیے۔ ہمیں اپنی اس رائے کے اظہار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اگر امیر عبدالرحمٰن کے بعد امیر شہید جیسا بادشاہ نہ آتا تو افغانستان میں کبھی بھی موجودہ ترقی کا دَور نہ جاری رہ سکتا۔ امیر حبیب اللہ خاں نے دو اسکول جاری کیے۔ ایک اسکول کا نام حبیبیہ اسکول ہے جس میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے اور دوسرے اسکول کا نام حربیہ ہے جس میں جنگی

تعلیم دی جاتی ہے۔ دو شفاخانے بنائے ایک کا نام شفاخانہ ملکی دوسرے کا نام شفاخانہ نظامی ہے۔ یہ دونوں شفاخانے نئے طریقے پر بنائے۔ حبیبیہ کالج کا نظام تمام تر ہندوستانیوں کے ہاتھ میں تھا۔ حافظ احمد دین بی۔ اے۔ اس وقت ہیڈ ماسٹر تھے۔ شیخ محمد ابراہیم ایم۔ اے۔ کو میں نے انھیں کی معرفت کابل بھیجا تھا۔ اور محمد علی قصوری ایم۔ اے۔ کو حافظ جی اپنے انتخاب سے لے گئے تھے۔

حربیہ اسکول کا انتظام ترک افسروں کے قبضے میں تھا۔ شفاخانہ ملکی کا افسر ڈاکٹر منیر عزت بیگ ترک تھا جو بڑا شریف ترک تھا۔ اسی طرح نظامی شفاخانہ کا بڑا افسر ایک ہندوستانی تھا۔ ایک ہندوستانی ڈاکٹر الہ جوایا خاں تھا۔ لیکن دونوں شفاخانوں کا نظام ہندوستانی تھا۔ امیر صاحب نے ایک دو نہایت عالی شان عمارتیں بنوائی ہیں جن میں کچھ یورپین انجنیروں نے بھی کام کیا ہے۔

مشین خانہ :۔ مشین خانہ جو امیر عبدالرحمن خاں نے بنوایا تھا جس میں اسلحے وغیرہ تیار ہوتے تھے۔ اس میں افغانی، ترکی، ہندوستانی کام کرتے رہے۔ امیر شہید نے اسے برقی قوت سے چلانے کا سامان مہیا کر دیا تھا۔ جبل السراج میں برقی قوت پیدا کرنے کا اول درجہ کا عمل تیار کر دیا تھا۔ لیکن اجنبی انجنیر کام کی تکمیل میں روڑا اٹکاتے رہے۔ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے استقلال کے چند ہی روز میں کام جاری کر دیا۔ اور اس کی تکمیل کا سہرا ایک ہندوستانی مسلمان انجنیر کے سر باندھا گیا۔ امیر شہید نے سراج الاخبار جاری کیا تھا جس کی ادارت کی باگ چند روز کے بعد سردار محمود خاں طرزی کے سپرد کی گئی۔ سراج الاخبار کے مطبع میں ہندوستانی اور مصری کام کرتے رہے۔ امیر شہید کے اصلاحی کام کا قطبِ مدار اگر سردار محمود خاں طرزی کو قرار دیا جائے تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا۔ میں ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے بخوبی واقف ہوں۔ اصلاحِ افغانستان میں جس قدر ثابت قدمی سے اس مردِ خدا نے جہاد کیا ہے اس کی نظیر مشرقی اقوام میں بہت کم ملے گی۔

امیر شہید نے شرفائے افغانستان کی زندگی کی اصلاح و ترقی میں نمایاں کام کئے۔ کابل سے باہر آپ ایک گھر معمولی حیثیت میں پائیں گے مگر اندر جا کر دیکھیں گے تو نہایت صاف منظم آراستہ

ایک نمونہ ہوگا۔

امیر شہید اگرچہ اعلیٰ حضرت شاہ افغانستان کا مسلم لقب رکھتے ہیں۔ یعنی مستقل آزاد افغانستان کا بادشاہ۔ مگر سوائے ایک انگریزی معمولی قونصل جو عموماً ایک پنجابی مسلمان ہوتا ہے ان کے دربار میں کسی دوسری دَولت کا رسمی طور پر کوئی آدمی نہیں رہتا تھا۔ البتہ مسلمان حکومتوں کے معزز افراد کابل میں اپنی شخصی حیثیت میں ممتاز نظر آتے تھے۔ اور اپنی اپنی حکومتوں کے لیے کام کرتے تھے۔

سرداران سلطنتِ افغانیہ :۔ امیر شہید کے چھوٹے بھائی سردار نصر اللہ خاں کا لقب نائب السلطنت ہے۔ اور امیر شہید کے بڑے صاحب زادے سردار عنایت اللہ خاں کا لقب معین السلطنت تھا۔ اور منجھلے صاحب زادے سردار امان اللہ خاں کا لقب معین الدولہ تھا۔ امورِ سلطنت میں حسبِ مدارج شریک تھے۔ مثلاً صوبے کا حاکم نائب الحکومت (گورنر) امیر صاحب خود متعین فرماتے تھے۔ ان کے ماتحت ہر ضلع کا حاکم (کمشنر) سردار نائب السلطنت کے انتخاب سے مقرر ہوتا تھا۔ شرعی فیصلہ کے لئے قاضی (جج) سردار معین السلطنت کی طرف سے مقرر ہوتا تھا۔ عمومی فوجی بھرتی، جس کو ہشت نفری کہا جاتا ہے وہ بھی سردار معین الدولہ سے تعلق رکھتی تھی۔

(ان سرداروں کے علاوہ امیر عبد الرحمٰن کے زمانے سے ایک وزیر جو اس وقت معمر ہونے کی وجہ سے پنشن پاتے ہیں سردار اعتماد الدولہ عبد القدوس خاں ہیں۔ شاہی خاندان جس قبیلہ کی شاخ ہے اُسے محموزی کہتے ہیں۔ سردار اعتماد الدولہ عبد القدوس خاں باعتبار اپنی بزرگی کے تمام محموزی قبیلہ کے بزرگ ہیں۔ اس حیثیت سے امیر صاحب ان کا اعزاز اپنے بزرگوں کی طرح ملحوظ رکھتے تھے۔ مثلاً عید کے روز خود امیر صاحب ان کی خدمت میں جاتے تھے۔ ان کے لیے سلام خانہ کی حاضری معاف تھی۔ سردار اعتماد الدولہ کے دو بھتیجے یوسف خاں اور سردار محمد آصف خان مصاحب خاص کے لقب سے ملقب تھے۔ اور امیر شہید کی مجالس میں ہمیشہ حاضر رہتے تھے۔

سردار محمد یوسف خاں کے بڑے صاحب زادے سردار محمد نادر خاں سپہ سالار ہیں۔ اور سردار محمد نادر خاں کے دو بھائی سردار محمد ہاشم خاں اور سردار محمد ولی خاں اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں کے سر کے نگہبان ہیں۔ (یعنی باڈی گارڈ ہیں)۔ ان کو سر سروش کہا جاتا ہے)۔

مصاحبینِ خاص کی اولاد میں سے آٹھ دس نوجوان شائستہ باہمت کارکن ہیں۔ دوسرے درجہ کے تمام مصاحبین اکثر انھیں بھائیوں کے ہاتھ میں ہیں۔

لطیفہ:۔ ایک روز مجلس میں سردار اعتماد الدولہ عبدالقدوس خاں سے ایک شخص نے پوچھا کہ آپ کے بیٹے کتنے ہیں؟ فرمایا "یاد نہ دارم، شاید دوازدہ (دو درجن) یا زیادہ باشند"۔

امیر شہید کی حکومت اور ان کے اصلاحات کو کامیاب بنانے میں اس خاندان کا ممتاز حصہ ہے۔ اس کا کریڈٹ سردار محمد نادر خاں کو دینا چاہیئے۔ سردار محمد نادر خاں تمام ہندوستان کے محسن اور سرپرست ہیں۔ اور میں تو خاص طور پر ان کا ممنون ہوں۔

(سردار محمد نادر خاں اور ان کے تمام خاندان کے لوگ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مرید تھے۔ ایامِ نظربندی میں اکثر اوقات ان کی خدمت میں آتے جاتے تھے۔ چونکہ مولانا سندھی دیوبندی جماعت کے فرد تھے تو وہ مولانا کو اپنے مرشدوں کے برابر سمجھتے تھے۔ (باقی واقعات لکھ آئے ہیں)۔

اگرچہ ظاہر میں ان سے میرا بہت کم تعلق تھا لیکن میرے ہر مشکل معاملے میں مدد کرتے رہتے اور لطف یہ ہے کہ نہ کبھی اس کا اظہار کیا ۔۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ۔ جس طرح سردار محمود خاں طرزی ترکی معاشرت کے دل دادہ ہیں اسی طرح سردار محمد نادر خاں ہندوستانی معاشرت کے حامی اور پروانہ ہیں۔ اِن حضرات کے علاوہ شاہی خاندان اور محموزی قبیلہ میں بہت سے سردار ہیں۔ دوسرے افغانی قبائل اور ایرانی خاندانوں کے شرفاء اس قدر زیادہ ہیں کہ ہندوستان کے کسی بڑے سے بڑے شہر میں شرفار کی اتنی تعداد نہ ہو گی۔

باب اول۔ کابل کی اہمیت

۱۔ کابل میں ہمارا پہنچنا۔ ۲۔ سردار نائب السلطنت کے حضور میں باریابی۔

۳۔ امیر حبیب اللہ خاں کے حضور میں باریابی۔ ۴۔ ہندوستانی مشن سے ملاقات۔

اس میں شک و شبہہ کی گنجائش نہیں کہ ہندوستان کے آزادی پسند لوگوں کے لئے عموماً سب سے زیادہ موزوں مرکز دار السلطنتِ کابل ہے۔ اسے ہندوستان کے مختلف حکمران ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ دہلی کی سلطنت آخر میں ضعیف ہو گئی تھی۔ لیکن اس پر

ہاتھ ڈالنے کی ہمت انگریزوں کو اس وقت تک نہ ہوسکی جب تک انھوں نے پنجاب پر قبضہ کرکے دہلی اور کابل کا اتصال نہ توڑ دیا۔ اس سے پہلے مرہٹوں کا قبضہ توڑنے کے لیے دہلی کے ارکانِ دولت نے کابل اور قندھار سے مدد حاصل کی تھی جس میں نجیب الدولہ کا خاص ہاتھ تھا۔ سیاسی مطالعہ کرنے والوں کے علم میں ایک طرح کا اضافہ ہوگا جب انھیں یہ بتایا جائے کہ نواب نجیب الدولہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلی والے کے خاص معتقد تھے۔ اور ان کی سیاسی فلاسفی کو ایمان کا جزوِ اعظم سمجھتے تھے۔ دوسری دفعہ جب انگریزوں نے دہلی پر تسلط جمالیا تو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی کے وابستگان حضرت امیر شہید اور مولانا شہید کی رفاقت میں اسی حجاب کو اٹھانے میں مصروف رہے اور قندھار و کابل کے راستے پشاور پہنچ کر دو چار سال کوشش کرتے ہوئے شہید ہوگئے۔

ہمارا کابل پہنچنا:۔ ہم نے جس حالت میں ۱۳۲۷ھ سے ہند میں زندگی بسر کی اس سے حکومتِ ہند اچھی طرح واقف تھی۔ ہمارا نصب العین کسی سے مخفی نہ تھا۔ مگر ہمارا کام اتنا تیز نہیں رہا تھا جس سے حکومت ہمیں معطل کرنا ضروری سمجھتی۔ ہماری صحبت میں جو لوگ سی۔ آئی۔ ڈی کے مقرر ہوئے تھے ان سے ہمارا برتاؤ اچھا رہا۔ اس کا بھی ہماری آزادی میں کافی اثر پڑا۔ کابل جانے کا فیصلہ ہم نے اپنے استاد و مرشد حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہٗ کو راضی رکھنے کے لیے کیا تھا۔ ہم اپنی حیثیت سے واقف تھے۔ ہم نے بڑی بڑی امیدیں قائم کرکے کبھی مسرور ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ہم تصور نہیں کرسکتے تھے کہ کابل پہنچ کر ایک سال سے کم عرصہ میں ہم اپنا ما فی الضمیر کسی ذمہ دار افسر سے بیان کرسکیں گے۔ اگر خوش ہوئے تو اس پر کہ خدا نے ہمیں اپنے بزرگ کا حکم مان کر ملک چھوڑنے کی توفیق عطا فرمائی۔ حضرت مولانا کا ذکر ہم ہر ایک دوست سے نہیں کرسکتے تھے۔ اس لیے بعض دوستوں سے جو اس خیال کے مؤید تھے کبھی ان کا نام ذکر کردیتے تھے یا اپنا طبعی رجحان ایک مسلم حکومت میں جانے کا ذرا تفصیل سے سنا دیتے تھے۔ اسی طرح ہم اپنے خاص دوستوں سے رخصت ہوئے۔ ہماری طرح کے آدمیوں کو ہندوستان کے حکمران کس طرح بدنام کررہے تھے، اس سے ہم واقف تھے۔ پہلے سے چند ہندوستانی ایک سیاسی سازش کے الزام میں محبوس تھے۔ اس کا جو اثر

ہمارے اوپر پڑتا تھا اُسے ہم ہی جانتے تھے۔ ان حالات میں جس قدر احتیاط کرنی چاہیئے ہم نے اس کا پورا انتظام کر لیا تھا۔ قندھار تک تو ہم بلا پاسپورٹ حکومت کی نگرانی میں پہنچ گئے۔ اس وقت سردار محمد یوسف خاں قندھار کے نائب الحکومت تھے، جو سردار اعتماد الدولہ کے چھوٹے بھائی تھے۔

قندھار میں ہمیں دو شخص ایسے ملے جن کے تعلقات نائب الحکومت سے اچھے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب ہیں مل چکے تھے اور دوسرے صوفی جان محمد تھے جن سے ہمارا تعارف مولانا شیخ الہند نے دیوبند میں حبیب میں ناظم جمعیۃ الانصار تھا کرایا تھا۔ یہ بزرگ گورنر قندھار سردار محمد کے مرشد تھے۔ اس لیے نائب الحکومت سے ہماری اچھی ملاقاتیں ہوئیں۔ بعض علمی مسائل کا تذکرہ بھی ہوتا رہا جن کا تعلق مثنوی مولانا رومؒ سے تھا۔ اگرچہ مثنوی مولانا روم سے ہمارا اشتغال بہت کم رہتا ہے لیکن بفضلِ خدا اس امتحان میں ہم کامیاب رہے۔ (یہ مسئلے رُوح کے متعلق اور کچھ فقہ حنفی کے متعلق تھے) نائب الحکومت نے ہمیں خاص راہ داری دی اور اول درجے کے سفر کا انتظام کر دیا اور اپنے پرائیوٹ دوستوں کے نام تعارف کے خطوط بھی دیے۔

(اس کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ قندھار میں جتنے علماء تھے اکثر ملاقات کے لیے آتے رہے۔ عام اور خاص لوگ بھی ملاقات کرتے رہے۔ نیز الوداع کا جلوس ہم آگے ذکر کر چکے ہیں۔ پھر ہم لوگ قندھار سے رخصت ہو کر ایک دستہ فوج کے ساتھ کابل کو روانہ ہو گئے۔ غزنی سے ہم نے سردار محمود خاں طرزی کو اطلاع بھی دے دی تھی اس لیے ان کا ایک آدمی کابل میں شیخ محمد ابراہیم ایم۔ اے۔ کے مکان پر خوش آمدید کہنے کے لیے آیا تھا۔ اور وہ نوجوان سردار عبدالہادی خاں تھا)

ہمارا التعارف :۔ شیخ محمد ابراہیم کے قریب مسجد عُلیا حضرت کا ایک کمرہ کرایہ پر لے کر اتر پڑے اور میں خاص محمد ابراہیم ایم۔ اے۔ کا مہمان بن گیا۔ اور کھانے میں شریک ہو گیا اور ان کے توسط سے ان سب لوگوں سے ملاقات ہو گئی جن کے لیے ہمارے پاس خطوط تھے ان میں قابلِ ذکر سپہ سالار محمد نادر خاں اور سردار محمد خاں طرزی تھے۔ سردار سپہ سالار نے ہمیں ہر طرح امداد دینے کا یقین دلایا اور ہمارے کابل کے قیام میں جو مشکلات پیدا ہو سکتی

تھیں ان کے زائل کرنے پر اپنی تمام توجہ مبذول رکھی۔ احتیاط کا تقاضا یہ تھا کہ ہم بظاہر سپہ سالار سے اجنبی رہیں اور اس پر ہم نے عمل کیا۔ سردار سپہ سالار کے خاندان کا ہمارے مشائخ سے خاص رابطہ چلا آتا تھا۔ اس لیے ان کا ہر قول و فعل اخلاص و محبت پر مبنی تھا۔

(آگے ہم لکھ آئے ہیں کہ سپہ سالار کا سارا خاندان جب ہندوستان میں بند تھا، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا خاص معتقد تھا۔ ترکی کے شریک جنگ ہونے کا اثر سردار محمود خاں طرزی پر نسبتہً زیادہ تھا۔ سردار محمود خاں طرزی کو امیر عبدالرحمٰن خاں نے جلا وطن کر دیا تھا۔ یہ سردار شام میں دمشق جا کر رہے اور ترکی کے سرکاری مہمان رہے۔ وہاں شادی بھی کر لی۔ پھر امیر حبیب اللہ خاں نے اپنے زمانے میں پھر ان کو واپس بلا لیا اور سراج الاخبار کا ایڈیٹر بنایا۔ اور اپنا معتمد علیہ مقرر کیا۔ چونکہ سردار محمود خاں طرزی کا تعلق ترکی سلطنت سے تھا اس لیے ترکی جنگ کا اثر اُن پر بہت تھا۔ اس لیے ہمارا رابطہ سردار محمود خاں طرزی سے زیادہ ہوتا گیا۔ کیونکہ ہم نے بھی ترکی کی امداد کے لیے ہندوستان کو چھوڑا تھا۔ انھوں نے ہمیں سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت سے ملایا۔ ایک دن سردار معین السلطنت نے ہم کو کھانے کی دعوت دی اور ان کے ساتھ میں نے کھانا کھایا۔ افغانستان کے سرداروں میں کھانا کھانے کے وقت چھری کانٹا استعمال کیا جاتا ہے ہم اس سے ناواقف تھے اس لیے سردار معین السلطنت نے بھی مع اپنے ساتھیوں کے بغیر چھری کانٹے کے کھانا کھایا۔ پھر ہاتھ دھوتے کے وقت ان کو بڑی تکلیف ہوئی۔ بار بار سردار صاحب صابن سے اپنے ہاتھ دھوتے تھے۔ پھر بھی کہتے تھے چکنائی نہیں جاتی۔ اس سبب سے مولانا بہت شرمندہ ہوئے۔ مولانا فرماتے ہیں اس کھانے کے بعد ہم نے چھری کانٹا استعمال کرنے کی مشق میں پورا ایک دن صرف کیا۔ اور اپنی جماعت کو بھی چھری کانٹے کا استعمال سکھایا اور پھر بے تکلف دعوتوں میں شریک ہوتے رہے۔ اس دعوت کے سبب سے ہمارا ذکر سلطنت کے تمام سرداروں تک پہنچ گیا۔ اور ہم کو بڑی عزت سے دیکھنے لگے۔)

سلطنتِ افغانیہ میں شرعی فیصلوں کا ایک محکمہ ہے جسے "میزان التحقیقات الشرعیہ" کہتے ہیں۔ اس محکمہ کے رئیس سردار قاضی عبدالرزاق خاں ہمارے دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے۔ انھوں نے حدیث مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ سے پڑھی تھی وہ سردار نصراللہ خاں نائب السلطنت سے خاص طور پر وابستہ تھے۔ جیسے سردار محمود خاں طرزی

معین السلطنت، اور سردار نادر خاں سپہ سالار اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں سے وابستہ تھے۔

قاضی عبدالرزاق سے ہم چند روز بعد ملے۔ پرانے علمی دوستوں کی یاد تازہ ہوتی رہی۔ ایک عجیب بات وہاں ہمیں یہ نظر آئی کہ ہمارے متعلق خاص طور پر ان کے پاس اطلاعات موجود تھیں۔ انھیں جب اچھی طرح اطمینان ہو گیا کہ میرا ہی نام عبیداللہ سندھی ہے تو وہ بہت مسرور ہوئے۔

سردار نائب السلطنت کے حضور میں باریابی:- سردار قاضی حاجی عبدالرزاق خاں چاہتے تھے کہ ہمیں سردار نصراللہ خاں نائب السلطنت سے ملائیں۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کے غیر رسمی پولیٹکل معاملات سردار نائب السلطنت سے تعلق رکھتے ہیں۔ فقط رسمی معاملات اعلیٰ حضرت کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ مگر ہم نے وہاں کے حالات کے مطابق انھیں مشورہ دیا کہ ہماری ملاقات سردار معین السلطنت کے توسط سے ہونی چاہیئے۔ اس لیے انھوں نے یہ بات پسند کی اور ہم سے ایک عریضہ لکھوا لیا، جس میں ہم نے اپنے مقاصد کا بالاجمال ذکر کیا۔ اس کے ایک روز بعد مجھے سردار معین السلطنت اپنے ساتھ لے گئے اور سردار نائب السلطنت ہم دونوں سے تخلیہ میں ملے اور دو گھنٹہ تک مفصل حالات سنے۔ سوالات کے جواب سے مطمئن ہوئے۔ یہ ایک طرح کا ہمارا امتحان تھا، جس میں ہم بفضل خداوند تعالیٰ عزوجل اچھے کامیاب رہے اور ہم نے محسوس کیا کہ سردار نائب السلطنت ہماری گفتگو سے محظوظ ہوئے۔ ان کی خواہش تھی کہ اس مذاکرہ کا خلاصہ فارسی میں لکھ کر ہم ان کے سامنے پیش کریں۔

میں اسلامی تاریخ کا عموماً مطالعہ کرتا رہتا ہوں اور ہندوستانی تاریخ سلطان عالمگیر اور اس کے بعد کا دَور میرا خاص مضمون ہے۔ کیونکہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کی علمی و سیاسی تحریکیں یہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ لیکن یوروپین طریقہ پر سیاست کا مطالعہ مجھ کو زیادہ میسر نہیں ہوا۔ اُردو یا فارسی عربی میں اس نئے طرز کو سمجھنے کے لیے بہت کم کتابیں ملتی ہیں اس لیے ایک عرصہ سے سیاسیات سے واقف تعلیم یافتہ لوگوں کا اشتراک اپنے لیے ضروری سمجھتا ہوں۔ شیخ محمد ابراہیم ایم۔اے۔ نے تاریخ و اقتصادیات میں بمبئی یونیورسٹی سے ایم۔اے۔ کی ڈگری اعلیٰ درجہ کی حاصل کی ہے۔ کابل آنے سے پہلے ہی ہم نے سیاسی اشتراک

ان سے پیدا کیا تھا۔ اور وہ مجھ سے پہلے پہنچ کر حبیبیہ اسکول میں ملازم ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں فقط وہ میرے مشیر تھے۔ میں نے بڑی احتیاط سے دس پندرہ دن میں سات آٹھ صفحے لکھے اور شیخ محمد ابراہیم کو سنائے۔ انھوں نے بعض مفید اضافے کیے اور ہم نے وہ مضمون سردار طرزی اور معین السلطنت کی معرفت سردار نائب السلطنت کے پاس بھیج دیا۔ سردار نائب السلطنت ہمارے طرزِ تحریر سے سمجھ گئے کہ جب تک ہمارے معاملے کا فیصلہ خود اعلیٰ حضرت امیر صاحب نہ کریں گے ہم اسے قابلِ اطمینان نہیں سمجھتے۔ انھوں نے شاید ایک ماہ بعد ہمیں اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش کرنے کا انتظام کیا۔

(اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں کی ملاقات میں ایک ماہ کا وقفہ پڑ گیا۔ اس کا سبب وہی تھا جو ہم پیشتر لکھ آئے ہیں۔ یعنی مختار بادشاہوں کا یہ قاعدہ ہے کہ رسمی اور قانونی طور پر سلطنتوں کے قواعد کے موافق ملاقات کرتے ہیں۔ یعنی سرکاری کام کاج کے لیے یا عریضہ پیش کرنے کے لیے کوئی آجائے تو اس کی ملاقات نہیں کرتے۔ یا تو ارکینِ سلطنت کی وساطت سے ملاقات ہو سکتی ہے یا خود بادشاہ کسی کو طلب کرے۔ مولانا سندھیؒ صاحب چونکہ اجنبی ملک کے تھے اور ان کی سلطنت سے کوئی تعلق نہ تھا اس لیے سلطنت کے ارکین اس کا ذکر دربارِ شاہی میں نہیں کر سکتے تھے۔ مگر جب امیر صاحب نے مولانا کو دیکھا اور سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت سے پوچھا کہ یہ کون آدمی ہے؟ تب جا کر ان کو پتا بتانے کی جرأت ہوئی اس کا قصہ ہم آگے لکھ آئے ہیں۔ شاید سردار عنایت اللہ خاں نے یہ کہا ہوگا کہ جناب نائب السلطنت مولانا سندھیؒ کو جانتے ہیں۔ اس لیے سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت کے وسیلے سے ملاقات کا انتظام ہوا۔)

اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں کے حضور میں باریابی :۔ دسمبر ۱۹۱۵ء کے اول ہفتہ میں ایک دن سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت نے مجھے اپنے قصر زین العمارہ میں بلایا اور عصر کے بعد وہیں اعلیٰ حضرت تشریف لائے۔ کوئی آدمی نہ تھا صرف مجھے شرف باریابی حاصل ہوا۔ اس مجلس میں فقط دو کرسیاں اور ایک چھوٹی میز تھی۔ ایک پر اعلیٰ حضرت جلوہ فرما تھے اور دوسرے پر شفقت و محبت سے مجھے بیٹھنے کا حکم دیا۔ سردار

نائب السلطنت نے میرا عریضہ اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش کیا۔ آدھے گھنٹے تک اعلیٰ حضرت اسے غور سے ملاحظہ فرماتے رہے۔ آخر میں دعائیہ کلمات سے بہت متاثر ہوئے اور مختصر الفاظ میں پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔ اور کام کرنے کے لیے ایک زبانی حکم ارشاد فرمایا جس کی تعمیل میں اپنے امکان بھر آخر تک کرتا رہا۔

(اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ ہندوستانی کام کرتے رہو۔ اعلیٰ حضرت کو اتحادِ اسلام کے کام سے زیادہ مرغوب مشغلہ کام تھا۔ مولانا اتحادِ اسلام کے خیال سے ہندوستان سے نکلے تھے مگر اب اُن کا نظریہ حسب الحکم اعلیٰ حضرت بدل گیا اور وہ ہندوستان کی آزادی کے لیے کوشش کرتے رہے۔ اس ملاقات کے بعد جتنے علماء دیوبندی افغانستان میں تھے یا صوبہ سرحد میں تھے مولانا کے اردگرد جمع ہونے لگے۔ اور دیوبند کی پچاس سالہ خدمت ان کے آگے ہو گئی۔ مولانا سندھیؒ نے قندھار میں فرمایا تھا کہ ہم کو یہ شیطانی وسوسہ لاحق تھا کہ ہم اجنبی ملک میں جا کر کیا کریں گے؟ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ ہمارے اپنے آدمی اور ہمدرد جو مولانا شیخ الہند کے پروگرام کو چلانے والے ہیں افغانستان میں موجود ہیں اور دیوبندی پروگرام پر عمل کرنے اور جوش و جذبہ اور سمجھ بوجھ سے کام کرنے والے بھی موجود ہیں اس لیے اب ہم افغانستان میں اپنے آپ کو آزاد سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں اپنے آپ کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا محسوس کرتے اور خوف کے مارے کوئی بات زبان سے نہ نکال سکتے تھے نہ اپنا مطلب کسی ہمدرد پر ظاہر کر سکتے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنے شیخ کا حکم مان کر افغانستان کا ارادہ کیا اور مجھ کو آزادی نصیب ہوئی۔ اب اس ملک میں کام کرنے کا میدان وسیع نظر آرہا ہے۔ یہ وہی جملے ہیں جو مولانا نے قندھار سے رخصت ہوتے ہوئے فرمائے تھے)

مجھے یہاں بالصراحت اس اعتراف کی ضرورت ہے کہ اگر مولانا شیخ الہند مغفور کا صحیح مشورہ نہ ملتا تو میری بات اس قدر مؤثر نہ ہوتی اور میں اپنے آپ کو بہ حیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے دربار میں پیش نہ کر سکتا تھا۔ میں صرف ایک مسلمان کی حیثیت سے متعارف ہوتا۔ چند دنوں کے بعد مجھے اپنی ہندوستانی وطنیت بتلانے کی ضرورت پیش آتی اور میں اپنے مرتبے سے بہت چھوٹا سمجھا جاتا۔ اعلیٰ حضرت نے میری

عزت افزائی سے ہندوستان پر بھی احسان فرمایا۔ اس لیے نہیں کہ میں نے اپنے آپ کو ہندوستان کا فرضی نمائندہ بنالیا تھا بلکہ اس میں قابلِ عزت یہ بات سمجھی گئی کہ اس عریضہ میں جو کچھ لکھا گیا تھا اس میں مبالغہ سے قطعی پرہیز کیا گیا تھا۔ اعلیٰ حضرت کو جس قدر بذاتِ خود واقفیت تھی ہمارا بیان اس کے قریب قریب رہا۔

(اعلیٰ حضرت کو معلوم تھا کہ مولانا شیخ الہندؒ نے کالج پارٹی اور مولوی پارٹی کو متحد کرکے ہندو مسلمانوں کے ...... درمیان بھی اتفاق پیدا کر دیا تھا۔ ایک محکوم ملت میں ایک متوسط طبقہ کا آدمی اور پھر وہ بھی مذہبی عالموں میں صحیح صحیح معلومات کا حامل ہے اور نازک وقت بھی صداقت کا خیال رکھتا ہے۔ اعلیٰ حضرت اور ان کے سردار نائب السلطنت کے بھی واقعی ایک نادر مثال تھی۔ میں اسے اللہ تعالیٰ عزوجل کی ایک خاص رحمت سمجھتا ہوں جس میں حضرت مولانا شیخ الہند قدس سرہٗ کی دعا اور ان کے تعمیل حکم کی برکت کا بہت کچھ دخل ہے۔

حرب عمومی کے دوران مولانا کو کابل میں جا کر دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک تو افغانستان کے علماء اور بڑے آدمیوں سے اور صوبہ سرحد کے علماء اور لیڈروں سے اعلیٰ حضرت امیر صاحب اپنے لیے بیعت کا معاہدہ لے رہے تھے کہ جب تک میں جنگ شروع نہ کروں تم لوگ اپنی جنگی تیاری میں مصروف رہو۔ کیونکہ بادشاہ کے اذن کے سوا جنگ منع ہے۔ اس لیے بیعت نامے لیے جا رہے تھے۔ اور ان کو تسلی دی گئی تھی کہ بادشاہ افغانستان ضرور انگریزوں سے جنگ شروع کر دیں گے۔

اس تحریک کا اثر جتنا ہم کو معلوم ہے سندھ پر بھی پڑا تھا۔ حضرت ابوالسراج خواجہ غلام محمد صاحب دین پوری ساکن خان پور، ریاست بہاول پور، اور مولانا حضرت سید تاج محمد صاحب امروٹیؒ سے بھی بیعت نامے لکھوائے گئے تھے۔ لیکن ایک مدت کے بعد یہ راز کھلا کہ انگریزوں کو اس حرب عمومی میں امیر صاحب نے اس بات کا یقین دلایا تھا کہ میں ہمیشہ غیر جانب دار رہوں گا۔ اور یہ بیعت نامے اسی لیے تھے کہ نہ امیر صاحب اس جنگ میں شریک ہوں گے نہ صوبہ سرحد اور پنجاب میں کوئی گڑبڑ ہوگی۔ اس کے عوض گورنمنٹ انڈیا اعلیٰ حضرت امیر صاحب کو بہت روپیہ دیتی رہی اور وظیفہ میں کافی اضافہ کر دیا تھا اور ان کو یقین دلایا تھا کہ ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے عنایت اللہ خاں کو ولی عہد تسلیم کیا جائے گا۔ مولانا سندھی ایک مدت تک اس بات سے

لاعلم رہے۔ لیکن آخر یہ راز کھل گیا۔

اور دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جو ہندوستانی مشن جرمنی سے کابل آیا تھا اس کو اعلیٰ حضرت امیر صاحب نے یہ جواب دیا کہ جب تک جرمنوں اور ترکوں سے ہم کو ایک لاکھ لشکر کی امداد نہ ملے گی اس وقت تک ہم جنگ سے غیر جانبدار رہیں گے۔ اس پر بھی ایک مدت تک اعتماد تھا اور اسی بنا پر ریشمی خطوط بھیجے گئے تھے۔

اگرچہ اس کی حقیقت سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت کو معلوم تھی مگر انھوں نے مولانا سندھی سے کبھی اس کا انکشاف نہیں کیا۔ اُن کو اس لیے خوف لاحق تھا کہ یہ مشن انھیں کی طرف بھیجا گیا تھا۔ مولانا سندھی کی تحریک یہ تھی کہ ماورائے دریائے سندھ آزاد کرالیا جائے! اور اسی تحریک کو عملی شکل میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی اس کوشش کے آثار نائب السلطنت کو محسوس ہونے لگے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر یہ کامیاب ہو جائیں تو میں ماورائے دریائے سندھ کے علاقہ کا حکمران ہو جاؤں گا۔ اور مولانا نے بھی تسلی دی تھی کہ ایسا ہی ہوگا۔ اس لیے سردار نائب السلطنت ہر طرح مولانا کو امداد دینے لگے۔ کیونکہ ان کو یقین تھا کہ اعلیٰ حضرت کے بعد انگریز کوشش کر کے عنایت اللہ خاں کو تختِ سلطنت پر بٹھا دے گا۔ (اِسے ذہن نشین رکھنا چاہیئے)۔

(اس جگہ ڈائری چھاپنے والے صاحب لکھتے ہیں کہ ہم نے جو ترتیب ڈائری میں لکھی تھی اس کو بدل دیا ہے اور رولٹ ایکٹ کے نوٹوں پر اس کو مرتب کیا ہے۔ اس لیے ناچار ہم وہی ترتیب قائم رکھتے ہیں۔)

ہندوستانی مشن سے ملاقات: حربِ عمومی شروع ہونے پر جس قدر ہندوستانی آزاد پسند نوجوان یورپ میں موجود تھے وہ سب برلن میں جمع ہو گئے اور انھوں نے جرمن دفترِ خارجہ کے ماتحت ایک انڈین نیشنل پارٹی قائم کی جس میں ہردیال اور مولوی برکت اللہ صاحب وغیرہ بھی شامل تھے۔ اس انڈین نیشنل پارٹی کے زیرِ اہتمام راجہ مہندر پرتاب اور اس کے رفقا کو جن میں مولوی برکت اللہ شامل تھے ترکی اور جرمنی افسروں کے ساتھ ایک خاص مشن پر کابل بھیجا گیا۔ یہ مشن ہم سے ایک ہفتہ پہلے کابل پہنچ چکا تھا اور اس کی رسمی ملاقاتیں ختم ہو چکی تھیں۔

جب ہم اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش ہوئے اور اُنھیں معلوم ہوا کہ میرے اور اس مشن کے نقطۂ نظر میں کسی قدر اختلاف ہے تو ہم کو مشن کے ہندوستانی ممبروں سے ملنے کی اجازت مل گئی۔ اس طرح اُن سے اور مشن کے جرمن ممبروں سے ملاقاتیں ہوئیں اور ہم اپنا نقطۂ نظر منوانے کے لیے طویل زمانے تک ان سے تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔

(مولانا سندھیؒ نے نائب السلطنت سے ملاقات کرنے کے بعد کالج کے اُن طالب علموں کو جو لاہور سے بھاگ کر وہاں پہنچے تھے اور فوجی کیمپ میں نظر بند تھے، آزاد کرا کے اپنے مکان میں ان کے رہنے کا انتظام کیا اور ان میں تنظیم قائم کی)۔

(اس زمانے میں ہمارے ترجمان مہاجرین میں سے ایک ہندوستانی نوجوان عبدالباری تھے جنھیں ان لوگوں نے اپنا پریسیڈنٹ منتخب کیا تھا۔ وہ لاہور گورنمنٹ کالج میں ایم۔ اے۔ کے طالب علم تھے اور کالج چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ شیخ محمد ابراہیم حبیبیہ اسکول میں ملازم تھے اس لیے اُس کو سیاسی مجالس میں شامل ہونے کے مواقع بہت کم ملتے تھے۔ ہماری ملاقات سے پہلے مشن کے ہندوستانی اور جرمنی ممبروں میں اختلاف پیدا ہو چکا تھا۔ ہمارے ہندوستانی دوستوں کے نظریات یوروپین سائیکالوجی کے لیے نہایت دلفریب تھے۔ ترک اور جرمن جب تک برلن اور استنبول میں رہے اپنے ان نظریات کی بہت قدر کرتے رہے۔ لیکن کابل میں تو عملی کارروائی کے لیے آئے تھے۔ اس مشن کی پریسیڈنٹ راجا مہندر پرتاب یا مولانا برکت اللہ کوئی زیادہ رہنمائی نہیں کر سکتے تھے۔ ان کو عمر بھر افغانستان، صوبہ سرحد، پنجاب، سندھ اور بلوچستان کا نقشہ دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ مشن کے ممبر شروع میں ہم سے اخلاص سے نہیں ملے۔ مگر بتدریج ان کا خیال ہمارے متعلق اچھا ہوتا گیا۔ ہماری ساری عمر شمال مغربی ہند میں گزری اور اسی اُدھیڑ بن میں ہر چھوٹے بڑے سے ملتے رہے ہمارے پاس بعض ایسی معلومات بھی تھیں جو کابل میں فوجی نقطۂ نظر سے بہت قیمتی سمجھی جاتی تھیں۔ اس طرح ہماری رائے غالب ہونے لگی۔ اس اختلافِ خیالات سے قطع نظر ہم نے ہندوستانی ممبروں کے احترام و اعزاز میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ اس لیے روز بروز ایک دوسرے سے قریب تر ہوتے گئے۔

(مشن کے پریسیڈنٹ راجا مہندر پرتاب وغیرہ نے جرمنی ممبروں کو سمجھایا تھا کہ افغانستان بڑی طاقت رکھتا ہے۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ہمارے لوگ موجود ہیں۔ افغانستان کے تحریکِ جنگ میں شامل ہوتے ہی وہ سخت بلوہ کر دیں گے اور سلطنتِ ہندوستان عاجز آجائے گی۔ انھوں نے زیادہ تر یہی خیال کیا تھا کہ صوبہ سرحد ہر طرح طاقت ور ہے۔ اگر ہم افغانستان سے نکل کر صوبہ سرحد میں گئے تو سارا صوبہ سرحد جنگ کے لیے تیار ہو جائے گا۔ یہ جنگ شمال مغربی ہند میں ہوگی۔ انھیں پریسیڈنٹ وغیرہ کی کوشش سے جرمنوں نے ایک دو جہاز بارود اور سامان جنگ سے بھرے ہوئے بنگال کے انقلابی لوگوں کو دیے تھے بنگالیوں نے وہ بارود و سامان کسی جگہ زیر زمین دفن کر دیا تھا۔ وہ اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ جس سے سارے ہندوستان میں بغاوت ہو سکتی تھی۔ اور ہندوستانی مشن کے پریسیڈنٹ وغیرہ نے اُن کو یقین دلایا تھا کہ انقلابی لوگ فقط بنگال میں ہیں۔ یہ سب جنگ شروع ہونے سے ایک دو ماہ قبل کے حالات ہیں۔ جب عمومی جنگ چھڑ گئی اور اس کو ایک سال گزر گیا تو جرمنوں نے اس ہندوستانی مشن پر اعتراض کیے کہ بنگالی لوگوں نے تو اب تک کچھ بھی نہیں کیا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جب تک صوبہ سرحد سے بغاوت نہیں کریں گے تب تک بنگال میں بغاوت نہیں ہوگی۔ اور صوبہ سرحد میں ہمارے پہنچتے ہی وہ لوگ بغاوت کر دیں گے کیونکہ ان کے پاس بہت سا ذخیرہ بارود و سامان کا افغانستان سے ملتا رہتا ہے۔ اور افغانستان میں بڑی بڑی مشینیں امیر عبدالرحمٰن کے زمانے سے کام کر رہی ہیں۔ اور پھر ان کو یقین دلایا کہ ہمارے انقلابی نوجوان کابل میں بہت موجود ہیں اور سرکاری لشکر میں ان کا عنصر غالب ہے۔ اس لیے فقط جرمنوں اور ترکوں کے وہاں جاتے ہی افغانستان اور صوبہ سرحد کا لشکر جنگ پر تیار ہو جائے گا)

(مولانا سندھی نے جرمن اور ترک ممبروں کو پوری طرح ذہن نشین کرایا کہ صوبہ سرحد میں کچھ بھی طاقت موجود نہیں ہے۔ یہاں ایک رائفل ایک ہزار روپے میں ملتی اور کارتوس ایک روپیہ میں ملتا ہے۔ پھر صوبہ سرحد افلاس کا گھر ہے۔ میں نے صوبہ سرحد کا گھر گھر دیکھا ہے اور چھوٹے بڑے سے ملاقات کی ہے۔ ان میں جنگی جوش بہت ہے مگر جنگی سامان

ان کے پاس نہیں ہے۔ اگر وہ لوگ انگریزوں سے کچھ گڑبڑ مچاتے ہیں تو وہ محض ان کے فائدے کے لیے ہوتی ہے۔ جب گورنمنٹ ان کو مطلوبہ فائدہ دے دیتی ہے تو وہ خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ افغانستان میں کوئی کارخانہ جنگی سامان تیار کرنے کا موجود نہیں آپ کو چاہیے تھا کہ پہلے آپ بلوچستان کے راستے سے ان میں جنگی سامان اور اسلحہ تقسیم کرتے اور بلوچستان میں سمندر کے قریب ایک علاقہ ہے جس کا نام وَڈھ ہے اگر وہاں بہت سا جنگی سامان اتار دیتے تو بلوچستان بغاوت کے لیے تیار ہو جاتا۔ اور اس کا اثر صوبہ سرحد تک پہنچتا۔

جرمن چانسلر نے یہ بات سن کر نقشہ منگوایا اور نقشہ سے معلوم کیا کہ واقعی وڈھ کا علاقہ جنگی مرکز کے لیے اچھا مقام ہے۔ اور جنگی مقاصد کے لیے بہت موزوں ہے۔ نیز مولانا سندھی نے یہ بھی سمجھایا کہ بنگالی ہندو ہوں خواہ دوسرے لوگ ہوں وہ جنگی لوگ نہیں ہیں۔ یہ خفیہ طور سے کہیں بم گرا دیتے ہیں۔ ان کی عادت جنگی نظام سے لڑنے کی نہیں ہے۔ جرمن چانسلر نے حیران ہو کر کہا کہ پہلے ہی ہم نے ہندوستانی مشن سے کہا تھا کہ پہلے صوبہ سرحد کی طاقت اور حالات کا اندازہ کرنا چاہیئے پھر مشن بھیجنا چاہیے۔ مگر جرمن سلطنت نے یہ غلطی اور کی کہ ایک بڑا ذخیرہ جنگی سامان اور اسلحہ کا بنگال بھیج دیا۔ اور آپ کا یہ کہنا سچ ہے کہ ان میں تنظیم کے ساتھ لڑنے کی روح بھی نہیں ہے۔ اور آپ نے یہ جو فرمایا کہ جنگی مقام وڈھ ہے یہ بھی بالکل ٹھیک ہے۔ اور انھوں نے ہم کو یہ بڑا دھوکا دیا ہے کہ مسلمان قوم ہندوستان میں مینارٹی میں ہے اور ہندو قوم میجارٹی میں ہے اور یہ بھی کہا کہ مسلمان قوم میں کچھ بھی جنگی طاقت نہیں ہے۔ اب نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جنگی مراکز پر مسلمانوں کی میجارٹی ہے یہ پہاڑی قوم ہی ہے جن میں جنگی اسپرٹ موجود ہے۔ اور مشرقی بنگال جو جنگی مرکز ہو سکتا ہے وہاں بھی مسلمان قابض و غالب ہیں۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ ہماری حکومت نے ایک بار غلطی کی ہے، آئندہ نہیں کرے گی۔

اسی طرح کا معاملہ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ جب میں قسطنطنیہ میں گیا تو وہاں پیش آیا۔ میں انقرہ میں اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا سے ملنے گیا۔ ظہر کے بعد ملاقات ہوئی۔ اور مجھ سے

نہایت شفقت سے باتیں کیں۔ جب میں باہر نکلا تو وزیر اعظم عصمت پاشا نے کہا کہ ہندوستانی مسلمان کتنے سچے ہیں۔ انھوں نے عظیم الشان کام انجام دیے ہیں۔ انھوں نے کابل میں آکر جو کوششیں کیں اسی کے نتیجے میں ہماری سلطنت ترکی آزاد ہوئی ہے۔ مگر مجھ کو سخت افسوس ہے کہ ہندوستانی مسلمان مینارٹی میں ہیں۔ عصمت پاشا نے کہا کہ مولوی عبیداللہ سندھی جو ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندہ ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم میجارٹی میں ہیں۔ جن علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہے وہ جنگی مرکز بھی ہیں اور وہاں مسلمان میجارٹی میں ہیں۔ عصر کے وقت اتاترک نے نقشہ منگایا اور ساری رات نقشہ دیکھتے رہے۔ صبح کے آٹھ بج گئے۔ انھوں نے اس درمیان میں فقط چائے اور بسکٹ پر اکتفا کی تھی۔ آٹھ بجے حکم دیا کہ نقشہ لے جاؤ اور سو گئے۔ سارا دن سوتے رہے اور ساری رات سوتے رہے۔ دوسری صبح جب عصمت پاشا ان سے ملے تو وہ بہت خوش تھے۔ فرمانے لگے۔ کتنا خراب پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان مینارٹی ہیں۔ حالانکہ ہندوستان کے مسلمان میجارٹی میں ہیں۔ آیندہ ہندوستان کی حکومت مسلمانوں ہی کی قسمت میں لکھی گئی ہے۔ میری موجودگی میں تو اتاترک نے کچھ بھی نہ کہا تھا۔ فقط خیر و عافیت دریافت کی اور مختصر احوال سنے مگر میرے باہر نکلنے کے بعد یہی قصہ ہوا اور دس بارہ دن کے بعد عبدالرشید ابراہیم ترک سیاح اور عصمت پاشا مجھ کو ملے اور یہ سب باتیں بتائیں۔

یہ جو مصطفےٰ کمال پاشا نے کہا تھا کہ "ہندوستانی مسلمان کتنے سچے اور پکے مسلمان ہیں۔ انھوں نے عظیم الشان کام کیے۔ کابل میں آکر انھوں نے جو کوشش کی اس سے ہماری سلطنت ترکی آزاد ہوئی۔ ورنہ ہم آج حکم برداری کے ماتحت ہوتے۔"

اس کا قصہ اس طرح ہے کہ جب امیر امان اللہ خاں کے زمانے میں افغانستان اور انگریزوں میں جنگ ہوئی تو کوہاٹ اور بنوں کے صدر مقام ٹھل پر افغانی فوج کامیاب ہوئی اور جلال آباد پر انگریزی فوج۔ اور قندھار کے محاذ پر دونوں برابر رہے۔ ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ ہم پر پہلے حملہ ہوا ہے۔ آخر دونوں میں اس بات پر اتفاق ہوا کہ صلح کریں۔ صلح کا یہ افغانی وفد سردار محمود خاں طرزی کی سرکردگی میں دہلی پہنچا۔ اس زمانے میں خلافت

کمیٹی اور کانگرس آپس میں متحد ہو گئے تھے اور مسلمانوں کو بڑی پریشانی تھی کہ تحتِ خلافت پر اتحادیوں کا قبضہ تھا۔ اور کانگرس میں شور تھا کہ رولٹ ایکٹ اگرچہ مسلمانوں کے نام پر بنا ہے مگر عام ہندوستانیوں اور انقلابیوں کے لیے بڑا سخت ہے۔ اسی شورش کے ایام میں گاندھی نمودار ہوا اور اسی شورش کے زمانے میں جنگ افغان واقع ہوئی۔ سردار محمود خاں طرزی جب صلح کا وفد لے کر دہلی روانہ ہوئے تو انھوں نے مولانا سندھی سے کہا کہ اگر کوئی سخت پیچیدہ مقابلہ ہوا اور صلاح لینے کی ضرورت پیش آئی تو کون سا آدمی ہے جس سے مشورت کی جائے۔ مولانا نے فرمایا مولانا محمد علی ہیں۔ انھوں نے ان کے نام سفارشی خط لکھنے کی درخواست کی تو مولانا نے ان کو ایک سفارشی خط بھی لکھ کر دیا۔ انھیں ایام میں لوزان کانفرنس بھی ہو رہی تھی کہ ترکوں سے کیا معاملہ کیا جائے۔

صلح کا وفد بھیج دینے کے بعد اعلیٰحضرت امان اللہ خاں نے مولانا سندھی کو فرمایا کہ انگریز ہم کو صلح کی شرائط میں دبالیں گے اور ہمیں غلامی کی زنجیر میں جکڑ دیا جائے گا آپ کوئی بہتر تجویز عمل میں لائیے۔ اس وقت روس کی کمیونسٹ حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اشتراکی حکومت نے اپنے کمیونسٹ پروپیگنڈے کا مرکز تاشقند قرار دیا تھا اور اس کے لیڈر منایندرا ناتھ رائے مقرر ہوئے تھے۔ ان کی وصیت سے ہم نے لینن کے بڑے وزیر ٹرسٹکی کو لکھا کہ اگر گورمنٹ ہند افغانستان کو آزادی نہ دے اور دوسری بار ہم کو جنگ کرنی پڑے تو کیا تم ہمیں مدد دے سکتے ہو؟ ٹرسٹکی نے بڑی خوشی سے قبول کیا۔ ایک لاکھ لشکر دینے کا وعدہ کیا۔ اگرچہ یہ معاہدہ خفیہ تھا مگر اس کی ہوا کچھ نہ کچھ انگریزوں کو لگ گئی۔ یہ معاہدہ سرکاری طور سے پختہ ہو گیا۔ اس کام کو سرانجام دینے والے وہی ہندوستانی نوجوان تھے جو لاہور سے کالج چھوڑ کر کابل آئے تھے اور میں نے انھیں آزاد کر کے اپنی صحبت میں رکھا تھا۔ اس وقت انھوں نے بڑے عظیم الشان کام کیے جن میں سے ایک یہ بھی تھا۔

صلح کا افغانی وفد وائسرائے ہند کے پاس گیا تھا۔ اس زمانے میں ڈاک کے خطوط کی آمد و رفت ہندوستان میں بند تھی۔ فقط انگریزی کونسل مقیم کابل کی ڈاک آتی جاتی تھی

اور لوزان[ل] کانفرنس بھی اس زمانے میں منعقد ہو رہی تھی۔ ایک رات مولانا فرماتے ہیں کہ نصف شب کو اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کا آدمی آیا اور مجھ کو جگا کر کہا کہ آپ کو اعلیٰ حضرت نے طلب کیا ہے۔ میں جب ان کے حضور میں گیا تو وہ اکیلے بیٹھے تھے۔ فقط ایک آدمی ان کے ساتھ تھا۔ مجھ کو بڑی مہربانی سے بٹھایا اور فرمایا کہ ابھی میرے پاس تار آیا ہے کہ لوزان کانفرنس میں یوروپین حکومتیں عموماً اور انگریزی حکومت خصوصاً اس بات پر فیصلہ کرنے والی ہیں کہ ترکی حکومت کو حکم برداری کے ماتحت رکھا جائے، جیسے شام اور بغداد کو رکھا گیا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ مولانا اب کیا کرنا چاہیے؟ اور کہا کہ اگر ترک حکم برداری کے ماتحت رکھے گئے تو ہم کو بھی حکم برداری کے ماتحت رکھیں گے۔ اب تجویز سوچیے کہ کیا کرنا چاہیے؟ مولانا نے فرمایا کہ میرے دل میں یہ تجویز آئی ہے کہ آپ تین خط لکھیں۔ ایک جاپان کے بادشاہ کی طرف، دوسرا پریسیڈنٹ فرانس کی طرف اور تیسرا حاکم اعلیٰ اٹالین کی طرف، اور اس میں لکھیں کہ اگر ترکوں کو جو ایک زندہ قوم ہے، حکم برداری کے نیچے رکھا گیا تو اس سے بڑی شورش پیدا ہو جائے گی اور اس کے ذمہ دار تم ہی قرار دیے جاؤ گے۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے تین خط اپنے قلم سے لکھے، لفافے میں بند کر کے اس پر اپنا نام لکھا اور کونسل مقیم کابل کو دیا۔ اس نے یہ خطوط وائسرائے ہند کو بھیج دیے۔ وائسرائے ہند نے ان کو کھول کر پڑھا اور اس کا مضمون وائرلیس کے ذریعہ وزیر اعظم انگلستان کو بھیج دیا۔ اور ہوائی جہاز کے ذریعہ وہ خطوط وزیر اعظم انگلستان کو روانہ کیا۔ جب وزیر اعظم انگلستان نے ان خطوط کا مضمون پڑھا تو ہوائی جہاز کے ذریعہ فوراً لوزان پہنچا اور یوروپین سلطنتوں کو سمجھایا کہ ترکی کو آزاد کر دو۔ اس طرح ترکی کو اس شرط پر آزادی ملی کہ تم یوروپین سلطنت کا کوئی قانون لے کر اپنی حکومت چلاؤ۔ ترکی نے قبول کیا اور سوئزرلینڈ کا قانون جاری کرنے کا وعدہ کیا۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف مصطفےٰ کمال پاشا اتاترک نے اشارہ کیا تھا۔

لطیفہ:۔ عبد اللہ یوسف علی خاں، جس نے قرآنِ کریم کا انگریزی ترجمہ

ل Lausanne سوئزرلینڈ 1923

کر کے شایع کیا تھا ۱۳۵۳ھ میں حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ آیا۔ یہ عبداللہ یوسف علی خاں لوزان کانفرنس میں وزیر اعظم انگلستان کا پرائیوٹ سکریٹری تھا۔ مکہ مکرمہ میں احسان اللہ خاں بہادر نائب کونسل جدہ کے مقام پر اترا تھا۔ مولانا کا مکان جس میں وہ رہتے تھے اس مکان کے بالکل قریب تھا۔ اس نے مولانا عبیداللہ سندھی سے قرآن کی بعض آیتوں کا مطلب پوچھنے کا ارادہ کیا احسان اللہ خاں بہادر نے مولانا کو اپنے مکان پر بلایا۔ عبداللہ یوسف علی خاں نے مولانا عبیداللہ سندھی سے قرآن کریم کی ایک آیت کا مطلب دریافت کیا۔ انھوں نے فرمایا۔ "یار اس بات کو چھوڑ دو، پیچھے بیان کریں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ انگلستان کا وزیر اعظم کیوں اتنی عجلت کے ساتھ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر لوزان کانفرنس میں پہنچا تھا۔" اس نے ہنس کر کہا۔ "جناب یہ سب آپ ہی کی کارروائی تھی۔" اس کے بعد مولانا نے آیت کے مطلب بیان کیے، تو وہ کہنے لگا۔ واقعی آپ بڑے عالم ہیں۔ آپ نے مسلمانوں کی ایک بڑی سلطنت کو آزاد کرایا۔ جزاک اللہ!

(جب مولانا اس سے ملاقات کر کے واپس آئے تو اس نے احسان اللہ خاں بہادر سے کہا کہ مولانا بڑے عالم ہیں ایسے لوگ دنیا میں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ واہ وا! بڑے عالم ہیں، بڑے عالم ہیں۔ وہ بار بار مولانا کی قابلیت کا اعتراف کرتا رہا۔ پھر ایک دو بار حرم مکہ میں بھی بڑے احترام کے ساتھ مولانا سے ملاقات کی۔ (یہ بات پاکستان کے نوجوانوں کے لیے خصوصاً اور بھارت کے نوجوانوں کے لیے عموماً یاد رکھنے کے قابل ہے)۔

ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ مولانا سندھی کو یقین تھا کہ سردار محمود خاں طرزی نے خیانت کر کے وہ خطوط وائسرائے ہند کو دیدیے تھے۔ اس وقت رولٹ ایکٹ منظور ہو چکا تھا جس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر کوئی شخص بیرونی انقلابیوں سے کوئی تعلق رکھے گا، تو اس کی غیر حاضری میں اس پر مقدمہ چلا کر باقاعدہ سزا دی جائے گی۔ اسی رولٹ ایکٹ کے ماتحت مولانا محمد علی جوہر پر ان کی غیر حاضری میں بمبئی میں مقدمہ چلا کر چار سال قید کی سزا دی گئی تھی۔ مگر چونکہ اس وقت رولٹ ایکٹ کے برخلاف سارے ہندوستان میں

شورش تھی اور وائسرائے نے گاندھی جی سے وعدہ کیا تھا کہ رولٹ ایکٹ کو بالفعل معطل کرتے ہیں، اس لیے مولانا محمد علی کو گرفتار نہ کیا گیا تھا۔ مگر تدبیریں سوچ رہے تھے کہ کسی طرح ان کو گرفتار کرکے چار سال کی سزا دی جائے۔ جب مولانا محمد علی نے کراچی کانفرنس میں تقریریں کیں تو ان تقریروں کو آڑ بنا کر ان کو اور ان کے ساتھیوں کو گرفتار کرکے چار چار سال قید کی سزا دے دی۔ کراچی کا مقدمہ فقط رسمی تھا۔ اگر اس کی اپیل ہوتی تو وہ ضرور آزاد ہو جاتے۔ مگر اس وقت کانگرس اور خلافت کا دستورِ عمل نان کواپریشن تھا۔ اس لیے اپیل نہیں کی گئی۔ اور انگریزوں کو بھی معلوم تھا کہ یہ اپیل نہ کریں گے۔

مولانا سندھی نے اپنا سیاسی پروگرام قسطنطنیہ میں شائع کیا تھا۔ اس میں یہ لکھا تھا کہ مولانا محمد علی کو رولٹ ایکٹ ہی کے ماتحت چار سال کی سزا دی گئی تھی نہ کہ کراچی کے مقدمہ میں۔ یہ سیاسی پروگرام سارے یورپ میں شایع ہوا تھا۔ کسی اخبار نے اس کی تردید نہ کی تھی۔ مولانا فرماتے تھے کہ اگر میری یہ بات غلط ہوتی تو کوئی نہ کوئی اخبار ضرور اس کی تردید کرتا۔ خصوصاً انگلینڈ کے اخبار۔

کمیونزم سلطنتِ روسیہ سے امداد کے وعدے کی پہلی دلیل یہی تھی کہ وزیراعظم انگلستان اسے خطوط سے واقف ہوتے ہی فوراً لوزان کانفرنس میں پہنچا اور ترکی سلطنت کو حکم برداری آزاد کیا۔ دوسری دلیل یہ کہ جب افغانستان کا پہلا جشنِ آزادی منعقد ہوا تو ایک مشہور انگریز جنگی افسر نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "یہ سلطنتِ برطانیہ کی مہربانی ہے کہ افغانستان کو آزاد کر دیا۔" اور یہ بھی کہا کہ "یہ افغانستان کی کامیابی نہیں بلکہ مولانا عبیداللہ سندھی کی فتح ہے۔" اس کے جواب میں اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں نے فرمایا کہ "اگر گورنمنٹ ہند افغانستان کی آزادی تسلیم نہ کرتی تو کمیونسٹ فوج دہلی تک پہنچ جاتی۔" تیسری دلیل یہ کہ صلح کی گفتگو کے زمانے میں گاندھی جی نے کانگرس کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اگر اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں بادشاہِ افغانستان کی کوشش سے ہندوستان آزاد ہوا تو ہم ان کو ہندوستان کا ثانوی بادشاہ تسلیم کرلیں گے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ معاہدہ روس سے ہوا تھا اس کا ذکر آگے بھی آئے گا۔ اور اشارۃً مولانا کی ڈائری میں بھی ہے۔

جس انگریز افسر نے یہ کہا تھا کہ یہ کامیابی افغانستان کی نہیں بلکہ مولانا عبید اللہ سندھی کی ہے، اس لیے کہا تھا کہ معاہدۂ صلح میں یہ دفعہ داخل کردی گئی تھی کہ سات سال کے بعد ہندوستان کو ڈومینین اسٹیٹ میں تبدیل کردیا جائے گا۔ یہ مشہور جنگی افسر اسی دفعہ کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

جنگِ افغانستان شروع ہونے سے پہلے مولانا سندھی نے گاندھی جی سے خط و کتابت کے ذریعہ پوچھ لیا تھا کہ ہم انگریزوں سے جنگ کرکے شمال مغربی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ اگر ہم جنگ چھیڑ دیں تو کیا آپ ہم کو مدد دے سکتے ہیں اور ہندوستان میں بغاوت کردیں گے؟ تو گاندھی جی نے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خط روانہ کیا کہ اگر افغانستان ہندوستان کی آزادی کے لیے حملہ کرے گا تو ہم لوگ پوری طاقت سے ہندوستان میں بغاوت کردیں گے۔ اس جواب کے ...... ملنے کے بعد افغانستان نے ہندوستان پر حملہ کیا تو گاندھی جی پیچھے ہٹ گئے۔ اور اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔ اس کی یہ وجہ بتائی گئی کہ مالوی جی نے گاندھی جی کو روک دیا تھا۔ اس لیے مولانا سندھیؒ گاندھی جی سے ناراض ہو گئے، اور جب آپ ہندوستان تشریف لائے تو کبھی گاندھی جی سے ملنے کا ارادہ نہیں کیا۔ کئی دوستوں نے مولانا سندھیؒ پر زور دیا کہ آپ گاندھی جی سے ملاقات کریں۔ مگر مولانا نے فرمایا کہ گاندھی جی نے وعدہ خلافی کی ہے اس لیے میرا جی نہیں چاہتا کہ میں ملاقات کروں۔

بابِ دوم[1]

(۱) ہمارے ضروری مسئلہ کے محرکات۔
(۲) تمہیدی مقدمات کی تکمیل۔
(۳) ہندو مسلم اتحاد۔
(۴) ہندو کی ایک غلط فہمی۔
(۵) کانگرس کے ایک لیڈر کی رائے۔
(۶) راجہ مہندر پرتاب۔
(۷) راجہ صاحب کا حملہ۔
(۸) استنبول میں لالہ لاجپت رائے کی ملاقات۔
(۹) جرمن ممبروں کی شکایت۔
(۱۰) ہندوستانی مشن کا مقصد۔

راجہ صاحب سے تبادلۂ خیالات کرنے پر ہمیں ایک ناگوار حقیقت کا علم ہوا۔ ہم

---

[1] اصل ڈائری کا مسودہ موجود نہیں۔ مجبوراً شائع شدہ ڈائری کی ترتیب کے مطابق یہ شرح لکھی جا رہی ہے۔

ہندوستان میں بھی اس سے کسی قدر واقف ہو چکے تھے، مگر اس کی اہمیت کا صحیح احساس نہیں ہوا تھا۔ اب ہمیں اس کے اثر اور وسعت کا حقیقی علم ہوا۔ اس مسئلہ میں ہمارے خیالات سمجھنے میں ناظرین کی آسانی کے لیے ہم بعض گزشتہ واقعات کا ذکر کرتے ہیں۔ میری طالب علمی کا پہلا زمانہ تو ایسا ہے کہ اس وقت میں سوائے اسلام اور مسلمانوں کے اور کسی چیز کی ہستی نہیں مانتا تھا۔ لیکن جب مطالعہ پختہ ہوا تو مجھے ہندوستانیت اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال اور اس کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی۔ اس وقت عملی اقدام کا مجھے کوئی موقع نہ ملا۔ اس کے بعد جب مسلمانوں کی مرکزی جماعتوں سے میرا تعارف ہوا تو میں نے مناسب طور پر اپنے بزرگوں اور دوستوں کو اس طرف توجہ دلائی۔ اور میری مسرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے امید سے زیادہ کامیابی نظر آئی۔

(۱۳۲۷ھ میں جب مولانا سندھی جمعیت الانصار کے ناظم ہوئے اور کام کرنے لگے تو اس ضروری مسئلہ کے محرکات میں مولانا فرماتے ہیں کہ ــــ میں جس وقت جمعیت الانصار کا ناظم تھا میرے ایک سندھی دوست پروفیسر جیوت رام کرپلانی دیوبند میں تشریف لائے۔ یہ پروفیسر جیوت رام کرپلانی شیخ عبدالرحیم سندھیؒ حیدرآبادی کے بھائی تھے۔ سندھ میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس زمانے میں یہ پروفیسر جیوت رام کرپلانی کانگرس کے سکریٹری کی حیثیت سے دہلی آئے اور ان کو معلوم ہوا کہ مولانا سندھی اس وقت دیوبند میں ہیں تو مولانا کی ملاقات کے لیے دیوبند آئے اور دارالعلوم دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ ایک ہفتہ تک میرے مہمان رہے انھیں پوری آزادی سے دارالعلوم کا معائنہ کرایا۔ آخر میں انھوں نے دارالعلوم کی بہت تعریف کی اور کہا کہ "ہند کے مستقبل میں جو چیزیں کارآمد ہو سکتی ہیں وہ اسی قسم کے کام ہیں۔ واقعی دارالعلوم کے خدمات اہم اور قابلِ تعریف ہیں"۔ میں نے اُن سے سوال کیا کہ "پروفیسر صاحب، آپ کو ہندوستان کی آزادی میں ہماری جماعت کی ضرورت ہے یا نہیں"؟ انھوں نے جواب دیا۔ "بالکل نہیں، آپ اگر ضرورت سمجھیں تو ہمارے ساتھ ہو جائیں، ورنہ ہندوستان ہمارا ہے اور ہم اپنا کام خود کریں گے"۔ اس جواب کا اثر ظاہر ہے ہم پر اچھا نہیں ہوا، اور میرا دل بے قرار ہو گیا۔)

(مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ میں نے پروفیسر کی بات حضرت مولانا شیخ الہند کو سنائی تو اُن پر بھی بہت اثر ہوا۔ انھوں نے فرمایا کہ" اب ہم یہاں تک پہنچ گئے ہیں کہ ہم کو کسی شمار وقطار میں نہیں لایا جاتا۔" چند روز بعد ہمارے موتمر الانصار کا اجلاس مراد آباد میں قرار پایا۔ اور بحیثیت ناظم موتمر الانصار مجھے مراد آباد کے شرفاء سے ملاقات کا موقع ملا۔ بفضلہٖ تعالےٰ ہمارا جلسہ کامیاب رہا۔

مولانا سندھی موتمر الانصار کے اجلاس کے انتظام اور اس کے لیے ضروری اخراجات مہیا کرنے کے لیے طلباے دیوبند کی جماعت کے ساتھ مراد آباد میں گئے۔ وہاں ایک سیٹھ کا خاندان تھا جن کی اسلحہ اور باروت کی دوکان رنگون میں تھی اور یہ علماے دیوبند کے بہت معتقد تھے۔ انھیں سیٹھوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ہم کو تین ہزار روپیہ موتمر الانصار دے گی تو جلسہ کا باقی خرچ اور کھانے پینے کا انتظام ہم کرلیں گے۔ جب مولانا سندھی وہاں پہنچے اور موتمر الانصار کے لیے کام کرنے لگے تو پروفیسر جلال الدین صاحب اپنے چند احباب کے ساتھ مجھ سے ملنے کے لیے سیٹھ صاحب کے مکان پر آئے۔ ہمارے موتمر الانصار کے اجلاس کے لیے جو تاریخیں مقرر ہوئی تھیں بعینہٖ وہی تاریخیں ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی مراد آباد میں رکھی گئی تھیں۔ مولانا جلال الدین صاحب نے کہا کہ" ہم نے ایک سال پیشتر یہ تاریخیں مقرر کی ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ اپنے اجلاس کی تاریخوں کو بدل دیں اور ہمارے ایجوکیشنل کانفرنس مراد آباد کے اجلاس کے دو چار روز بعد موتمر الانصار کا جلسہ کریں تاکہ آپس میں تصادم نہ ہو۔" مولانا نے فرمایا کہ" آپ علیٰحدہ جماعت ہیں اور ہم علیٰحدہ جماعت، ہم کسی طرح اپنی تاریخوں میں رد و بدل نہیں کرسکتے۔" مولانا جلال الدین نے کہا" اگر آپ ہماری بات نہیں مانتے تو مراد آباد سے آپ کو ایک پیسہ کی بھی امداد نہیں ملے گی۔" انھوں نے سخت لہجہ میں کہا" ہم کو تمھاری امداد کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ ناراض ہو کر چلے گئے۔ اب مراد آباد کے سیٹھ صاحبان بہت مایوس ہوگئے۔ اور مولانا پر بھی اثر پڑا۔ جب مہتمم دار العلوم دیوبند کو اس بات کی خبر ہوئی تو وہ فوراً تشریف لائے اور فرمایا۔ آپ نے اچھا جواب دیا۔ توکل پر کام کیجیے اللہ مدد فرمائے گا۔" مولانا نے ایک ایک روپیہ، پانچ پانچ اور دس دس روپے کی رسیدیں چھپوائیں۔ اور

طالب علموں کو حکم دیا کہ مراد آباد شہر میں جا کر چندہ کرو۔ شام کو وہ پانچ چھ سو روپیہ چندہ کر کے لائے۔ میں ساری رات اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا رہا کہ آپ کی مدد کے سوا ہم کوئی کام نہیں کر سکتے۔ صبح کو ہم سیٹھ صاحب کے مکان پر ناشتے کے لیے بیٹھے تھے اور سیٹھ صاحبان بھی موجود تھے۔ ناگہاں سیٹھ حاجی ڈوسل کراچی والے جو پیر صاحب جھنڈے والے کے مرید تھے وہاں آ گئے۔ انھوں نے دیکھا تھا کہ پیر صاحب جھنڈے والے اپنے مرشد کی طرح میری عزت کرتے تھے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی میرے پاؤں پر گر پڑے اور کہنے لگے کہ مولانا آپ مراد آباد میں کیسے تشریف لائے۔ میں نے ان کو کرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ بولے۔ آپ میرے مرشد ہیں میں آپ کے برابر نہیں بیٹھ سکتا۔ آخر سب نے کرسیاں نکال کر باہر پھینکیں اور غالیچہ پر سب بیٹھ گئے۔ میں نے ان کو بتایا کہ علمائے دیوبند کا ایک بڑا اجلاس یہاں ہونے والا ہے۔ اس میں سارے ہندوستان کے علماء جمع ہوں گے۔ سیٹھ حاجی ڈوسل صاحب نے کاغذ قلم منگا کر مراد آباد کے سیٹھوں کو لکھا کہ میری طرف سے یہ قلیل رقم مولانا سندھی کو دے دیں۔ میں نے دیکھا وہ تین ہزار روپے تھے۔ مراد آباد کے یہ سیٹھ در اصل سیٹھ حاجی ڈوسل کراچی والے کے گماشتے تھے۔ وہ تین ہزار کا وعدہ پورا ہو گیا۔ مراد آباد کے لوگ پہلے سمجھے تھے کہ مولانا سندھی دیوبند کے طالب علم ہیں۔ اب اُن کو معلوم ہوا کہ یہ سندھ کے بڑے پیر اور بڑی عزت والے ہیں۔ پھر تو مراد آباد کے لوگوں نے دل کھول کر چندہ دینا شروع کیا۔ جن تاریخوں میں اجلاس ہونے والا تھا میں نے مراد آباد کی تمام گھوڑے گاڑیاں ریزرو کر لی تھیں۔

ہمارے اجلاس میں تقریباً بیس ہزار آدمی جمع ہوئے اور ہندوستانی ریاستوں کے نمائندے بھی آئے تھے۔ ہمارے جلسہ کے اجلاس بھی ہوتے رہے اور ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس بھی ہوتے رہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس میں فقط میں شرکت کرتا رہا۔ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے اراکین ہمارے اجلاس میں شامل ہوتے رہے۔ آخر تین روز کے بعد اجلاس ختم ہوا۔ میں اپنے معزز حضرات کو اسٹیشن پہنچانے گیا تھا۔ پروفیسر جلال الدین کو میں نے دیکھا کہ ایک گھوڑا گاڑی پر سوار ہونے لگے تو گاڑی بان نے کہا کہ یہ ریزرو ہے۔ میں نے جلال الدین صاحب کو ہاتھ پکڑ کر اپنی گاڑی میں بٹھایا۔ اور شہر آتے ہوئے باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے کہا

"پروفیسر صاحب بتائیے ہماری بھی ضرورت ہے یا نہیں؟" تو انھوں نے نہایت متانت اور محبت سے کہا "آپ کے بغیر ہم تنہا کچھ بھی قیمت نہیں رکھتے"۔ اُس وقت میں نے خیال کیا کہ ہماری مولوی پارٹی نے یہ کیسا ظلم کیا ہے کہ گریجوئٹ پارٹی کی طرف دوستی کا ہاتھ دراز نہیں کرتے۔ میں نے یہ بات حضرت مولانا شیخ الہندؒ سے کہی تو آپ نے فرمایا کہ یہ ہماری غفلت ہے۔ آپ کو میں اجازت دیتا ہوں کہ آپ علی گڑھ جائیں اور اتحاد کی کوشش کریں۔

میں نے علی گڑھ سے واپس آکر اراکینِ دار العلوم دیوبند کو بتایا کہ وہ تو دوستی کے لیے تڑپ رہے ہیں۔ اس طرح ہم دونوں کے درمیان مذاکرات ہونے لگے۔ طے یہ پایا کہ کالج پارٹی میں اپنا ایک مولوی نمائندہ مقرر کریں۔ اکثر کی یہ رائے تھی کہ..... مولانا ابو الکلام کو اپنا نمائندہ بنایا جائے۔ مگر دوسروں نے اعتراض کیا کہ وہ غیر مقلد ہے۔ اور مولانا بھی اپنے دل میں سوچتے رہے۔ آخر مولانا نے مولانا محمد علی کو منتخب کیا۔ اس کا قصہ آگے آئے گا۔ (اب ڈائری شروع ہوتی ہے)۔

علی گڈھ کے پروفیسر جلال الدین صاحب جو ہمارے کاموں کو اچھی طرح دیکھ رہے تھے، ان سے میں نے موتمر الانصار کی نسبت سوال کیا تو انھوں نے بہت تعریف کی اس پر میں نے اُن سے بھی وہی بات پوچھی جو پروفیسر کرپلانی سے پوچھی تھی کہ ہماری ضرورت بھی آپ کو ہے یا نہیں؟ پروفیسر صاحب نے نہایت محبت آمیز متانت سے جواب دیا کہ آپ کے بغیر ہم تنہا کچھ نہیں ہیں۔ اس جواب کا مجھ پر گہرا اثر ہوا اور میں نے دل میں اپنے آپ کو اور اپنے دوستوں کو ملامت کی کہ ہم تعلیم یافتہ گریجوئٹ جماعت سے کیوں کھنچ رہے ہیں۔ ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کا پروگرام میرے سامنے آگیا۔ اس کی پہلی کڑی قدیم، یعنی علماء کی جماعت، اور جدید، یعنی گریجوئٹ جماعت کا سمجھوتہ ہونا چاہیئے پھر دوسرا قدم اٹھانا اتنا مشکل نہیں رہے گا۔ یعنی ہندو مسلم اتحاد ہو جائے گا۔

تمہیدی مقدمات کی اپیل

پرانے خیال والے لوگ یعنی علماء اور نئے خیال والے لوگ یعنی نو تعلیم یافتہ گریجوئٹ مسلمانوں میں محل نزاع اور وجہ مخالفت کیا ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتا تھا۔

علمار برداشت نہیں کر سکتے کہ عام مسلمانوں کی رہنمائی کا منصب ان کے ہاتھ سے چھوٹے۔ ادھر گریجویٹ تعلیم یافتہ طبقہ لیڈرشپ کا مدعی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ علمار کی امامت اور پیشوائی میں ہم کوئی کام نہیں کر سکیں گے۔ (یعنی یہ کہ علمار ہر جگہ روڑا اٹکائیں گے)۔

میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا کہ سب سے پہلا کام یہ ہونا چاہیے کہ اہلِ علم لیڈرشپ کے اِدّعا سے دست بردار ہو جائیں اور تعلیم یافتہ لوگوں میں عام طور پر یہ احساس پیدا کر دیا جائے کہ وہ اہلِ علم کی شمولیت کی صحیح قیمت کو نہ بھولیں۔ میرے استاد حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے میرے اس خیال کی بہت داد دی۔ وہ پہلے ہی اس کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مولانا محمد علی مرحوم گورنر یو۔ پی۔ کی آمد پر تشریف لائے تو مولانا خود ان سے ملنے کے لیے ان کی قیام گاہ پر گئے۔ اسی وقت سے ہمارے امام نے مولانا محمد علی کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا۔ میں اس وقت دیوبند میں نہ تھا۔ اور نادان لوگوں نے حضرت شیخ الہند کے اس اقدام پر نکتہ چینی بھی کی تھی۔

مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ جب گورنمنٹ یو۔ پی کی آمد کا وقت مقرر ہوا تھا۔ اور گورنر صاحب کو دیوبند میں دو چار گھنٹہ رہنا تھا تو مولانا شیخ الہندؒ ٹکٹ لے کر سہارنپور چلے گئے تھے۔ جب گورنر صاحب دیوبند سے چلے گئے تو اسی دن شام کو حضرت مولانا واپس دارالعلوم دیوبند میں آ گئے۔ گورنر یو۔ پی کو مدرسہ دارالعلوم دیوبند نے خود بلایا تھا۔ اور میں چند روز پہلے سندھ چلا آیا تھا۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں، اِن سب کو گورنر کی تشریف آوری پر دارالعلوم دیوبند کے اراکین نے دعوت دی تھی۔ شام کو مولانا واپس آئے تو مولانا محمد علی مرحوم وغیرہ کا ایک قاصد آیا کہ ہم آپ سے ملنے اور رخصتی ملاقات کے لیے آنے والے ہیں۔ مولانا شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ اُن سے کہو وہ اپنی جگہ ٹھہریں۔ میں وہیں ان سے ملنے کے لیے آتا ہوں۔ پھر وہ ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور مذاکرات ہونے لگے۔ آپ نے یہ ضرورت پیش کی کہ ہم کو اپنی جماعت میں ایک تعلیم یافتہ نمائندہ مقرر کرنا ہے اس لیے ہم اس کام اور اس عہدے کے لیے مولانا

محمد علی کو منتخب کرتے ہیں۔ اپنی پگڑی اتار کر مولانا محمد علی کے سر پر رکھی اور کہا آپ ہمارے نمائندہ ہیں۔ آپ علماء کی عزت و احترام میں کوتاہی نہ کریں گے۔ (مولانا محمد علی کو نمائندہ بنانے کا یہ واقعہ ہے)۔

مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ میں نے مولانا شیخ الہند کو کوئی مشورہ نہیں دیا تھا۔ مولانا نے اپنی ذاتی رائے سے مولانا محمد علی کو منتخب کیا تھا۔ اس انتخاب پر حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بہت مسرور ہوئے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ڈاکٹر انصاری صاحب مولانا شیخ الہند کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ اور اسی طرح حکیم اجمل خاں دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور مولانا کے خاص مریدوں میں سے تھے۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا خدا بھلا کرے جو علمائے دیوبند اور تعلیم یافتگانِ علی گڑھ کے ملانے میں ایک مضبوط کڑی ثابت ہوئے۔ وہ جب ہلالِ احمر کا وفد لے کر گئے تو اس میں علمائے دیوبند بھی شریک ہوئے۔ اور اس کام کو مکمل کرنے والے ہمارے مسیح الملک حکیم اجمل خاں مغفور تھے۔

جب ہلالِ احمر کا وفد جنگ بلقان میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری لے گئے تھے تو اپنے ساتھ علمائے دیوبند میں سے بھی ایک جماعت کو اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

میں جب دہلی میں آیا اور مسیح الملک کی سرپرستی میں نظارت المعارف قائم ہوئی تو اس میں نواب وقار الملک اور حضرت مولانا شیخ الہند دونوں ایک درجے پر شریک ہوئے۔

(مولانا عبید اللہ سندھی کو ۱۳۲۷ھ میں مولانا شیخ الہندؒ نے سندھ سے بلا کر دیوبند میں کام کرنے کا حکم فرمایا۔ جلسۂ دستار بندی کے بعد جمعیت الانصار قائم ہوئی اس کے ناظم مولانا رہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ مولانا شیخ الہندؒ نے خطوط لکھ کے مولانا عبید اللہ سندھی کو سندھ سے بلایا۔ اور مولانا محمد صادق کراچی والے کو بھی بلایا۔ آپ نے تقریر میں فرمایا کہ دارالعلوم دیوبند کی وہ عزت اور برتری باقی نہیں رہی جو مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں تھی۔ اب اس مدرسہ دیوبند کے مثل اور بہت سے مدرسے ہندوستان میں قائم ہو گئے ہیں۔

اب کیا کرنا چاہیے جس سے مدرسہ دیوبند کی فضیلت لوگوں پر ظاہر ہو۔ اور فرمایا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ سندھ سے ایک آدمی آیا ہے جس کی وضع قطع داڑھی وغیرہ نہایت موزوں ہے۔ اس سے مجھ کو تنبہ ہوا کہ کوئی عالم سندھ سے آئے گا جو تدبیر سوچے گا۔ اور پھر ہماری طرف مخاطب ہو کر فرمایا۔ کوئی ایسی تدبیر سوچو جس سے دارالعلوم دیوبند کی فضیلت اور برتری دوسرے مدرسوں پر ثابت ہو جائے۔

مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ مجھ کو معلوم تھا کہ مدرسہ دیوبند کے بعد جتنے مدرسے ہندوستان میں قائم ہوئے ہیں ان کے معلم اور استاد سب کے سب مدرسہ دیوبند کے طالب علم ہیں۔ میں نے تجویز یہ پیش کی کہ ایک جلسہ اس مقصد کے لیے کرنا چاہیے کہ جو لوگ اس چالیس سال کے عرصہ میں مدرسہ دیوبند سے فضیلت کی سند حاصل کر کے گئے ہیں ان کی دوبارہ دستار بندی کی جائے۔ یہ تجویز مولانا شیخ الہندؒ کو بہت پسند آئی۔ پھر جب یہ دستار بندی کا جلسہ ہوا تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ مدرسہ مظہر العلوم سہارنپور کے بڑے معلم مولوی خلیل احمد صاحب اور باقی تمام مدرسوں کے استاد سب مدرسہ دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے۔ حتیٰ کہ بخارا اور کابل کے علماء کو بھی جو دیوبند کے تعلیم یافتہ تھے اور وہاں قاضی (جج) تھے، دستاریں بھیجی گئیں۔ غرض کہ کوئی بھی عالم ایسا نہیں رہا جو دیوبند کا تعلیم یافتہ نہ ہو۔ یہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ پھر مولانا شیخ الہندؒ نے مولانا سندھی سے فرمایا کہ تم یہاں بیٹھ کر کام کرو تو مولانا نے جمعیت الانصار قائم کی۔

تمام ہندوستان کے علماء جمعیت الانصار کے ممبر ہوئے جن میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ موتمر الانصار کے دو بڑے اجلاس ہوئے۔ دوسرا اجلاس مراد آباد والا تھا۔ اور پھر اپنے تعلیم یافتہ علماء اور نئے تعلیم یافتہ گریجوئٹ مسلمانوں کو بھی مولانا شیخ الہند نے متحد کر دیا۔ گورنمنٹ ہند کو یہ شبہ تھا کہ یہ ساری کارروائی مولانا سندھی کی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اراکین مدرسہ دیوبند ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں۔ کیونکہ اتنی بڑی جماعت کو قبضہ میں رکھنا ہماری طاقت سے باہر ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ مدرسہ کو پرانے نظام پر چلاتے رہیں۔ گورنمنٹ ہند چاہتی تھی کہ مولانا سندھی کو کسی طرح دارالعلوم دیوبند سے

جدا کر دیا جائے۔

ایک بار نجاتِ غیر مسلم کے بارے میں مولانا سندھیؒ مولانا انور شاہ صاحب سے گفتگو کر رہے تھے۔ مولانا سندھی نے فرمایا کہ اگر ایک غیر مسلم آدمی جو با اخلاق ہے، اللہ کو وحدہٗ لاشریک مانتا ہے، اور لوگوں میں اصلاح کرتا ہے اور اس کے اعمال بھی بھلے ہوں تو وہ قیامت میں نجات کا مستحق ہے۔ مولانا انور شاہ صاحب نے کہا "کیا آپ کا یہ اعتقاد ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا نبی نہ مانے تو وہ بھی نجات کا مستحق ہو سکتا ہے؟" مولانا نے غصے سے کہا۔ "بیشک میں یہی سمجھتا ہوں۔ کیونکہ تمھاری تبلیغ ان کے کانوں میں نہیں پہنچی۔ اس پر غصہ ہو کر انھوں نے مولانا پر کفر کا فتویٰ صادر کیا اور اراکینِ مدرسہ کو اطلاع کر دی۔ انھوں نے کہا اگر ان کا یہ اعتقاد ہے تو وہ کافر ہیں۔ پھر انھوں نے ایک مجلس میں مولانا سندھی کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ کہا ہے کہ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ مانے اور اس کے اخلاق اچھے ہوں وہ مسلمانوں کی طرح نجات کا مستحق ہے۔ مولانا سندھی نے فرمایا کہ بیشک میں نے یہ کلمہ کہا ہے۔ انھوں نے کہا آپ نے کلمۂ کفر زبان سے نکالا ہے آپ پر کفر کا فتویٰ عائد ہوتا ہے۔ اب آپ اس سے توبہ کریں تو یہاں رہیں ورنہ چلے جائیں۔ مولانا سندھی نے فرمایا کہ میں توبہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ پھر انھوں نے مولانا کو کلمہ اور آیت باللہ پڑھائی اور استغفار اور توبہ کرانے کے بعد کہا۔ اب آپ مسلمان ہیں۔

اس جھگڑے اور مخالفت کے زمانے میں مولانا شیخ الہندؒ موجود نہ تھے۔ وہ گنگوہ کی طرف گئے ہوئے تھے۔ اور وہاں وہ ہفتہ بھر کے لیے ٹھہر گئے تھے۔ مولانا سندھی نے جمعیت الانصار کی نظامت کے عہدے سے استعفا لکھ کر اراکین مدرسہ کے حوالے کیا اور اسٹیشن آ کر سہارنپور کا ٹکٹ لیا۔ سہارنپور کے اسٹیشن پر مولانا شیخ الہندؒ سے ملاقات ہو گئی۔ ان سے سارا واقعہ بیان کیا۔ اور اپنے استعفا کا بھی ذکر کر دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا آپ نے بہت اچھا کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ آپ دیوبند میں رہیں۔

اب آپ سیدھے دہلی چلے جائیں اور وہاں کوئی مدرسہ کھولیں۔ مولانا سندھیؒ نے دہلی پہنچ کر فتح پوری مسجد کے ایک کمرے میں نظارت المعارف القرآنیہ قائم کی۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ کی غرض یہ تھی کہ مولانا دہلی میں رہ ہندو مسلم اتحاد کی تحریک شروع کریں۔

جب مولانا سندھی مکہ شریف میں تھے تو مولانا انور شاہ صاحب کشمیری نے ان کی طرف خط لکھا کہ میں غلطی سے آپ کے لیے مشکلات کا باعث بن گیا تھا۔ اب میرے دل میں آپ کی عزت اور محبت ہے، کوئی کدورت نہیں۔ اس لیے مہربانی فرماکر آپ بھی مجھے معاف فرمائیں۔ اور اپنے دل سے کدورت نکال دیں۔

ہندو مسلم اتحاد:۔ مولانا سندھی نے جب دہلی میں نظارت المعارف قائم کی تو مولانا شیخ الہندؒ نے دہلی پہنچ کر اُن کا تعارف ڈاکٹر مختار احمد انصاری، مسیح الملک حکیم اجمل خاں اور مولانا محمد علی سے کرایا۔ اور مولانا شیخ الہندؒ نے نظارت المعارف کی سرپرستی قبول فرمائی۔ اور علی گڑھ کالج کے سرپرست نواب وقار الملک بھی شریک ہوئے۔ اور نظارت المعارف کا کام خوش اسلوبی سے چلنے لگا۔ نواب بیگم بھوپال نے ماہانہ دوسو ۲۰۰ روپیہ دینا منظور کیا۔ اور علم دوست حضرات نے وظیفے مقرر کیے۔ مولانا شیخ الہندؒ ہی نے ہندو مسلم اتحاد کی تدبیریں شروع کردیں اور اپنا نظریہ بھی واضح الفاظ میں بتادیا کہ مولانا سندھی میرے بھیجے ہوئے آدمی ہیں۔ ان کو میں نے اس لیے مقرر کیا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش کریں۔ کیونکہ اب مولوی پارٹی اور کالج پارٹی بھی متحد ہوگئی ہیں۔ اور اب وقت آگیا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد پیدا کیا جائے۔

اس مرحلہ کے طے ہونے پر مسیح الملک اور ڈاکٹر انصاری نے دہلی میں اس کام کو عملاً شروع کردیا۔ اور اس میں اعلیٰ درجہ کی کامیابی ہوئی اور مولانا محمد علی قومی لیڈر بن گئے۔ میں ہندو دوستوں کے خیالات جانچتا رہا۔ ان میں بہت بڑا انقلاب پیدا ہوگیا۔ پروفیسر کرپلانی جب دوسری مرتبہ دہلی تشریف لائے تو ان کی ذہنیت اور تھی۔ انھوں نے مجھے دعوت دی کہ اگر میں چاہوں تو تمام ہندوستان کا مطالعہ کرسکتا ہوں اور وہ میرے لیے انتظام کردیں گے۔ ان واقعات سے میں اس نتیجہ پر

پہنچا کہ اس قسم کی غلط فہمی ہندوؤں میں کافی طرح موجود ہے، لیکن وہ ناقابلِ علاج نہیں۔ تھوڑی سی توجہ سے دُور ہوسکتی ہے۔ میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ تمام یورپ اور امریکہ میں یہ پروپیگنڈا کیا جاچکا ہے کہ مسلمان ہندوستان میں اقلیت میں ہیں اور ان کی کوئی ہستی نہیں نہ اُن میں تحریک آزادی ہے نہ طاقتِ انقلابی۔ دوسرا پروپیگنڈا یہ کیا گیا تھا کہ ہندوستانی لوگ (خواہ ہندو ہوں یا مسلمان) ملاقات کے وقت رام رام کرتے ہیں۔ چنانچہ جب میری ملاقات جرمن کپیٹن سے پہلی مرتبہ ہوئی تو اس نے اُٹھ سلام کے بجائے رام رام کیا۔

ہندوؤں کی ایک غلط فہمی۔ ہندو نوجوان تاریخ پڑھ کر یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ اصلی ہندوستانی ہندو ہیں اور مسلمان انگریزوں کی طرح ایک بیرونی فاتح ہیں۔ اس لیے جب وہ ہندوستان سے باہر یورپ، جاپان یا چین وغیرہ میں جاتے ہیں تو وہاں یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ ہندوستان ہندوؤں کا گھر ہے۔ اور مسلمانوں کو بیرونی سمجھ کر ان کے برخلاف پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمان شرفائ کی ایک بڑی جماعت عرب و عجم کے بزرگوں کی اولاد ہے۔ اور ان کی زبان سے بھی بعض اوقات ایسے کلمات نکل جاتے ہیں جس سے ہندو نوجوانوں کو اپنے تخیل کی سند مل جاتی ہے۔ اگر تحقیق کی نظر سے دیکھا جائے تو ہندو بھی باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ اور ان آریوں کا اصل مسکن اور وطن وہی تھا جہاں سے مسلمان ہندوستان میں آکر بسے ہندو آریہ کئی ہزار سال مسلمانوں سے بیشتر آئے ہیں اور مسلمان آریہ ایک ہزار سال سے اپنا وطن چھوڑ کر ہندوستان آئے ہیں۔ یعنی ہندو پہلے آریہ ہوئے اور مسلمان دوسرے درجے پر آریہ ہیں۔ اگر زیادہ تحقیق کی جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوستان کی بہت خدمت کی ہے۔ اس اعتبار سے اگر یہ کہا جائے کہ مسلمان اول درجے کے آریہ ہیں اور ہندو دوسرے درجے کے تو یہ غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ ہندوستان کے اصل باشندے تو بھیل، گونڈ اور دراوڑ وغیرہ قومیں ہیں۔ حالانکہ ہندو نوجوان ان کو اصلی حق نہیں دیتے۔ خیر یہ بات تو جملہ معترضہ ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ جو مسلمان عرب و عجم سے آئے

وہ ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی ہوگئے۔ ان کا کوئی تعلق بیرونی ممالک سے نہیں رہا۔ اور جن ملکوں سے یہ آئے ہیں، وہاں کے لوگ انھیں پہچانتے ہی نہیں، بلکہ ان کو ہندوستانی سمجھتے ہیں۔ مگر میرے ابتدائی مطالعہ میں مجھ کو معلوم ہوگیا تھا اور میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی عام آبادی خصوصًا طبقۂ سافلہ (کاشتکار او مزدور وغیرہ) ہندو بزرگوں کی اولاد ہیں، جو اسلام قبول کر چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ناظرین میری شخصیت سے ناواقف نہ ہوں گے کہ میں ایک ہندو سناتن دھرمی کے گھر پیدا ہوا۔ اور ایک ہندو نومسلم (شیخ سلیم) کی کتاب "تحفۃ الہند" میں نے دیکھی جو ایک برہمن کے واسطے سے مجھے ملی تھی۔ اس کے مطالعہ کے بعد اسلام کی حقانیت میرے اوپر ظاہر ہوئی۔ اور میں سولہ برس کی عمر میں مسلمان ہوگیا۔ پھر علوم دینیہ میں تکمیل کرکے دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی سند حاصل کی۔ تو میں مسلمان ہوں اور ہندو خاندان سے مسلمان ہوا ہوں۔ اسی طرح باقی مسلمان ہندو بزرگوں کی اولاد میں سے ہیں۔ میرا ابتدائی مطالعہ سے یہ یقین تھا کہ سب مسلمان ہندوستانی ہیں۔ ان کو بیرونی سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ اور جو بزرگ فاتحانہ طور پر ہندوستان میں داخل ہوئے وہ بھی یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اور جو خاندان اس نئے مذہب اور اسلامی تمدن کو قائم کرنے کی کوشش کرتے رہے اُن کی اولاد اول درجہ کی ہندوستانی ہے۔ ہندو قوم کا نومسلم اور اسلامی فاتحین کی اولاد میں فرق کرنا ایک نہایت حماقت آمیز جہالت ہے۔ ہمارے ہندو بھائیوں کو بہت اس غلط فہمی سے پاک ہو جانا چاہیئے۔ میرا یقین ہے کہ اسلام سے بہتر انسانیت کے لیے کوئی مذہب، کوئی فلسفہ، کوئی تمدن اور کوئی قانون میسر نہیں آسکتا۔ اس لیے ہندوستانیوں کو اسے عزت سے مان لینا چاہیے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے ایسا نہیں ہوسکتا تو ہم نومسلم کیا ایسے بھی گئے گزرے ہوگئے ہیں کہ اپنی آبادی کے تناسب سے اپنے مذہب کی عزت تمام ہندو بھائیوں سے نہ منوالیں۔ ایک ہندوستانی ہندو اسلام قبول کرنے کے بعد اپنے آپ کو زیادہ بہادر اور زیادہ شریف و باعزت تصور کرتا ہے۔

اس عبارت سے مولانا ہندوؤں کو چیلنج دے رہے ہیں کہ اگر تم نے ہم مسلمانوں کا تناسب اعداد کے لحاظ سے خیال واحترام نہ کیا تو ہندوستان کی تقسیم ہوگی اور علیحدہ طور پر ایک مسلم حکومت قائم کی جائے گی۔ اور ہوا بھی ایسا کہ مسلمانوں کے مطالبات ہندوؤں نے قبول نہ کیے اس لیے مسلمانوں نے پاکستان حاصل کیا۔

جب مولانا سندھی کابل میں بیٹھ کر یہ تجویزیں سوچنے لگے کہ شمال مغربی ہندوستان (یعنی سندھ، صوبۂ سرحد، پنجاب، کشمیر، تبت اور نیپال) کو افغانستان اور روس کی طاقت سے آزاد کرایا جائے تو اس تجویز کی خبر ڈاکٹر اقبالؒ صاحب کو پہنچ گئی۔ تو ڈاکٹر اقبال نے اس تجویز پر غور کیا اور ہر صوبے کے پہلے حرف کے مجموعے سے موجودہ پاکستان کی تشکیل کا خیال کیا۔ یعنی پ سے پنجاب ا سے آسام ک سے کشمیر س سے سندھ اور سرحد ت سے تبت اور ن سے نیپال۔ (یہ عبداللہ لغاری صاحب کا خیال معلوم ہوتا ہے)۔

وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جب یہ لفظ "پاکستان" مسلمانوں میں عام ہوا تو ہندوؤں نے کان کھڑے کیے۔ اور گاندھی جی نے اسی لیے جنگِ افغانستان کے وقت کوئی تحریک پیش نہیں کی۔ حالانکہ مولانا سندھی کو لکھا تھا کہ اگر افغانستان ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ کرے تو ہم ہندوستان میں گڑبڑ شروع کردیں گے۔ سے

سن انوی سو سولاں وچہ بنیا ای منصوبہ — آگرے کنوں اجمیر تائی آزاد کرو اس صوبہ

مولانا سندھی نے افغانستان اور برطانیہ کی جنگ سے تین روز پہلے گاندھی سے یہ وعدہ لے لیا تھا۔ جب ہندوستان میں مولانا سندھی آئے تو مولانا یہی کہتے تھے کہ یہ شخص جھوٹا ہے۔ ان کی تحریک ہندوؤں اور سکھوں کے برخلاف ہے۔ یہ دو ہزار سال قبل کی تحریک کو جگانا چاہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر مسلمانوں کے ہاتھوں سے ہندوستان آزاد ہوا تو مسلمانوں کی پولیٹکل طاقت بڑھ جائے گی۔ جب ریشمی خطوط لکھے گئے (جنھیں راجہ مہندر پرتاب نے پڑھ لیا تھا) اس وقت چار لاکھ افغانی فوج حملہ کے لیے تیار تھی۔ اور فقط اتنی دیر تھی کہ جونہی یہ ریشمی خطوط شیخ الہندؒ کے پاس حجاز پہنچیں ترکی کی ایک لاکھ فوج افغانستان آجائے۔ اس لیے ریشمی خطوط لکھے گئے تھے۔ اور مولوی عبدالباری اور

ڈاکٹر شجاع اللہ کو ترکی کے پاس بھیجا گیا تھا۔ اس وقت راجہ مہندر پرتاب موجود تھا۔ اصل میں راجہ مہندر پرتاب مالوی جی کا آدمی تھا۔ اور وہ اس مقصد کے لیے وہاں رکھا گیا تھا کہ اگر افغانستان ہندوستان پر حملہ کرے تو راجہ مہندر پرتاب مالوی جی کو خبر کر دے۔ تو جب راجہ مہندر پرتاب نے دیکھا کہ اب افغانستان سے ہندوستان پر حملہ ہونے والا ہے تو پہلے یہ کیا کہ ریشمی خطوط لانے والے شیخ عبدالحق کو جو نومسلم اور غیر مستقل طبیعت کا آدمی تھا، اور جو رب نواز یا حق نواز ملتانی کے پاس مسلمان ہوا تھا (اور یہ رب نواز یا حق نواز خان بہادر تھے اور ملتان کے رہنے والے تھے) راجہ مہندر پرتاب نے سمجھایا کہ ضرور بالضرور یہ خطوط رب نواز یا حق نواز کو دکھلا دینا تاکہ وہ بھی اس تحریک میں شامل ہو جائے۔ لیکن اصل غرض یہ تھی کہ وہ خان بہادر ہیں اس لیے وہ یہ خطوط گورنمنٹ کو پیش کر دیں گے۔ چنانچہ راجہ مہندر پرتاب کی نصیحت پر شیخ عبدالحق نے عمل کرتے ہوئے رب نواز یا حق نواز کو یہ خطوط دکھلائے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ الہند حجاز میں گرفتار ہو گئے۔ اور مولوی عبدالباری اور ڈاکٹر شجاع اللہ جو ترکی گئے تھے وہ ایران میں گرفتار ہو گئے۔ اور باقی ہندوستان میں بہت سی گرفتاریاں ہوئیں۔ اور خود راجہ مہندر پرتاب جنود اللہ اور حزب اللہ کے دفتر پر قبضہ کرتے ہوئے بلخ چلے گئے۔ بلخ میں سندھ کے ہندو تاجر موجود تھے۔ راجہ وہاں بڑی تکلیف اٹھاتا ہوا سوئٹزرلینڈ پہنچا اور وہاں اپنے بھائی کو بلا کر سارا دفتر سپرد کیا اور ریشمی خطوط کے سارے قصے سنائے۔ اور کہا کہ ہندوستان پر حملہ ہونے والا ہے اور مسلمان اس پر قابض ہونے والے ہیں۔ مالوی جی کو خبردار کر دینا۔

مالوی جی نے شردھانند کو بلا شرط و شروط قید سے آزاد کرا کر شدھی کی تعلیم شروع کرائی۔ اور مسلمانوں نے اس کے جواب میں تبلیغ کا کام کیا۔ مالوی جی نہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلمان کا اتحاد ہو، یا مسلمانوں کی طاقت سے ہندوستان آزاد ہو۔ کیونکہ مسلمانوں کی پولیٹیکل طاقت بڑھ جائے گی۔

کانگرس کے ایک لیڈر کی رائے:۔ مسلم لیگ کا ڈپوٹیشن شملہ گیا تو مسٹر

گوکھلے نے مسلمانوں کو اپنی تعداد سے زیادہ نمائندگی مانگنے پر ایک آرٹیکل لکھا تھا میں نے اس کا ترجمہ پڑھا ہے۔ اس سے میرے دل میں یہ بات ٹھیک طور سے بیٹھ گئی کہ واقعی انصاف کی رُو سے ہمیں اس قدر نمائندگی پر راضی ہو جانا چاہیے، جس قدر شری پت کرشن گوپال گھوکھلے ہمارے لیے مانتے ہیں۔ میں نے راجا صاحب سے اس کا ذکر کیا کہ جن صوبوں میں مسلم آبادی زیادہ ہے وہاں کوئی کارروائی مسلمانوں کے فیصلے کے بغیر نہ ہونی چاہیے — یعنی یہ مسئلہ بیرونی لوگوں کے سامنے نہیں آیا تھا، بلکہ سارے براعظم ہندوستان کو اکائی مان کر اکثریت کے فیصلے کو ترجیح تھی۔ راجا نے ہماری مدلل بات سنی اور اعداد و شمار میں غور کیا، تو ان کی رائے ہمارے موافق ہو گئی۔ لیکن جب جرمن کیپٹن نے ہماری باتیں سنیں اور ہم مسلمانوں کے اعداد و شمار، اور اس بات پر بھی غور کیا کہ مسلمان ہی جنگی طاقت رکھتے ہیں، تو اس نے یہ بات پسند نہیں کی اور کہا کہ ہماری گورنمنٹ نے ایک دفعہ غلطی کی ہے دوسری دفعہ نہیں کرے گی۔

جرمن کیپٹن کے اس قول کی اصل یہ ہے کہ آئندہ مسلمانوں کی طاقت کا خیال رکھتے ہوئے ہماری گورنمنٹ کو اگر امداد دینی ہو گی تو مسلمانوں کے اکثریت والے صوبوں میں دی جائے گی۔ اس کا مرکز بلوچستان میں وڈھ کا علاقہ ہو گا۔ وڈھ کے علاقے میں اگر سامانِ جنگ پہنچ گیا تو صوبہ سرحد کو بھی مل جائے گا۔ اور مولانا فرماتے تھے کہ اس کیپٹن نے مجھ سے تخلیہ میں کہا تھا کہ ہم نے ہندوؤں کے کہنے پر ایک دو جہاز اسلحہ اور بارود وغیرہ کے بنگال پہنچا دیے تھے، مگر اب تک اس سامان کا کوئی اثر پیدا نہیں ہوا۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ ہندوؤں میں جنگی طاقت نہیں ہے، شور بہت مچاتے ہیں۔ اور منظم کام کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

راجہ مہندر پرتاب :۔ ہمارے راجا صاحب ہیومینیٹیرین (Humanitarian) یعنی صلح کل ہیں اور اسی کا پروپیگنڈا کرتے ہیں۔ لیکن اعلیٰ انسانیت کا معیار ان کے ذہن میں ایک کٹر ہندو سیاسی سے اونچا نہیں ہے۔ ان کے نزدیک

مسلمانوں کی کوئی ہستی نہیں۔ میرے ابتدائی مطالعہ میں یہ بالکل بوائے (Boy) معلوم ہوتا تھا۔ (لیکن کابل کے حالات عجیب تھے) وہاں مہمانوں کے ساتھ رواداری ایک مرض کے درجے تک ترقی کر چکی تھی۔ وہ مہمانوں کی بات صریحاً غلط سمجھ رہے ہوں تب بھی اپنے آپ کو جاہل بنا کر مہمانوں کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری جانتے ہیں۔ عام مجلسوں میں ان کی غلط باتوں کے لیے شاعروں کے مقولے پیش کر دیتے ہیں جس سے مہمان سمجھتا ہے کہ میرے پروپیگنڈے کا خوب اثر ہو رہا ہے۔ ہمارے راجا صاحب بھی اس غلط فہمی میں زمانے تک مبتلا رہے۔ یعنی ان کا مطلب تھا کہ ہندو بھی ہندوستان کو آزاد کرائیں گے اور خود حکومت کریں گے اور یہی پروپیگنڈا کرتے تھے کہ مسلمانوں کا علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے۔

افغانی سردار جانتے تھے کہ جنگی مقامات پر ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ اور مسلمانوں کی شرکت کے بغیر ہندوستان کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ لیکن راجہ صاحب کی باتوں پر وہ لوگ واہ واہ کرتے رہتے تھے۔ جب کیپٹن کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ حیران رہ گئے۔ کہنے لگے اکثریت تو مسلمانوں کی ہے۔ ہندوؤں کی تعداد اگرچہ زیادہ ہے، مگر جنگی طاقت کے اعتبار سے بے سود ہے۔

یہ کہنا بے جا نہیں ہے کہ میرے تبادلۂ خیالات نے راجہ صاحب کو مجبور کیا کہ ہندوستانی معاملات میں وہ صحیح طور پر مسلمانوں کو شریک کریں۔ اور میں ان کے لیے ایسا نرم اور میٹھا ثابت ہوا جیسے مولوی برکت اللہ مرحوم۔ اس کے بعد ہمارے اور راجہ صاحب کے اکثر معاملات محبت سے طے ہوتے رہے۔ اور میں نے ان کے معاملے کو پروفیسر کرپلانی کی طرح معمولی تصور کیا۔ (یعنی ایک غلط فہمی) اور دلائل کی روشنی میں اس کی درستی کر دی گئی۔

راجہ صاحب کا حملہ :- مگر واقعہ ایسا نہیں تھا۔ انھوں نے ہندو مہاسبھا کا نظریہ اس وقت سے قبول کر لیا تھا، یا صحیح طور پر کہا جائے تو انھوں نے اپنے قلبی فیصلے کو عملی صورت دینا اس وقت شروع کیا تھا، جب آریہ سماج کو ہراول بنا کر

لالہ ہردیال کے نام سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا تھا۔ یعنی جب لالہ ہردیال امریکہ اور جاپان میں آریہ سماج کے نظریہ کے مطابق ہندوستان کے مسلمانوں پر حملہ کرتے رہے۔ اس وقت سے راجہ صاحب نے بھی یہی نظریہ قبول کر لیا تھا۔ عملاً راجہ صاحب وہی کام کرنا چاہتے تھے اور اس کا مطلب تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کی تحریکِ انقلابی، جو کابل میں جاری تھی اس کو شکست دے دی جائے۔

راجہ صاحب نے کافی محنت کے بعد اپنے بھائی سے سوئزرلینڈ میں ملاقات کی صورت نکالی اور انھیں نشیب و فراز سمجھا کر ہندوستان کی طرف واپس کر دیا۔ راجکمار شارڈھا کالج لاہور میں جلوس اور پنڈت مالوی جی کا لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند سے جیل میں مل کر انھیں معافی کے لیے تیار کرنا معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس میں راجہ صاحب کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔

اس کا قصہ یوں ہے کہ جب ہندوستانی مشن کا وفد تاشقند سے واپس آیا تھا اور سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت کا ارادہ تھا کہ اب ماوراے سندھ پر حملہ کی تجویزیں کرنی چاہئیں، (یہ غالباً جنوری یا فروری ۱۹۱۶ء کا واقعہ ہے) تو راجا صاحب کو خوف لاحق ہوا اور وہ اس کی خبر پہنچانے کے لیے بلخ چلے گئے۔ اور بڑی محنت مشقت کے بعد روس کے علاقے میں پہنچے۔ پھر وہاں سے سیدھے سوئزرلینڈ گئے اور سوئزرلینڈ میں اپنے بھائی کو طلب کر کے سمجھایا کہ مسلمان ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس وقت حربِ عمومی کی وجہ سے انگریز مشکلات میں مبتلا تھے۔ ایک طرف تو وہ عراق پر حملہ کر رہے تھے۔ اور دوسری طرف درۂ دانیال پر اپنی تمام طاقت جمع کر رہے تھے۔ تیسری طرف جرمنوں کے ساتھ کیسل مقام پر جنگ تھی۔ اور گو کہ انگریزوں نے امریکا سے مدد طلب کی تھی۔ پھر بھی وہ ہر طرف پھنسے ہوئے تھے۔ اگر اس وقت مسلمان ہندوستان پر حملہ کرتے تو ضرور کامیاب ہوتے۔

یہ واقعہ ہم لکھ آئے ہیں کہ جب سونی پٹری کی کتاب تاشقند پہنچی اس وقت زارِ روس بہت مشکلات میں پھنسا ہوا تھا۔ جب وفد واپس آیا اور معلوم ہوا کہ زارِ روس میں اتنی طاقت نہیں کہ افغانستان پر حملہ کرے تو نصر اللہ خاں نے یہ تجویز کی کہ اب ہندوستان پر حملہ

کر دیا جائے تو ترکی ایک وفد بھیجا جس میں میاں عبد الباری اور شجاع اللہ تھے۔ اور ریشمی خطوط بھیج کر مولانا شیخ الہندؒ کو حجاز سے بلوایا کہ ترکی سے ایک لاکھ فوج لیتے ہوئے افغانستان پہنچ جائیں۔ اس وقت راجہ مہندر پرتاب کو یقین ہو گیا کہ اس وقت برطانیہ کی فوج ہندوستان میں نہیں ہے اگر افغانستان اپنی چار لاکھ اور ترکی کی ایک لاکھ فوج کے ساتھ حملہ کرے گا تو شمال مغربی حصہ مسلمانوں کے قبضے میں آجائے گا۔ چنانچہ اس نے … شیخ عبد الحق نو مسلم کو سمجھایا کہ یہ ریشمی خطوط رب نواز خاں بہادر ملتانی کو دکھلانا۔ مگر اس کو یقین نہ تھا کہ وہ دکھلائے گا، اس لیے وہ خود بلغ ہوتا ہوا سوئزرلینڈ پہنچا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۶ء کا ہے۔ اس وقت زار روس کی حکومت قائم تھی۔ یہ ساری تجویزیں اس لیے تھیں کہ مسلمانوں کی پولیٹیکل طاقت ہندوستان میں نہ بڑھ جائے۔ کیونکہ ہندو چاہتے تھے کہ اگر ہم ہزار سال تک برطانیہ کے ماتحت رہیں تو ہمیں منظور ہے مگر مسلمانوں کے ہاتھوں سے آزادی حاصل کرنا ہمارے لیے موت کے برابر ہے۔

یہ راجہ صاحب مالوی جی کے فرستادہ تھے۔ اور مالوی جی کٹر ہندو مہاسبھا کے ممبر تھے اور مسلمانوں کے سخت مخالف تھے۔ وہ مالوی جی کو اطلاع دینے کے لیے سوئزرلینڈ گئے۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد تھا۔ اور ہندوستان میں مسلمان سب کے سب کانگرس میں شریک تھے۔ اور گاندھی جی کی قیادت میں متفق ہو کر خلافت کے مسئلہ کو اپنے حسب منشا طے کرنا چاہتے تھے۔ راجہ صاحب نے سوئزرلینڈ میں اپنے بھائی کو سمجھایا کہ مالوی جی اور لالہ لاجپت رائے کو اطلاع کرو کہ مسلمان ہندوستان پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔ اب ہندو مسلم اتحاد کو توڑ دیا جائے۔ لالہ لاجپت رائے کٹر آریہ اور مالوی جی ہندو مہاسبھا کے ممبر، جب راجہ صاحب کا بھائی ….. ہندوستان پہنچا اور دونوں کو پوری پوری بات سمجھائی، اس وقت شردھانند جو آریہ سماج کا پریسیڈنٹ تھا۔ اور اس کو کانگرس کی ہل چل میں قید کر دیا گیا تھا۔ اس کو جیل میں سمجھایا کہ تم غیر مشروط معافی مانگ کر آزاد ہو جاؤ اور شدھی کی تبلیغ کرو۔ یعنی مسلمانوں کو ہندو بنانے کی کوشش کرو تاکہ ہندو مسلم اتحاد ٹوٹ جائے۔

دہلی کے قریب ایک علاقہ ہے جس کو ملکانا کہا جاتا ہے۔ وہاں کے لوگ مسلمان ہیں

مگر ہندوؤں جیسے رسم ورواج رکھتے ہیں ۔ گویا نیم مسلمان ہیں ۔ شردھانند نے آزاد ہو کر آریہ سماج کی پوری طاقت سے ملکانا کے مسلمانوں کو ہندو بنانا شروع کر دیا ۔ اور ہر طرح کا لالچ دیا ۔ مولانا محمد علی مرحوم جو نئے اور پرانے مسلمانوں کے لیڈر تھے انھوں نے کانگریس چھوڑ کر تبلیغ اسلام پر اپنی تمام توجہ صرف کرنی شروع کی ۔ مسلمان کانگریس میں بادلِ ناخواستہ شریک ہوئے تھے اور ہندوؤں کے برتاؤ سے نالاں تھے ۔ وہ شردھانند کی اس حرکت کو دیکھ کر کانگریس سے دست بردار ہو گئے اور ہندو مسلم اتحاد ٹوٹ گیا ۔ اور یہی راجہ صاحب کا مقصد تھا ۔ اس وقت کی تقریروں میں گاندھی جی کے الفاظ تھے کہ کسی شیطان نے گہری سازش کر کے ہندو مسلمان اتحاد پر ضرب لگائی ہے ۔ گاندھی جی کی یہ شکایت اکثر تقریروں میں موجود ہے خصوصاً حیدر آباد سندھ میں جو تقریر کی تھی اس میں صاف صاف کہا تھا کہ جلد ہی یہ شرارت ختم ہو جائے گی ۔

لالہ لاجپت رائے کی ملاقات استنبول میں :۔ راجا صاحب فرماتے ہیں کہ حکومتِ موقتۂ ہند یعنی پروویژنل (Provisional) گورنمنٹ ہند کی کتاب سوئزرلینڈ کے سفر میں چرائی گئی ہے ۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ بھی پنڈت مالوی جی تک پہنچ گئی یا پہنچا دی گئی ۔ اس سے جس قدر معلومات حاصل ہوئیں ان کا عام پروپیگنڈا آسان نہیں ۔ فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے گہرے واقعات کیسے معلوم ہوئے ۔ ہمارا خیال ہے کہ راجا صاحب کی عزت محفوظ کرنے کے لیے لالہ لاجپت رائے ہم سے ملنے کے لیے قسطنطنیہ آئے اس کے بعد ہر ایک بات ہمارے نام سے کہی جا سکتی ہے ۔ ہماری ملاقات سے لالہ جی نے اور بھی فائدہ حاصل کرنا چاہا، جس میں افسوس کہ انھیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑا ۔ یہاں پر یہ ایک جملہ معترضہ ہے ۔

اس جملۂ معترضہ کی تفصیل یہ ہے کہ پروویژنل گورنمنٹ ہند کے قیامِ کابل میں ایسے امور وقوع میں آئے تھے جن کا علم میرے اور راجا صاحب کے سوا اور کسی کو نہ تھا ۔ اور کتاب موقتۂ ہند میں وہ باتیں درج تھیں ۔ مالوی جی نے ایسے راز گورنمنٹ ہند کو بتلائے جس سے میری عزت پر حملہ ہوتا تھا ۔ اور شردھانند اپنی جماعت آریہ سماج میں اس کا ذکر عام طور پر کرتا تھا

جرمن کپتان اور ترک کپتان اِن رازوں سے واقف تھے۔ ان رازوں کے اشارات کا مقصد یہ تھا کہ یوروپین سلطنتوں میں مسلمانوں کی وقعت کم ہو۔ مگر ساتھ ہی ساتھ اس حکومتِ موقتہ کا پریسیڈنٹ راجا مہندر پرتاب تھا۔ اس کا سوئزرلینڈ میں آنا مشہور تھا۔ اس طرح یوروپین انقلابی سمجھ رہے تھے کہ یہ ساری حرکتیں راجا مہندر پرتاب کر رہا ہے۔ لالہ لاجپت رائے اس لیے استنبول میں مجھ سے ملے کہ وہ راز مولانا سندھی کی زبانی سن کر یورپ اور ہندوستان میں پروپگینڈا کریں اور ظاہر کریں کہ اِن اسرار کا افشا کرنے والا راجہ نہیں بلکہ مولانا سندھی ہیں۔ گویا اس طرح ہندوستان اور باقی سلطنتوں میں راجا صاحب کی اور باقی ہندوؤں کی عزت محفوظ ہو سکتی ہے۔ اور مسلمان انقلابیوں کی عزت برباد ہو سکتی ہے۔ کیونکہ انقلابی مسلمان اپنے بڑے رازوں کو نہیں چھپا سکتے۔

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ جس وقت انگریز اور افغانستان کے درمیان معاہدۂ صلح ہو رہا تھا اور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کی اجازت سے ہم نے روس سے بذریعۂ حکومتِ موقتۂ ہند معاہدہ کیا تھا اس وقت راجا مہندر پرتاب سوئزرلینڈ سے واپس کابل پہنچ گئے تھے۔ چونکہ حکومتِ موقتۂ ہند کے پریسیڈنٹ راجہ صاحب تھے اس لیے اِن معاہدات پر دستخط بھی راجہ صاحب کے ہوتے اور مولانا بحیثیت پرائیوٹ سکریٹری کے ہوتے اور کابل کانگریس کمیٹی کے صدر مولانا سندھی تھے اور معاہدہ گویا کابل کانگرس کمیٹی اور روس کے درمیان تھا۔ اور حکومتِ موقتۂ ہند کے درمیان بھی تھا جس کے صدر مولانا ہو گئے تھے۔

وہ معاہدہ اس طرح تھا کہ اگر دوبارہ افغانستان اور انگریزوں کے درمیان جنگ چھڑی تو روس سلطنت ہم کو ایک لاکھ فوج کی مدد دینا منظور کرے۔ اور ایسا وعدہ روس نے ہم سے کر بھی لیا تھا۔ آخر جب افغانستان کو آزادی حاصل ہو گئی تو کابل میں میرا قیام غیر مفید معلوم ہوا اس لیے میں روس چلا گیا۔ اور چونکہ میں کابل کانگرس کمیٹی کا بھی صدر تھا اس لیے روس میں مجھ کو معزز مہمان تسلیم کیا گیا۔ اور ہر طرح کی سہولت حاصل ہوئی۔ میرے ساتھ ہندوستانی نوجوان بھی تھے۔ ان سب کے ساتھ سرکاری مہمان کی طرح

برتاؤ کیا گیا۔ اور مجھ کو خاص طور پر ہر طرح کی طاقت کے خزانے دکھلائے گئے۔ اور کمیونسٹ روسی مجھ کو اپنے سے بھی زیادہ کمیونسٹ سمجھنے لگے۔ کمیونزم اجلاس میں کسی کو عبادت کرنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر مجھ کو اجازت تھی۔ جب اراکینِ کمیونزم سے پوچھا گیا کہ اس کو اجلاس میں عبادت کی کیوں اجازت ہوتی ہے، تو ان کے پریسیڈنٹ نے جواب دیا کہ اگر ان جیسے کمیونسٹ آدمی ہوں تو ہم اُن کو اپنے آپ سے بھی بڑھ کر کمیونسٹ سمجھیں گے۔

پھر میں ماسکو سے استنبول آگیا۔ وہاں روس کا وزیرِ خارجہ مجھ سے ملا اور اس نے کہا کہ گورنمنٹ روس نے آپ سے جو امداد کا وعدہ کیا تھا تو اب ایسا وقت آگیا ہے کہ اول تو افغانستان کے راستے سے ہندوستان پر حملہ کرنے کا کوئی موقع نہیں رہا۔ دوسرے گاندھی جیسا سرمایہ پرست کانگرسی ہند پر مسلط ہو گیا ہے جس سے ہم متنفر ہیں۔ بہرحال ہم اپنے وعدے پر مستقیم ہیں۔ مگر جب موقع ہی نہیں رہا تو آپ کو چاہیے کہ آپ اپنا انقلابی پروگرام شایع کر دیں جس سے یہ سمجھا جائے گا کہ اب آپ کی انقلابی تحریک ختم ہو گئی ہے، اور ہم بھی معاہدے سے آزاد ہو گئے ہیں۔ ہم پھر کوئی اور تجویز سوچیں گے۔

لالہ لاجپت رائے کا قسطنطنیہ میں آنے کا یہ مقصد تھا کہ یہ معلوم کر سکے کہ مولانا کیا واقعی روس سے امداد لے رہے ہیں۔ آگے پروویژنل گورنمنٹ موقتۂ ہند کابل کا پریسیڈنٹ راجا مہندر پرتاب تھا۔ جب ریشمی خطوط ہندوستان بھیجے گئے تو اسی وقت راجا مہندر پرتاب سوئزرلینڈ چلے گئے۔ اور اس کے بعد مولانا سندھی اور ان کی جماعت کو انگریزوں کے پروٹسٹ پر کابل میں نظر بند کیا گیا۔ مگر انقلابی تحریک چلتی رہی اور پریسیڈنٹ حکومتِ ہند مولانا سندھی بن گئے۔ حاصل کلام جب سوئزرلینڈ میں یہ خبر پہنچی کہ امیر امان اللہ خاں والیِ افغانستان اور انگریزوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی اور جنگ کے بعد صلح کی باتیں شروع ہوئی ہیں تو راجہ مہندر پرتاب روس کے راستے سے جہاں اب کمیونسٹ حکومت قائم ہو چکی تھی واپس کابل پہنچے اس وقت امیر امان اللہ نے مولانا سے کہا اب ہم صلح کا وفد دہلی بھیجنے والے ہیں، اور انگریز ایسی شرطیں پیش کریں گے جس سے ہم مغلوب ہو جائیں گے

اس وقت راجا مہندر پرتاب بھی آگئے تھے تو مولانا نے وہ پرانی باتیں بتلا کر راجا مہندر پرتاب کو امیر امان کے دربار میں حاضر کیا اور کہا کہ یہ شخص اور ہمارے طالب علم روس کو بھیجے جائیں تاکہ سوویٹ روس سے امداد طلب کریں۔ تو راجا مہندر پرتاب، ظفر حسن اور چند طالب علم امیر امان اللہ کا خط، اور پریسیڈنٹ گورنمنٹ موقتۂ ہند (یعنی مولانا عبیداللہ سندھی) کا خط لے کر روانہ ہوئے۔ اس وقت سوویٹ روس اور برطانیہ کے درمیان صلح نہ ہوئی تھی۔ تو یہ وفد تاشقند گیا۔ اور تاشقند ہی ہندوستانی پروپیگنڈے کا مرکز تھا، جس کا سارا کام رائے بیندرابن کے حوالے تھا۔ مولانا نے سمجھا دیا تھا کہ تاشقند میں رائے سے ملنا۔ (اس وفد کا سردار راجا مہندر پرتاب تھا)۔ پھر رائے کے ساتھ مل کر ماسکو جانا اور سوویٹ روس کے سپہ سالار ٹرسٹکی سے ملنا۔ ٹرسٹکی کا نظریہ تھا کہ ہندوستان میں بڑے زور شور سے سوویٹ روس کا پروپیگنڈا کیا جائے۔ اس وقت سوویٹ روس کا وزیر خارجہ چیچرن تھا۔ اس کا بھی ارادہ تھا کہ کسی طرح افغانستان کے راستے سے ہندوستان میں سوویٹ روس کا پروپیگنڈا کیا جائے۔ رائے صاحب اور یہ وفد ٹرسٹکی سے ملا اور اس کو سمجھایا کہ یہی وقت ہے کہ تم امداد دو۔ ٹرسٹکی نے وعدہ کیا کہ اگر وزیر خارجہ چیچرن ہمارا متفق ہوگیا تو ہم افغانستان کو امداد دیں گے۔ حاصل کلام چیچرن بھی متفق ہوگیا۔ پھر وزیر اعظم سوویٹ روس یعنی اسٹالن کے پاس گئے وہ پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ پھر لینن جو پریسیڈنٹ تھا اس سے اجازت لی۔ اس نے وعدہ کیا کہ بوقت ضرورت ایک لاکھ فوج کی امداد افغانستان کو دی جائے گی۔

اس وفد کے افغانستان واپس آنے کے بعد صلح کا وفد محمود طرزی کے ماتحت دہلی بھیجا گیا۔ مگر انگریزوں کو یہ معلوم نہ ہوسکا کہ راجا مہندر پرتاب، جو پہلے حکومتِ موقتۂ ہند کا پریسیڈنٹ تھا، روس سے امداد کا وعدہ لے آیا ہے۔

راجا مہندر پرتاب نے مولانا سندھی سے کہا کہ اگر میرے پاس خرچ ہوتا تو میں ریاست نیپال کو ایسا انگریزوں کے خلاف کر دیتا جیسے آپ نے افغانستان

کو انگریزوں کے خلاف کیا ہے۔ مولانا نے امیر امان خاں سے کہا کہ اس کو خرچ دے دو۔ امان اللہ خاں نے فوراً خرچ دے دیا۔ اور یہ نیپال کو روانہ ہو گیا۔ اور نیپال کی سرحد سے وزیر اعظم نیپال کو اطلاع دی۔

یہ قاعدہ ہے کہ انقلابی لوگ اپنا پورا انقلابی پروگرام شایع نہیں کرتے، اس کا تھوڑا تھوڑا ٹکڑا اپنی جماعت کو دیا جاتا ہے۔ جب ان کو پورا کریں گے تو آگے اُن کو بتایا جائے گا۔ اگر انقلابی پروگرام سارے کا سارا شایع کر دیا جائے تو عام لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا پروگرام یہ تھا! اور اب جب کہ ناکام ہوا ہے تو شایع کر دیا گیا ہے۔

اس لیے قرآن مجید کا پروگرام انقلابی تھا۔ تھوڑا تھوڑا ٹکڑا نازل ہوتا رہا۔ جب کامیاب ہو گیا تو لوگوں پر ظاہر ہوا کہ یہ پروگرام تھا، اب کامیاب ہو گیا ہے۔ اور قریش کے سردار چاہتے تھے کہ سارا پروگرام ہم کو بتایا جائے، تاکہ ہم اس کا ردِ عمل تیار کریں۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں خطبہ ارشاد فرمایا تو جب تک پوری سول اور فوجی طاقت حجاز کے خطبہ پر قائم ہوئی تھی اس وقت تک تھوڑا تھوڑا ٹکڑا پروگرام کا نازل ہوتا رہا۔ اگرچہ حجاز اور ماورائے حجاز پر حکومت کرنے کا پروگرام شامل تھا۔ جب فوجی اور سول حکومت قائم ہو گئی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عملی جماعت تیار کر لی تو اپنی جماعت کو حکم دیا کہ ایسی بین الاقوامی سلطنت سب ملکوں میں قائم کرو اور جیسا میں نے تم کو دستور العمل دیا ہے ویسا ہی قانون سب ملکوں میں رائج کرو۔ اگر بالفرض فوراً اور مجموعاً نازل ہو جاتا تو لوگ سمجھتے کہ یہ پروگرام ناکام ہو گیا۔ اس لیے شایع کر دیا گیا ہے۔

مولانا نے ماسکو میں وزیر خارجہ کو بتا دیا تھا کہ اب میرا پروگرام یہ ہے کہ کانگرس ہند میں رہ کر ہندوستان کی آزادی اور خدمت کرتا ہوں۔ باقی اور ملکوں سے جیسے افغانستان، روس یا ترکی سے آیندہ میرا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ اور یہ بات بھی یورپ وغیرہ میں عام مشہور تھی کہ ہندوستان کو روسی طاقت سے مولوی عبید اللہ آزاد کرانا

چاہتے ہیں۔ اور یہ سب باتیں موقتہ گورنمنٹ ہند میں درج تھیں۔ اس کا پریسیڈنٹ راجا راجہ مہندر پرتاب تھا اور مولانا سندھی وزیرِ اعظم۔

اب یہ سب باتیں جو مشہور تھیں سب میری طرف منسوب تھیں۔ اور وزیرِ خارجہ روس نے کہا کہ اپنا پروگرام شایع کر دو۔ میں نے سوچا اگر میں اپنا پروگرام شایع کرتا ہوں تو مسلمانانِ ہند کو انگریز پیس ڈالیں گے۔ اور سمجھیں گے کہ مسلمانوں کی یہ سازش تھی جب پوری نہ ہوئی تو شایع کر دی گئی۔ اس لیے میں نے تین خط لکھے۔ ایک گاندھی جی کی طرف، دوسرا لالہ لاجپت رائے کی طرف اور تیسرا پنڈت مالوی کی طرف کہ مجھ سے استنبول میں ضرور ملو۔ اِن رازوں کے فاش کرنے کی بڑی تہمت راجا صاحب پر تھی۔ اب ان کی عزت بچانے کے لیے کسی نہ کسی کو تو سامنے آنا تھا۔ یہ خط سادے تھے اور بمبئی کی ٹپال میں بمبئی میں ڈالے گئے تھے۔

جب اِن تینوں کو خط ملے تو اخباروں سے معلوم ہوا کہ وہ احمد آباد میں جمع ہوئے پھر اخباروں میں شایع ہوا کہ لالہ لاجپت رائے سیاحت یورپ پر جانے والے ہیں ارادہ یہ تھا کہ پہلے مصر جائیں گے، پھر فرانس، پھر انگلینڈ، پھر روس، پھر قسطنطنیہ کی سیر کریں گے۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ میری طرف آنا چاہتے ہیں۔ پھر ہم دیکھتے رہے وہ روس پہنچے اور وہاں سے قسطنطنیہ کے سفر کے لیے جہاز پر سوار ہوئے اس جہاز کے استنبول میں آنے کا وقت مقرر تھا۔ ہم استقبال کے لیے بندر پہنچے۔ جہاز سے اترتے ہی پوچھا کہ عبید اللہ سندھی کون ہے۔ میں نے کہا میں ہوں۔ وہ بڑی عزت سے ملے۔

ہم نے استنبول کے ایک بڑے ہوٹل میں ان کو اتارا۔ پھر ان سے باتیں ہونے لگیں۔ ہم لوگوں نے جتنے کام کابل میں کیے تھے یا گورنمنٹ ہند کی مخالفت میں سازشیں کی تھیں سب بیان کر دیں۔ میں نے کہا ہم روسی سلطنت کی طاقت سے ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں، تو لالہ لاجپت رائے کہنے لگے کہ خدا کے لیے ایسا نہ کرنا۔ یہ کمیونسٹ لوگ ہندوستان کو تباہ و برباد کر دیں گے۔ میں نے کہا کیا میں ہندو کا بچہ نہیں اور ہندوستان میرا گھر نہیں۔ میں اپنے گھر کو آگ لگاؤں گا۔ اب کس شخص کو طاقت ہے کہ

مگر وہ یہی کہتے رہے، نہیں ایسا مت کرنا۔ وہ دو چار دن وہاں رہے۔ باقی ایام میں ان سے دوستانہ باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے ایک روز کہا کہ میری والدہ نے مجھ سے کہا کہ اگر میں مرجاؤں تو میرے لیے گائے دان کون کرے گا۔ میں نے ان کو ایک گائے دی اور کہا کہ اپنی حیات ہی میں کسی سکھ یا پنڈت سے یہ دان کرادو۔ لالہ لاجپت رائے آریہ تھا۔ یہ بھی دان پھون کو ناجائز حرکت سمجھتا تھا۔ اس نے بھی ذکر کیا کہ میری والدہ بھی سناتن دھرمی تھی ایک دن رو کر مجھ سے کہا کہ اگر میں مرجاؤں تو میرے بعد کون گائے دان کرے گا؟ لالہ نے کہا کہ میں نے بھی اپنی والدہ کو گائے دیدی کہ اپنی حیات میں دان کردو۔ اسی طرح موافقانہ باتیں ہوتی رہیں۔ پھر استنبول سے رخصت ہو کر سیدھے انگلینڈ چلے گئے۔ وہاں جاکر وزیر اعظم ہند سے تخلیہ میں دو گھنٹہ باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے ان کو ساری سازشیں جو ہم لوگوں نے کی تھیں سنادیں کہ مسلمان ایسے منصوبے کر رہے ہیں۔ ہماری حکومت موقتہ کے پریسیڈنٹ راجہ صاحب تھے۔ میں بھی ایک ہندو کا بچہ تھا۔ اس نے (یعنی وزیر اعظم ہند نے) سمجھ لیا کہ یہ منصوبے ہندوؤں نے بنائے ہیں۔ اب جب ناکام ہوگئے ہیں تو مجھ کو آکر بتاتے ہیں۔ اور اس کا الزام مسلمانوں پر تھوپتے ہیں۔ انھوں نے لالہ لاجپت رائے سے کہا کہ جاؤ ہم نے سمجھ لیا ہے۔

میں دیکھتا رہا کہ گورنمنٹ ہند لالہ لاجپت رائے سے کیا کرتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ لاہور میں پولیس نے لالہ لاجپت رائے کو اتنا مارا کہ وہ زخمی ہو کر مرگیا۔ پھر میں نے اپنا پروگرام استنبول میں شایع کیا جو اردو اور انگریزی تھا۔ ترکی سلطنت نے اس کو دیکھ کر شایع کرنے کی اجازت دیدی۔ پرانے واقعات کی طرف تھوڑے تھوڑے اشارے تھے مگر ساری بات یہ تھی کہ میرا پروگرام یہ ہے کہ ہم ہندوستان کی خدمت کریں گے۔ اور ہمارا مقصد ڈومینین اسٹیٹ ہے جس میں ہر ہر صوبہ آزاد ہوگا اور مرکز میں فیڈریشن قسم کی حکومت ہوگی۔ کچھ مدت تک انگریزی حکومت کے ماتحت رہیں گے۔ اور ہمیشہ کے لیے کامن ویلتھ برطانیہ ہوگی۔ اور بہت مدت تک ہم کو برطانیہ کے زیر سایہ رہنا پڑے گا تاکہ ہم آپس میں ہندو مسلم مناقشات کو رفع کرسکیں۔ جب ہم ہندو مسلمان

محبت سے برادر ہو گئے تو برطانیہ خود بخود ہم کو بالکل آزاد کر دے گی۔ اس سے پہلے اگر ہم آزاد ہو گئے تو ہندو مسلمان آپس میں کٹ مریں گے۔

جب یہ پروگرام شایع ہو چکا تو ہفتہ کے بعد وزیر اعظم انگلینڈ نے کسی جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں میں اب تک مدبر ہیں اور ہمارا ہندوستان کے متعلق پروگرام یہ ہے۔ (انھوں نے ہو بہو وہی الفاظ دُہرائے)۔ اور جب مولانا ۱۹۳۹ء میں کراچی پہنچے، اور کراچی والوں نے جلسہ کر کے خوش آمدید کہنے کی تیاری کی تو مولانا اس جلسہ سے ایک روز پہلے گورنر سندھ سے ملے اور اپنا پروگرام بتایا۔ اور بھی بتایا کہ میرے پروگرام شایع ہونے کے بعد وزیر اعظم انگلستان نے بھی آیندہ ہندوستان کے لیے یہی پروگرام شایع کیا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ میرے پروگرام کو دیکھ کر اُس نے یہ پروگرام بنایا ہے۔ مگر میں اس سے بہت خوش ہوں کہ وزیر اعظم کے خیالات میرے خیالات سے متفق ہو گئے۔ تو گورنر سندھ کراچی نے فرمایا کہ مولانا ہم آپ کی ہر طرح امداد کرنے کے لیے تیار ہیں۔

اِسی قصہ کی طرف مولانا نے اپنی ڈائری میں اشارہ کیا ہے۔ اب ناظرین اندازہ لگائیں کہ مولانا کیسے صائب الرائے تھے۔

جرمن ممبروں کی شکایت:- مفصل ملاقاتوں سے ہمیں معلوم ہوا کہ مشن کے ہندوستانی ممبر اور جرمنی ممبر یک جہتی قائم نہ رکھ سکے۔ جو ایسی سیاسی مہمات کے لیے ضروری ہے۔ ہندوستانی ممبر سارا الزام جرمن ممبروں پر تھوپتے تھے۔ لیکن جرمن ممبر شکایت کرتے تھے کہ برلن اور استنبول میں جو سبز باغ دکھائے گئے، ان کا عشر عشیر بھی یہاں نظر نہیں آتا۔ اس مشن کا مقصد جو بیان کیا جاتا ہے انصاف یہ ہے کہ مشن نے اس کے موافق کوئی تیاری نہیں کی تھی۔

راجا صاحب کو جب میں نے بعض کوتاہیوں سے متنبہ کیا تو فرمایا کہ جرمن چانسلر نے بھی مجھے اس طرف توجہ دلائی تھی اور میرے لیے آسانی پیدا کرنی چاہی تھی، مگر میں نے خلافِ شان سمجھ کر انکار کر دیا۔

یعنی جرمن ممبروں نے ان سے کہا تھا کہ ہمارے جانے سے پہلے آپ لوگوں کو چاہیے

کہ افغانستان پہنچ کر افغانستان کی طاقت کو پوری طور سے سمجھیں۔ اگر ان کو ہتھیار جنگ اور بارود کی ضرورت ہو تو ایسا سمندری بندر تفتیش کر کے اطلاع دیں، کہ ہم ہتھیار اور بارود وہاں اتار دیں اور وہ افغانستان کو پہنچ جائے۔ ایسی تجویز تھی۔ مگر ہندوستانی مشن کا کچھ اور مقصد تھا۔ جس کو مولانا آگے بیان کرتے ہیں۔

ہندوستانی مشن کا مقصد :- جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں فقط اس قدر تھا کہ جرمنی ترکی اتحاد میں اگر افغانستان شمولیت کا قصد کرے تو مالوی جی کا نمایندہ اس سے واقف ہوتا رہے۔ اور جہاں تک ممکن ہو ہندوستان کی سرحد سے اس مصیبت کو ٹالتا رہے۔ اور معاملات میں جو پوزیشن شاہ افغانستان کو حاصل ہو اس میں مہاراجہ نیپال کو شریک کرنے کی کوشش کرے۔ انڈین سوسائٹی برلن نے پوری دانشمندی سے اس ہندو تحریک کو سارے ہندوستان کا رنگ دینے کے لیے مولانا برکت اللہ صاحب کو بھی بڑے اہتمام سے اس میں شریک کیا۔

مولانا برکت اللہ صاحب مرحوم کی شمولیت کو جس قدر ہم بے معنی دکھلا رہے ہیں اس کا مولانا کی شخصیت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ مسلمانوں کی اس غفلت کی سزا ہے جو اپنے آپ کو اقلیت میں فرض کر کے اکثریت کے رحم پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ جب ایک شخص کی ذہنیت میں یہ ٹھونس دیا جائے کہ تم اس تبکدے کی اجازت نہ ہونے کی صورت میں کوئی کام نہیں کر سکتے تو اس شخص کے بے کار ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ میں اپنا مطلب واضح کرنے کے لیے ایک دو مثالیں لکھتا ہوں۔

مولانا حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی اور مولانا ابو الکلام جب اپنا اختیار گاندھی کے سپرد کرتے ہیں تو کیا وہ اپنی قربانیوں سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ یا ڈاکٹر انصاری مختار احمد کو اگر شردھانند کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے تو ان کی محنت نتیجہ خیز ہو سکتی ہے؟ اسی طرح اگر مولانا برکت اللہ مرحوم راجہ صاحب سے اختلاف کر کے اپنا کام جاری نہیں رکھ سکتے تھے تو ان کی ہاں میں ہاں ملانے کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟

"شردھانند نے قید سے نکل کر شدھی کا پروپیگنڈا شروع کیا۔ اور مولانا محمد علی مرحوم

کانگرس سے ناراض ہو کر تبلیغ اسلام میں ہمہ تن مشغول ہو گئے۔ اور تمام مسلمان ان کے متبع ہوئے۔ اب مسلمانوں میں گاندھی کی وہ عزت نہ رہی جو ہونی چاہیے تھی۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ کسی طرح مسلمانوں میں میری عزت قائم رہے، مگر روز بروز درمیانی خلیج وسیع تر ہوتی گئی۔

انقلابی عقل مندوں اور بڑے بڑے دانشمندوں کا خیال ہے کہ شردھانند کو گاندھی کے چیلوں نے قتل کرایا تھا۔ تحقیق کرتی ہے کہ یہ سازش سندھ سے شروع ہوئی۔ گاندھی جی کے ششیش اور چیلوں کو یہ بات بہت ناگوار گزری کہ مہاتما گاندھی کی عزت مسلمانوں میں نہیں رہی اس کا سبب شردھانند کی شدھی تحریک تھی۔ اب مہاتما گاندھی کے چیلے سوچنے لگے کہ اگر شردھانند قتل کر دیا جائے تو شدھی کی تحریک ختم ہو جائے گی۔ جب شدھی کی تحریک نہیں رہے گی تو تبلیغ کی تحریک بھی ختم ہو جائے گی۔ اور پھر ہندو مسلمان متحد ہو کر گاندھی جی کے متبع ہو جائیں گے۔ اس لیے انھوں نے شردھانند کے قتل کرنے کی تجویز سوچی۔ ایک مسلمان کا نام عبدالرشید تھا۔ اس کو لالچ دے کر قتل کرنے کے لیے تیار کیا۔ اُس نے جا کر شردھانند کو قتل کر دیا۔ اگر چاہتے تو اس سے نہایت لطف سے پوچھتے کہ آخر تم کو کس نے اس کے قتل کرنے پر تیار کیا ہے۔ خیر اس کو تو پھانسی ہو گئی۔ ہندوؤں نے یہ قتل مسلمانوں کے سر ڈالا۔ مگر آریہ سماج اور ہندو مہاسبھا کے دانشمند لوگ اس کا سراغ لگاتے رہے۔ بہت مدت کے بعد ان کو معلوم ہوا کہ شردھانند کے قتل کی تدبیر گاندھی جی کے چیلوں نے کی تھی۔ تو آریہ سماج اور مہاسبھا کے لوگ انتقام کے لیے گاندھی جی کے پیچھے لگے رہے۔ آخر جب اُن کو موقع ملا تو گاندھی جی کو بھی قتل کر دیا۔ گاندھی جی کا قاتل ایک ہندو .... تھا جو ہندو مہاسبھا کا ممبر تھا۔ اب اس طرح یہ سوال ختم ہو گیا۔

یہ راجا صاحب کی جدوجہد کا نتیجہ نکلا جو اس نے سوئٹزرلینڈ میں بیٹھ کر کی تھی جس سے دو نامور اشخاص محب وطن برباد ہو گئے۔ ہمیشہ غلط سیاسی حرکتوں کا یہی بھیانک نتیجہ ہوتا ہے۔ انقلابیوں کی یہ رائے سچ ہے یا جھوٹ ہے اس کی تفتیش

اب کرنی چاہیے، تاکہ حقیقت معلوم ہو۔ اگر جھوٹ ہے تو صاف تحریر کرنا چاہیے کہ انقلابیوں کا یہ یقین ہے۔

افغانستان اور ہندوستان کے درمیان لڑائی تین دن تک رہی تھی اس کے بعد معاہدہ ہوا۔ اور ایک وفد گورنمنٹ افغانستان کا صلح کے شرائط طے کرنے کے لئے دہلی آیا۔ یہ جنگ دراصل مولانا سندھی کے اشارے پر ہوئی تھی۔ اور جب صلح کا وفد روانہ ہوا تو مولانا نے سمجھ لیا کہ اب انگریز اپنی شرطوں سے ہندوستان کو کھا جائیں گے تو ایک وفد جس میں راجا مہندر پرتاب بھی تھا روس کو بھیجا کہ ہماری مدد کرو۔ اور اس وفد کے ساتھ اپنے آدمی بھیجے۔ جیسے ظفر حسن تاشقند میں این۔ را (جو ہندوستان میں روس کے پروپیگنڈے کا سردار تھا) کے پاس پہنچا۔ این۔ را کو ساتھ لے کر وزیر خارجہ روس جو اس وقت چیچرن تھا اور سارے روس کا سپہ سالار ٹرٹسکی تھا، اس کے پاس گیا، کہ اگر آپ ہماری مدد کریں گے تو افغانستان کا لشکر آپ کے ساتھ ہوگا۔ اور آپ کو یہ رعائتیں دیں گے جو آگے لکھ آئے ہیں۔ یعنی شمال مغربی ہندوستان پر قبضہ کریں۔ اور یہ رعائتیں بہت تھیں۔ اس لیے چیچرن اور ٹرٹسکی کی مصالحت سے روس نے ایک لاکھ فوج دینی منظور کی۔

باب سوم

جنود اللہ کا قیام:۔ جب ہم سردار نائب السلطنت سے مل چکے تو وہ ہندوستانی تعلیم یافتہ نوجوان جو لاہور سے یاغستان ہو کر کابل اس ارادے سے پہنچے تھے کہ ترکی جا کر وہ جنگ میں شریک ہوں گے لیکن کابل میں روک دیے گئے تھے۔ انھیں پولیس کی حراست سے ہم نے آزاد کرادیا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۶ء جنوری کا ہے۔ اور ان کے رہنے کے لیے وہی گھر تجویز ہوا جس میں ہم رہتے تھے۔ ہماری خواہش تھی کہ وہ ترکی جانے کا خیال چھوڑ دیں اور کابل میں ہمارے ساتھ رہ کر حکومت کی مصلحت جس قدر اجازت دیتی ہو اسی قدر کام میں مصروف رہیں۔ وہ جب لاہور سے نکلے تھے تو منظم شکل میں سفر کر رہے تھے مگر لاہوری نوجوانوں کے ساتھ چند نوجوان پشاوری بھی شامل ہو گئے اور ان میں اختلاف شروع ہو گیا۔ بے کاری میں آہستہ آہستہ لاہور کی جماعت کے افراد میں بھی کسی قدر اختلاف ہونے لگا۔ ہم کو جب یہ حقیقت معلوم ہوئی تو ہم نے ان میں ان کے پرانے نظام

کو تازہ کرنے کی کوشش کی اور ایک نوجوان عبد الباری (بی۔اے) جماعت کا صدر منتخب ہوا۔ ہمارا تعلق اس جماعت سے اسی رئیس کے توسط سے تھا۔ چونکہ ہندوستان کی ایک جماعت سیاسی سازش کے الزام میں محبوس تھی اور وہ لوگ افغانستان کے محکمۂ تعلیمات سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ہم افغانستان میں دلچسپ کام بھی جاری نہیں کر سکتے تھے لیکن جب یہ نوجوان ہمارے ساتھ رہنے لگے تو ہمیں دہلی کے نظارت المعارف کا سا لطف آنے لگا۔ ان کے متعلق ہمیں کسی احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ اس جماعت میں کم از کم دس آدمی ایسے تھے جو تین سال سے زیادہ کالج میں پڑھ چکے تھے۔ ہم نے انھیں لوگوں کو علیحدہ کر لیا۔ اور کسی قدر مذہبی اور عام سیاسی اصولوں پر ان سے مذاکرات ہونے لگے۔ اس میں شیخ محمد ابراہیم خاں اور محمد علی قصوری بھی شریک تھے۔ اس عرصے میں ہمارے بعض دوست دیوبند سے بھی پہنچ گئے۔ جن میں سے مولانا منصور انصاری جمعیت الانصار میں میرے ساتھ رہ کر کام کر چکے تھے۔ اور مولانا سیف الرحمٰن دہلی سے یاغستان ہوتے ہوئے کابل پہنچے۔ مولانا سیف الرحمٰن اصل میں قندھاری افغان ہیں۔ ان کے آبا و اجداد پشاور میں رہنے لگے تھے۔ انھوں نے مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی سے حدیث پڑھی تھی۔ اور زیادہ عرصہ تک ٹونک میں پڑھاتے رہے۔ آخر میں دہلی کے مدرسہ فتح پوری کے مدرس اول تھے۔

(نظارت المعارف قرآنی کے شروع ہونے کے دوسرے سال مولانا شیخ الہند دہلی میں آئے اور مولانا سیف الرحمٰن کو یاغستان کی طرف جانے کا حکم دیا، تاکہ افغانوں میں جہاد کی روح تازہ کریں۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ قدس سرہٗ کے مشورہ سے مولانا سیف الرحمٰن نے یاغستان کی طرف ہجرت کی اور حاجی ترنگ زئی کی معیت میں کچھ عرصہ یاغستان کے جہاد میں شریک رہے۔ پھر کابل تشریف لائے۔ یہ واقعہ بھی یاد رہے کہ:۔

حضرت مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا محمد اسماعیل شہید اور مولوی عبد الحی تقریباً دو ہزار آدمی کی جماعت دہلی سے لے کر جودھپور ہوتے ہوئے عمر کوٹ کے راستے

حیدر آباد سندھ اور پیر پگارا پہنچے تھے۔ پیر پگارا کی گدی پر اس وقت صبغۃ اللہ تھے۔ جماعت کا خیال تھا کہ بولان کے درّے سے گزر کر قندھار ہوتے ہوئے کابل جانا چاہیے۔ پھر کابل اور بخارا کے بادشاہوں کو متحد کر کے پنجاب میں جو سکھوں نے ظلم کی حکومت بنا رکھی تھی ان سکھوں کو پنجاب سے نکال دیا جائے۔ اس کے بعد دہلی پر حملہ کیا جائے۔ دوسری جماعت سوئی کے مقام پر آئی جو تعلقہ اوباڑا میں ہے۔ سوئی میں سید حسن شاہ جیلانی تھے جو اصل باشندہ پنجاب، ضلع جھنگ کے تھے۔ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے شاگرد تھے مگر وہ طریقت سیکھنے کے لیے پیر محمد راشد شاہ کی خدمت میں، جو اس وقت رد ہڑی کے قریب رہتے تھے، آئے تھے۔

اس وقت سید محمد راشد شاہ، جن کو سندھ کے لوگ پیر صاحب روضہ والا کہتے ہیں، فوت ہو چکے تھے۔ وہ قادری طریقہ کے بزرگ تھے۔ ان کے خلفاء ملتان سے لے کر مکران تک پھیلے ہوئے تھے اور کوئٹہ بلوچستان سے لے کر کاٹھیاواڑ تک تھے۔ وہ بڑے صاحبِ ارشاد تھے۔ انھوں نے شرک و بدعت نکالنے کے لیے بڑا اجہاد کیا تھا۔ توحید پرست تھے۔ اگرچہ انھوں نے شاہ ولی اللہ صاحب جیسے علماء سے استفادہ نہیں کیا تھا، مگر بڑے محدث تھے۔ فوت ہونے کے بعد ان کے بڑے بیٹے صبغۃ اللہ شاہ سجادہ نشین ہوئے۔ یہ بھی بڑے عالم اور محدث تھے اور طریقت کے امام تھے۔

سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل کی وہ جماعت جو بھنڈا اور جودھپور کی طرف سے آئی تھی اس کو سید حسن شاہ جیلانی اپنے ساتھ لے کر پیر صبغۃ اللہ صاحب کے پاس آئے۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ آپ کابل کیوں جاتے ہیں۔ یہاں میرا لشکر تقریباً چار لاکھ موجود ہے۔ جو میرے خاص مرید ہیں۔ اور باقی بلوچستان کے لوگ آپ کے ساتھ شریک ہو جائیں گے اس لیے چاہیے کہ یہیں سندھ سے سکھوں پر حملہ کر دیا جائے۔ اور میر صاحبان جو والیِ سندھ ہیں اور نواب بھاولپور بھی ہمارے ساتھ شریک ہو جائیں گے۔ اتنی بڑی طاقت کے مقابلے کی ہمت سکھوں میں نہیں ہے۔

مگر سید احمد صاحب بریلوی اور ان کے رفقاء نے کہا کہ افغانستان کے بادشاہ کو

سکھوں پر حملہ کرنے کی تجویز ہمارے امام شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے مقرر کی تھی۔ اس لیے ہم کابل جائیں گے۔ آخر وہ دو تین مہینے درگاہ پیر صبغۃ اللہ شاہ صاحب پر رہے۔ اور انھوں نے پیر صاحب سے عرض کیا کہ آپ اپنے مریدوں کو جہاد کے لیے تیار کریں اور ان میں سرفروشی کا جذبہ پیدا کریں اور اپنی جماعت میں ایک پارٹی مضبوط ارادے والی تیار کریں۔ جب ہم کابل کے بادشاہ کو لے کر جو اس وقت دوست محمد تھے پشاور پر حملہ کریں تو آپ سندھ سے جہاد شروع کر دیں۔ اور اگر تقدیر الٰہی سے ہم جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جائیں تو آپ ہی مسلمانوں کے امام ہیں۔

پھر پیر صاحب نے حروں کی جماعت تیار کی اور اپنی جماعت میں جہاد کا جذبہ پیدا کیا۔ جب سید احمد بریلوی کی جماعت کابل جانے کے لیے پیر صاحب سے رخصت ہونے لگی تو پیر صاحب نے فرمایا کہ مجاہدین کی عورتوں کو یہاں ہمارے پاس رہنے دو۔ چنانچہ سید احمد بریلوی نے ایک بیوی اور دیگر مجاہدین نے بھی اپنے حرم کو پیر صاحب کی درگاہ میں چھوڑ دیا۔ پیر صاحب صبغۃ اللہ شاہ نے اپنے چھوٹے بھائی پیر محمد یاسین رحمۃ اللہ علیہ کو حکم دیا کہ مجاہدین کی اولاد کی خدمت کرتے رہیں۔ پھر سید احمد بریلوی اور ان کی جماعت بولان کے درّے سے ہوتی ہوئی قندھار اور وہاں سے کابل پہنچی۔ وہ لوگ ایک سال وہاں رہے اور کوشش کرتے رہے کہ افغانستان کے بادشاہ اور بخارا کے بادشاہ آپس میں اتحاد کر کے ہندوستان پر حملہ کریں۔ مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ مجبوراً وہ اپنا لشکر لے کر صوبہ سرحد میں وارد ہوئے اور پشاور پر حملہ کر دیا۔ ان کے متعلق تفصیلات دوسری کتابوں میں موجود ہیں۔

غرض کہ جب سید احمد بریلوی اور محمد اسمٰعیل دہلوی نے بالاکوٹ میں شہادت پائی تو پیر صبغۃ اللہ شاہ نے ان مرحومین کے اہل و عیال کو ان کے گھر پہنچا دیا۔ اور اس کے بعد جہاد کی تیاری کر دی۔ مگر یہ تیاری کرتے کرتے فوت ہو گئے۔ پھر ان کی جگہ ان کے بڑے بیٹے علی گوہر شاہ سجادہ نشین ہوئے۔ مگر اس وقت تک سندھ پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ انھوں نے بھی انگریزوں کو نکالنے کے لیے ۱۸۵۷ء میں

کوشش کی تھی مگر ناکامی ہوئی۔ اس ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ سید علی گوہر شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے میر علی مراد (والیِ ریاست خیرپور میرس) کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا تھا۔ اور شرائط میں یہ تھا کہ میر علی مراد کی ریاست بعد فتح سندھ کے قائم رکھی جائے گی۔ اور باقی سندھ اور بلوچستان پر حکومت حضرت پیر صاحب کی ہوگی۔ لیکن وہ عہد نامہ میر علی مراد نے کراچی جاکر انگریز نپیر (Napier) کو دکھلا دیا۔ یہ قصہ مشہور ہے۔

سید علی گوہر شاہ کے بعد ان کے بڑے بیٹے سید حزب اللہ شاہ سخی مسند نشین ہوئے۔ یہ بھی کچھ نہ کچھ انگریزوں کی مخالفت کرتے رہے۔ ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے پیر علی گوہر شاہ مسند نشین ہوئے لیکن یہ بیمار تھے اور تھوڑے دنوں کے بعد فوت ہو گئے۔ پھر ان کے بڑے بھائی سید پیر علی مردان شاہ مسند نشین ہوئے ان کی مسند نشینی کے ایام میں بچو اور پیرو جو ان کے مریدوں اور احرار جماعت میں سے تھے انھوں نے بغاوت کی۔ پیر علی مردان شاہ کے فوت ہونے پر ان کے بیٹے سید پیر صبغۃ اللہ شاہ ثانی مسند نشین ہوئے۔ ان کے خیالات اپنے دادا صبغۃ اللہ شاہ سے ملتے جلتے تھے۔ چنانچہ حربِ عمومی ۱۹۳۹ء میں انھوں نے بھی جہاد کے لیے کوشش کی۔ اور ان کی جماعت انگریزوں سے لڑ گئی۔ انگریزوں نے اُن کو گرفتار کر کے شہید کر دیا۔ اور ان کی جماعت کو بھی قید کر دیا۔ اور انگریزوں نے اعلان کیا کہ "ہم نے سید احمد بریلوی کی ایک جماعت صادق پوری کو ختم کر دیا تھا۔ اب اُن کی دوسری جماعت جو سندھ میں موجود تھی اور جو امام سید صبغۃ اللہ شاہ اول نے تیار کی تھی اس جماعت کو بھی ہم نے برباد کر دیا۔" لیکن ؎ :-

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

سید احمد بریلوی اور ان کے رفقا بالاکوٹ کی جنگ میں شہید ہو گئے اور اُن کی جماعت میں افراتفری پھیل گئی۔ اسی جماعت میں سے ولایت علی شاہ صادق پوری بھی تھے۔ مگر وہ بالاکوٹ کے معرکہ میں موجود نہ تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ سید احمد بریلوی

مہدی موعود تھے۔ وہ نہ مرے ہیں اور نہ شہید ہوئے ہیں بلکہ مخفی ہو گئے ہیں۔ واپس آکر پھر جہاد کریں گے اور ملک سے کفر کو نکالیں گے۔ اُن کی جماعت والے اسی اعتقاد کے لوگ اب بھی یاغستان میں اپنے مہدیِ موعود کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ اور وہاں ولایت علی شاہ کی اولاد میں سے سردار ہوتے آئے ہیں۔

حضرت مولانا سندھی اپنی ڈائری میں ان کا کچھ احوال لکھتے ہیں۔ اہلِ حدیث لوگ جو حضرت مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کی طرح غیر مقلدی ہیں۔ اور ہندوستان اور بنگال وغیرہ علاقے میں تھے اس جماعتِ مہاجرین کی مالی امداد کرتے رہتے تھے اب اس جماعت کا مولانا اپنی ڈائری میں ذکر کرتے ہیں۔

مرحد میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی حضرت مولانا اسمٰعیل شہید کے خاص شاگردوں میں سے ہیں۔ حضرت سید احمد بریلوی صاحب کے ساتھ ہجرت کی۔ ان کو کابل میں سفارت کے کام پر حضرت سید صاحب نے مقرر کیا تھا۔ اس کے بعد مولانا محمد اسحاق صاحب محدث دہلوی کے ماتحت ہندوستان میں داعی بنا کر بھیجے گئے۔ (یعنی جہاد کی اور جہاد کے لیے مالی امداد کے لیے اور اسلامی نمونے پر رہنے کی یہ دعوت دیتے رہے۔ ایسے آدمی کو اسلامی شریعت میں داعی کہا جاتا ہے) حیدر آباد دکن اور بنگال میں کام کرتے رہے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد سنہ ۱۲۴۸ھ میں انھوں نے اپنی مستقل جماعت قائم کرلی۔ سنہ ۱۲۰۰ھ میں حجاز، یمن اور نجد کا سفر کیا۔ سنہ ۱۲۶۲ھ میں مشرقی افغانستان (صوبہ سرحد) میں تشریف لائے۔ مولانا ولایت علی مرحوم سید صاحب کی شہادت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ سید صاحب زندہ ہیں۔ واپس ظاہر ہو کر پھر جہاد کریں گے۔ چنانچہ ان کے انتظار میں بیٹھنے والی ایک جماعت قائم کی۔ ان کے بھائی مولانا مولوی عنایت علی صاحب اس خیال کے مخالف تھے۔ اس لیے جماعت میں منتظرین اور مخالفین دونوں فریق ملتے تھے۔ ان مجاہدین کی امامت مولانا ولایت علی کے خاندان میں منحصر ہو گئی۔ ہم جب کابل پہنچے تھے ان کے وکیل مولانا محمد بشیر (اصل نام مولانا عبد الرحیم) جو لاہور کی اہلِ حدیث جماعت

کے معزز کارکن تھے۔ اور ہجرت کر کے مجاہدین کی جماعت کے ساتھ رہتے تھے۔ اور نوجوانوں کی ہجرت میں ان کا خاص کام تھا۔ وہ بھی اپنی جماعت کے فرائض انجام دینے کے لیے کابل پہنچے۔ ان لوگوں کے مشورے سے ہم نے کام کرنے والوں کی ایک جماعت بنائی۔ جسے جنود اللہ کہا جاتا ہے۔ اس میں اگر عسکریت تھی تو اس قدر جتنی سالویشن آرمی میں موجود ہے۔ اس نظام سے ہم نوجوانوں کی باہمی رقابتوں کو دُور کر سکے اور انھیں مغرور طالب علموں کے گروہ نام سے نجات دلانے میں کامیاب ہوئے۔ سرحد میں حاجی ترنگ زئی کے آنے پر افغانی مجاہدین کی ایک جماعت پیدا ہو گئی۔ حاجی ترنگ زئی چونکہ حضرت شیخ الہند کے خاص دوستوں میں سے تھے اور ان کے ساتھیوں میں سے بہت سے لوگ دیوبند کے پڑھے ہوئے تھے۔ اس لیے جب اُن کے وکلا کابل آئے تو وہ بھی جنود اللہ میں شامل ہو گئے۔

حکومتِ موقتۂ ہند :- ہندوستانی مشن کو اپنے مطلب میں کامیابی نہ ہوئی اور اعلیٰ حضرت اپنے ملک کو جنگ میں ڈھکیلنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ انگریزوں سے انھیں بہت کچھ مراعات کی توقع تھی۔ اس کے مقابل فریقِ ثانی (یعنی ترک اور جرمن) کوئی تسلی بخش پروگرام نہ بنا سکا۔ اور ممبروں کا اختلاف سونے پر سہاگے کا کام دے گیا۔ (ہندوستانی مشن کے ممبروں نے ترکوں اور جرمنوں کو ایسا دلاسا دیا تھا کہ افغان اور صوبہ سرحد ہر طرح سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہے۔ لیکن وہاں کابل میں آ کر دیکھا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ ہندوستانی ممبروں کے پاس جنگی نقشہ تھا۔ اور نہ وہ ایسا موقع بتلا سکے کہ وہاں سے جرمن سلطنت صوبہ سرحد یا افغانستان کو جنگی ہتھیار بھیج سکے۔ بلکہ ہندوستانی مشن کے ممبروں کو بلوچستان کا جغرافیہ اور صوبہ سرحد کی بھی کچھ حقیقت معلوم نہ تھی۔ چنانچہ کابل میں جرمن کیپٹن نے ان سے پوچھا کہ افغانستان جنگ میں نہیں شامل ہو سکتا تو بتاؤ کہ صوبہ سرحد کو ہم کس طرح جنگ پر تیار کریں۔ اور ان کو جنگی سامان بھیجیں۔ ہندوستانی ممبروں نے نہ کبھی بلوچستان دیکھا تھا اور نہ صوبہ سرحد کی سیر کی تھی۔ نہ کسی آدمی کو پہچانتے تھے۔ اس لیے جرمن کیپٹن اور ترکی کیپٹن ان سے ناراض ہو گئے۔

کہ یہ لوگ ہم کو دھوکا دے کر لائے ہیں۔

ہمارا خیال ہے کہ مستقبل ہند کے متعلق ہمارے نظریات چونکہ ہندوستانی مشن کے ممبروں سے پورے نہیں ملتے تھے اس لیے بھی ہمیں افغانی دربار میں جلدی بڑھنے کا موقع مل گیا۔ حکومتِ افغانستان نے مشن کے جملہ ممبروں کو بلا کر آخری جواب دینے سے پہلے ہمیں ان سے ملنے کے سامان بہم پہنچائے جس سے ان کے خواب کو مختلف تعبیرات سے پریشان کرنے کی کوشش کی گئی۔

مشن کی جو گفتگو اعلیٰ حضرت سے ہوتی تھی وہ حرف بحرف برٹش کونسل کے ذریعہ وائسرائے ہند کو بھیج دی جاتی تھی۔ اس کے معاوضہ میں افغانستان کی حکومت کو کافی روپیہ انگریزوں سے مل جاتا تھا۔ اور وہ اعلیٰ حضرت کے لیے بھیجا جاتا تھا۔ اس طرح اُن کی سالانہ گرانٹ میں مستقل اضافہ ہو گیا۔ البتہ سردار نصراللہ خاں نائب السلطنت کی صدارت میں جو باتیں ہوتی تھیں وہ محفوظ رہتی تھیں، اور ان سے افغانستانی گورنمنٹ اپنی ترقی کے لیے راستہ سوچتی تھی۔ اس قسم کے کاموں سے ایک کام حکومتِ مؤقتہ ہند کا قیام تھا۔

ہم آگے لکھ آئے ہیں کہ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے سردار نصراللہ خان نائب السلطنت کی سرپرستی میں افغانستان اور صوبہ سرحد کے علماء سے بیعت نامے لینے شروع کیے تھے۔ کہتے ہیں کہ ہر ایک بیعت نامہ پر گورنمنٹ ہند دس پاؤنڈ خرچ کرتی تھی۔ (یعنی حکومتِ افغان کو دیتی تھی) گورنمنٹ ہند نے اعلیٰ حضرت کو یہ بھی اطمینان دلایا تھا کہ ان کے بعد ان کے بڑے بیٹے کو ولی عہد تسلیم کریں گے۔ اور یہ سب باتیں جناب نائب السلطنت کو معلوم تھیں۔ اور وہ چاہتے تھے کہ اگر میں افغان کی ولی عہدی سے معزول ہو گیا تو میرے لیے کوئی اور میدان ہونا چاہیے۔ مولانا سندھی نے ان کو بتا دیا تھا کہ اگر افغانی طاقت سے اور صوبہ سرحد کی طاقت سے ماورائے دریائے سندھ پر حملہ کر دیا جائے تو آسانی سے فتح ہو سکتا ہے۔ نائب السلطنت نے نقشہ منگا کر اور سوچ سمجھ کر اطمینان کر لیا تھا۔ اور مولانا سندھی کو اس کام کے لیے تجویزیں سوچنے کے لیے حکم بھی فرمایا تھا۔ لیکن

یہ خیال ضرور تھا کہ اگر ہم ماورائے سندھ پر حملہ کریں تو شاید روس افغانستان پر حملہ کردے۔ اس لیے پہلے اس بات کی تسلی ہو جائے کہ روس کا ارادہ حملہ کرنے کا نہیں۔ اور یہ بات تو ظاہر تھی کہ انگریز جنگ میں ایسے پھنسے ہوئے تھے کہ ان میں قوت مدافعت نہیں رہی تھی۔ ایک طرف ان کا لشکر بصرہ کے راستے سے عراق پر حملہ کر رہا تھا۔ اور دوسری طرف درۂ دانیال پر اپنی طاقت جمع کر رہا تھا۔ اُدھر جاپان جزیرۂ فارموسا فتح کر کے جنگ سے کنارہ کش ہو گیا تھا۔ جاپان کا عجنگ میں شریک ہونا اس خیال سے تھا کہ اگر جرمن کو شکست ہو گی تو جزیرۂ فارموسا ہمارے ہاتھ آئے گا۔ اور آسٹریلیا میں مجھ کو کچھ علاقہ دے دیں گے۔ اس طرح جاپان کی بڑھتی ہوئی مردم شماری کے لیے کچھ جگہ مجھ کو مل جائے گی۔ یا افریقہ کے جرمنی علاقے میں بھی ہم کو کچھ حقوق ..... دیں گے۔ مگر جب جاپان نے جزیرۂ فارموسا پر (جو ہند اور چین کی کلید ہے) قبضہ کر لیا اور اس جزیرے کو ہمیشہ کے لیے اپنا علاقہ بنانے کے لیے بندوبست کرنے لگا، تو برطانیہ نے ایسی آنکھ دکھائی کہ جاپان ناامید ہو گیا۔ اور ان کو معلوم ہو گیا کہ جنگ فتح ہونے کے بعد مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت یورپین سلطنتیں کچھ بھی حصہ ہم کو نہیں دیں گی۔ کیونکہ امریکہ انگریزوں کو مدد دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ امریکہ نہیں چاہتا تھا کہ جاپان کو جو ایک ایشیائی سلطنت ہے غرب الہند کے کسی جزیرے پر یا آسٹریلیا پر کوئی حق حاصل ہو۔ اِن اسباب کی بنا پر جاپان نے جنگ جاری رکھنے کا قصد چھوڑ کر اپنی اندرونی طاقت بڑھانے کی کوشش کی۔

اس سے ظاہر ہے کہ انگریزوں میں اتنی طاقت نہ تھی کہ حملے کی حالت میں ماورائے سندھ کی مدافعت کر سکیں۔ یہ بھی معلوم ہے کہ جب افغانستان نے جنگ چھیڑی تھی تو برطانیہ کے سپاہیوں نے کہہ دیا تھا کہ ہم جنگ نہیں کرتے، ہم تھک گئے ہیں۔ جب جنگ چھڑی تھی اس وقت بھی تھکے ہوئے تھے۔

ہندوستان کی ہندی فوجوں نے جلال آباد یا تھل یا چمن کے محاذ پر بھی لڑائی جاری رکھی تھی۔ اس لیے انگریزوں نے افغانستان سے جلد خلاصی حاصل کرنے کے لیے

صلح کی گفت و شنید شروع کی۔

بہرحال نائب السلطنت یہی چاہتے تھے کہ کسی طرح یہ اطمینان حاصل ہو جائے کہ ماورائے سندھ پر افغانستان حملہ کرے تو روس اس کا تعاقب نہ کرے گا۔ مولانا نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندوستانی مشن اپنی حکومتِ موقتۂ ہند بنائیں۔ چنانچہ یہ تجویز پسند کی گئی۔ اور جرمن اور ترک بھی شامل ہوئے۔

مولانا کی عادت تھی کہ ایسے ایسے بڑے کام اور بڑی بڑی سازشیں اپنی صدارت میں کرتے تھے۔ بلکہ ایسے کاموں میں صدارت اور پریسیڈنٹ کے عہدے افغانوں کو دے دیتے تھے۔ اگر افغانستان کے متعلق کام ہوتا، تو آپ مشورہ دے دیتے تھے اور اگر ہندوستانی کام ہوتا تو جب تک راجہ صاحب رہے ان کو ہی پریسیڈنٹ بنا دیتے تھے، ان کو اب بھی مؤقتۂ ہند کا صدر بنا دیا۔ جب ہندوستانی مشن نے حکومتِ مؤقتۂ ہند بنا دی تو سردار نائب السلطنت نے ان سے کہا کہ آپ روس کی طرف ایک وفد بھیجیں۔ وہ حیران رہ گئے کہ ہم وفد بھیجیں تو لکھیں کیا؟ اس پریشانی میں سخت مبتلا تھے۔ آخر راجا مہندر پرتاپ نے مولانا سے مصالحت کی اور ریں جرمن کیپٹن سے ملا تو اس نے بھی یہی کہا کہ کیا لکھیں؟ میں نے کہا کہ میں آپ کو ایک مسودہ بھیج دوں گا۔ اس مسودہ کا مضمون انگریزی میں منتقل کرکے اور سونے کی تختی پر کندہ کرا کے ایک چاندی کے صندوق میں بند کرکے روس کو بھیجو۔

فرماتے تھے کہ چونکہ میرے کابل رہنے کے وقت روس اور انگریزوں کے حالات کا وسیع علم حاصل ہو گیا تھا۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ روس کو جنگ میں مسلسل شکستیں ہو رہی ہیں اس لیے میں نے جو مسودہ تیار کیا تھا اس میں زارِ روس کو بڑے بڑے القاب لکھے تھے اور اپنی سچی ہمدردی اس سے ظاہر کی تھی کہ ہماری حکومتِ مؤقتۂ ہند آپ سے سچی ہمدردی رکھتی ہے۔ اور آپ کو صاف بتا دینا چاہتی ہے کہ انگریزوں نے روس کو اس لیے جنگ میں ڈھکیلا ہے کہ سلطنتِ روس کی قوت کم ہو جائے اور ان میں طاقت نہ رہے کہ وہ ایشیا کے علاقے اپنے قبضہ میں رکھ سکے۔ اگر واقعی آپ سے انگریزوں کو ہمدردی

ہوتی تو فلاں فلاں راستوں سے روس کی سلطنت کو اسلحہ، بارود اور فوج کی امداد دیتے
یہ ایسے راستے ہیں کہ انگریز آسانی سے آپ کی امداد کے لیے ہندوستانی فوج بھیج سکتے
تھے اور گولہ بارود بھی ان راستوں سے آسانی سے پہنچا سکتے تھے۔ لیکن اتنی سہولت
کے باوجود انھوں نے آپ کو مدد نہیں دی۔ اس لیے ظاہر ہوا کہ انگریزوں کو آپ سے بغض
وحسد ہے۔ اور آپ کو وہ طاقت ور دیکھنا نہیں چاہتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایسا ہی مضمون
تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ یہ مسودہ بنا کر میں نے نائب السلطنت کو دیا کہ تم مشن کو دو۔ پھر
مشن نے سونے کی تختی پر انگریزی زبان میں کندہ کرایا اور نائب السلطنت کی خدمت
میں پیش کر دیا۔

لطف یہ ہے کہ جب یہ لوگ خط انگریزی ترجمہ کرنے کے لیے بیٹھے تو اعلیٰ درجہ کی
انگریزی شستہ زبان نہ بنا سکتے تھے۔ پھر وہ نوجوان جو ہمارے ساتھ تھے ان کو گھیرنا
شروع کیا۔ لیکن انھوں نے صاف کہہ دیا کہ عبید اللہ سے اجازت لو۔ اس لیے وہ
مجبوراً مجھ سے رجوع ہوئے۔ بالآخر میں نے ایک نوجوان سے جو انگریزی زبان کا بڑا
ماہر تھا وہ خط لکھوایا اور سونے کی تختی پر کندہ کرایا۔ پھر راجا صاحب اور مولوی
برکت اللہ صاحب نے بتایا کہ یہ خط ڈاکٹر متھرا سنگھ روس لے جائے گا۔ لیکن میں
جانتا تھا کہ متھرا سنگھ کٹر ہندو ہے اور اس میں اتنے بڑے کام کی صلاحیت بھی نہیں ہے۔
اس لیے میں نے کہا کہ ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ ایک نوجوان مسلمان بھی ہونا چاہیے۔ لیکن
راجا صاحب نے جو پریسیڈنٹ حکومت مؤقتہ ہند کے تھے میری ترمیم کو پسند نہیں کیا
ان کا خیال تھا کہ کام صرف ہندو کریں۔ اور مسلمان محض مشورے کے لیے شریک کر لیے
جائیں۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ عملی کاموں میں مسلمان بھی شریک رہیں۔ اس پر سخت
مباحثہ ہو گیا۔ اور میں نے صاف کہہ دیا کہ اس مشن کے بھیجنے کا مطلب یہ ہوگا کہ کام ہندو
کرتے ہیں۔ اس مناظرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ سردار نائب السلطنت کے سامنے پیش ہوا
ایسی مجلسوں میں نائب السلطنت کا خاص آدمی بھی شریک رہتا تھا۔ ترک جرمن اور
افغان بھی اس مباحثہ میں شریک ہوئے۔ آخر کار طرفین کی باتیں سن کر ہماری رائے کے

موافق فیصلہ ہوا کہ اس مشن میں ایک مسلمان کا ہونا ضروری ہے۔ پھر ہم نے ان نوجوانوں میں سے ڈاکٹر خوشی محمد کو منتخب کیا۔ اور اس کا نام مرزا محمد علی تجویز کیا گیا۔ گویا وہ ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ دوسرا ممبر قرار پایا۔ راجا صاحب نے ڈاکٹر متھرا سنگھ کو سفر خرچ دیدیا ہم سمجھتے تھے کہ راجہ صاحب پورے مشن کا خرچ دے دیں گے۔ یا شاید جرمن کیپٹن دے گا۔ یا شاید حکومتِ افغانیہ انتظام کر دے گی۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ ہماری ساری زندگی اس طرح گزری کہ روپیہ پیسہ کا کوئی خاص اہتمام نہیں تھا۔ جب ضرورت پیش آئی کسی نہ کسی طرح روپیہ مل جاتا تھا۔ اس طرح سے ہمارے دل میں اپنے پروردگار پر زیادہ اعتماد ہوتا گیا۔

آخر شیخ محمد ابراہیم سے میں نے روپیہ طلب کیا۔ مگر اس نے کچھ انکار سا ظاہر کیا تو میں نے محمد علی قصوری سے ذکر کیا۔ اس نے اپنی دو مہینے کی تنخواہ پیشگی وصول کر کے میرے حوالے کر دی۔ اور اس طرح مرزا محمد علی کا خرچ بھی اللہ کے فضل سے موجود ہو گیا۔ ان ممبروں کے ساتھ دو خادم بھی روانہ کیے گئے۔ محمد علی کا خادم افغان تھا۔ اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کا خادم ایک کابلی سکھ تھا۔ اس مشن کی روانگی سے قبل وہ نائب السلطنت کی خدمت میں پہنچے اور ان سے عرض کیا کہ یہ مشن جس جس منزل پر ٹھہرے وہاں کی پولیس ان کو فوجی سلامی دیتی رہے۔ پھر وہ مشن جب دریائے جیحون پر پہنچے تو وہاں کی فوج سرکاری طور پر اس کو فوجی سلام کرے۔ پھر جب جیحون کے پار جائیں تو وہاں بھی جو افغانستان کے فوجی نمائندے ہوں فوجی سلامی دیں تاکہ اس مشن کا اصل حال روس کے فوجی افسروں پر مشتبہ رہے۔ اور وہ یہ سمجھیں کہ شاید یہ مشن افغانستان کی حکومت نے بھیجا ہے۔ سردار نائب السلطنت نے یہ رائے پسند کی اور اس کی بہت تعریف کی۔

پھر یہ مشن روس کو روانہ ہو گیا۔ ہر ہر جگہ فوجی سلامی دی گئی۔ حتیٰ کہ یہ لوگ دریائے جیحون پر پہنچے۔ دریائے جیحون کے افغانی علاقے پر کافی فوج رہتی تھی۔ اور دو چار افسر روسی بھی وہاں متعین تھے۔ جیحون کی دوسری طرف روسی علاقہ تھا۔ اس پر کافی روسی فوج رہتی تھی، اور دو چار افسر اپنے عملے کے ساتھ افغانی بھی رہتے تھے۔ تاکہ اپنے مفاد کی محافظت کرتے رہیں۔ اور آنے جانے والے کی حقیقت تفتیش کرتے رہیں۔

اگر کسی کو پاسپورٹ دینا ہے تو افغانی افسر دیدے۔ اور افغانی علاقہ میں جو روسی رہتے تھے وہ بھی ایسا ہی کرتے تھے۔ یہ رسمی بات تھی۔ اب جب دریاے جیحون کی افغانی فوج کو خبر ہوئی کہ مشن آنے والا ہے تو سلامی کے لیے تیار ہوگئیں۔ اور ساری فوج نے سلامی دی اور عزت سے ان کو ٹھہرایا۔ روسی افسر دیکھتے رہے۔ ان کو معلوم تھا کہ یہ لوگ تاشقند جائیں گے جہاں روسی گورنر رہتا تھا۔ انھوں نے فوراً گورنر تاشقند کو اطلاع بھیج دی۔ سلامی وغیرہ کا حال بھی لکھ بھیجا۔ اور جب یہ مشن جہاز پر سوار ہوا تو ان کے ساتھ ایک افغانی افسر بھی رہا۔ اور جب وہ جہاز سے اترے تو وہاں کے افغانی افسروں نے بھی سرکاری سلامی دی۔ پھر تو اس مشن کو روسی افسروں نے ٹھہرایا۔ اسی دَوران میں گورنر تاشقند سے ایک دو افسر موٹر پر سوار ہو کر پہنچ گئے۔ اور اس مشن کو عزت و احترام کے ساتھ گورنر تاشقند کے پاس لے گئے۔ یہ مشن تومن سے ہوتا ہوا تاشقند پہنچا اور وہ صندوق گورنر تاشقند کے حوالے کیا۔ اس کی چابی بھی دی۔ صندوق پر مہر لگی ہوئی تھی اس نے مُہر توڑ کر چابی سے کھولا۔ اس صندوق میں ایک تو سونے کی تختی والی کتاب تھی، جو زارِ روس کو بھیجی تھی۔ اس کو اس نے پڑھا اور زارِ روس کو مطلع کیا۔ وہ اس وقت بہت پریشان تھا۔ روسی فوجوں کو شکست ہو رہی تھی۔ زارِ روس جب اس کتاب کے مضموں سے واقف ہوا تو اس نے برطانیہ سے بہت سے مطالبات شروع کر دیے۔ اس کے دل میں بہت سے شکوک برطانیہ سلطنت کے متعلق پیدا ہو گئے۔ اور برطانیہ کو اس مشن کی اطلاع دی کہ یہ مشن دراصل افغانی ہے۔ اور سلطنتِ افغانی روس پر حملہ کرنا چاہتی ہے۔

جب برطانیہ نے اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں سے اس کی حقیقت معلوم کرنی چاہی تو چونکہ اعلیٰ حضرت کو اس کی کچھ بھی حقیقت معلوم نہ تھی اور یہ نہایت خفیہ کارروائی تھی اس لیے اعلیٰ حضرت نے جواب دیا کہ ہم نے نہ کوئی مشن بھیجا، نہ کوئی ایسی کارروائی ہوئی ہے۔ اس لیے برطانیہ اس مشن کو جعلی قرار دیتا تھا۔ لیکن اس کے آمد کی حقیقت گورنر تاشقند نے لکھ بھیجی تھی، کہ افغانی افسران ان کو سلامی دیتے رہے ہیں۔ اس لیے یہ مشن جعلی نہیں۔ بلکہ افغانی حکومت کا مشن ہے۔ اس لیے زارِ روس برطانیہ کی بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اور

افغانی حملہ سے خوفزدہ ہو گیا۔ برطانیہ نے ہندوستان میں تفتیش کی کہ یہاں کوئی حکومت مؤقتہ ہند قائم ہوئی ہے یا کابل میں انقلابی لوگوں نے قائم کی ہے۔ بہت تفتیش اور ممبروں کی تشخیص کرائی مگر صحیح طور پر گورمنٹ برطانیہ نہ سمجھ سکی۔ بہرحال زارِ روس اور برطانیہ آپس میں گفتگو کرتے رہے۔ بالآخر زار نے اس مشن کے ممبروں کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ مگر گورنر تاشقند کو یقین تھا کہ یہ مشن افغانی ہے اور یہ کہ اگر میں اس مشن کے ممبروں کو گرفتار کروں گا تو افغانستان فوراً حملہ کر دے گا۔ اس لیے گورنر تاشقند نے مشن کے ان ممبروں کو گرفتار نہ کیا اور اپنی فوجوں کی حفاظت میں واپس جیجون جانے کا حکم صادر فرمایا۔ ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ اگر افسر افغانی ان کو فوجی سلامی نہ دیں تو پھر ان کو گرفتار کر کے واپس لانا اور اگر فوجی افسر سلامی دیں تو ان کو آزاد کر دینا۔ چنانچہ جب یہ مشن جیجون بند پر پہنچا جو روس کے قبضہ میں تھا تو جو افغانی افسر وہاں رہتے تھے انھوں نے بڑے احترام کے ساتھ فوجی سلامی دی۔ پھر جہاز پر سوار ہو کر جب افغانی حدود میں اترے تو ساری فوج نے سلامی دی۔ ان کے ساتھ روسی افسر بھی جہاز کے ساتھ تھا۔ وہ دیکھ کر دہشت ناک ہو گیا اور گورنر تاشقند کو لکھا کہ آپ نے بڑی دانشمندی کی ہے کہ ان کو گرفتار نہیں کیا۔ ورنہ فوراً حملہ ہو جاتا۔ اتفاق کی یہ بات تھی کہ جس روز جہاز پر سے یہ لوگ اترے اسی روز افغانی فوج بدلی ہو کر کابل جانے والی تھی اور دوسری فوج کابل سے آچکی تھی۔ اس طرح قریب چار ہزار آدمیوں نے مل کر سلامی دی تھی۔ یہ سلامی افغانستان کی حدود میں تھی۔ مگر جو روسی افسر ساتھ تھا وہ دیکھتا رہا۔ مشن کے ممبر سلامتی سے کابل پہنچ گئے۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ معمولی عقل والا آدمی تھا وہ اس فوجی سلام کی حقیقت کو بالکل نہ سمجھا۔ اور جو تین چار روز بلکہ ہفتہ بھر گورنر تاشقند نے مشن کو احترام و اعزاز کے ساتھ تاشقند میں ٹھہرا رکھا تھا اس کی حقیقت کو بھی وہ نہ سمجھ سکا۔ مگر ڈاکٹر خوشی محمد عرف مرزا محمد علی نے فوراً سمجھ لیا تھا، اور اُن کو کھٹکا تھا کہ کہیں نظربند نہ کر لیے جائیں۔ واپسی پر نائب السلطنت نے متھرا سنگھ سے دریافت کیا اور اصل راز کے متعلق سوال کیا تو وہ کچھ بھی نہ بتا سکا۔ پھر ڈاکٹر خوشی محمد کو بلایا تو انھوں نے اپنی

ڈائری نکالی اور ہر منزل کی کیفیت اور اصل حقیقت بیان کر دی۔ تاشقند میں چند روز احترام سے رہنے کو انھوں نے نظر بندی سے تعبیر کیا تھا۔ کیونکہ ان پر فوجی دستہ حفاظت کر رہا تھا۔ نائب السلطنت نے فرمایا کہ اگر ہم مولانا سندھی کے مشورے پر عمل نہ کرتے تو ہم کو کچھ حقیقت معلوم نہ ہوتی"۔

مولانا سندھی کی عزت پر عین اس وقت انگریزی حکومت نے اخلاقی حملہ کر دیا۔ سندھ میں ایسے پیر رہتے ہیں جن کے خویش و اقارب کا سلسلہ افغانستان کے پیروں سے تھا۔ وہ لوگ مجددی سرہندی ہیں۔ انگریزوں نے ان میں چند معزز لوگوں کو قندھار بھیجا۔ اور قندھار میں جو ان کا خویش رہتا تھا اور بڑا پیر تھا اس کے وسیلے سے وہ لوگ گورنر قندھار سے ملے اور اس کو سمجھایا کہ مولوی عبیداللہ اور اس کے ساتھی سب وہابی ہیں۔ اور وہ افغانی مذہب کو بگاڑنے کے لیے انگریزی جاسوس بن کر ہندوستان سے آئے ہیں۔

قندھار کے گورنر کو انگریزوں نے ان کے جانے سے پہلے لالچ دیا تھا، کہ اگر یہ دو مولوی ہم کو واپس کر دیں تو آپ کو دو لاکھ روپیہ دیا جائے گا۔ یہ مولوی فسادی وہابی ہیں۔ مگر ہم قندھار سے نکل کر اس وقت کابل پہنچ چکے تھے۔ پھر گورنر قندھار نے ملا محمد حسن کو بلایا (جن کی سفارش پر ہم لوگوں کی ہجرت منظور ہوئی تھی) اور بہت سخت سُست کہا، اور یہ کہ وہ لوگ در اصل بدمعاش تھے۔ ملا محمد حسن نے بھی پھر اس کو خوب سنایا۔ وہ فرماتے تھے کہ گورنر قندھار جب میری مسجد سے باہر نکلا تو میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ مر جائے گا۔ ملا صاحب نے پھر ایک دو گوسفند ذبح کیے اور دوسرے تیسرے روز غصہ فرو ہوا۔ گورنر جاتے ہی راستے میں بیمار ہو گیا۔ مولوی عبداللہ لغاری کو جب مولانا سندھی نے قندھار بھیجا تو ملا محمد حسن نے یہ قصہ بیان کیا۔

وہ سندھی مجددی پیر جن کا ذکر اوپر آیا ہے قندھار کے پیر کے ساتھ کابل میں نائب السلطنت کے پاس پہنچے اور کہا کہ مولوی عبیداللہ سندھی وہابی ہیں اور ساتھ ہی سرکاری جاسوس بھی ہیں۔ سردار نائب السلطنت نے اُن کو جواب دیا۔ اگر مولانا سندھی

وہابی ہیں تو ادھر افغانستان میں ہندو اور سکھ بھی رہتے ہیں۔ اگر ہمارا مذہب ان سے نہیں بگڑتا تو مولوی عبیداللہ سندھی سے بھی نہیں بگڑ سکتا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ کچھ شکوک نائب السلطنت کے دل میں بیٹھ گئے۔ یہ وہی وقت تھا جب کہ روس سے وہ مشن واپس آیا تھا۔ اور نائب السلطنت کو معلوم ہو گیا تھا کہ اگر ہم ماوراء سندھ پر حملہ کریں گے تو روس ہماری پشت پر حملہ نہیں کرے گا۔ مولانا سندھی نے نائب السلطنت کے آدمی سے کہا کہ نائب السلطنت کو چاہیے کہ اپنا سی۔ آئی۔ ڈی دہلی بھیج کر میری حقیقت تفتیش کرائیں۔ اگر ذرا بھی ثابت ہو جائے کہ میں انگریزوں کا دوست ہوں تو مجھ کو توپ سے اڑا دیں۔ مگر آج کے دن سے ہم آگے کے کام بند کر دیتے ہیں، جب تک کہ صفائی نہ ہو جائے۔ گویا کہ یہ ایام رخصت کے ہیں۔ نائب السلطنت نے ایک بڑے سمجھدار آدمی (سی۔ آئی۔ ڈی) کو ہندوستان بھیجا۔ اس نے جا کر تفتیش کی اور پھر آ کر رپورٹ کی کہ ہندوستان میں اگر انگریزوں کے سخت سے سخت دشمن تھے تو وہ مولانا سندھی اور ان کے استاد مولانا شیخ الہند تھے۔ اور ہندو انقلابی وغیرہ میں سے کوئی بھی انگریزی سلطنت کا اتنا دشمن نہیں ہے۔ پھر نائب السلطنت نے مولانا سندھی کو بلا کر کہا کہ اب صفائی ہو گئی ہے۔ اب کام کرو۔

روسی ہندوستانی مشن:۔ راجا مہندر پرتاب اور مولوی برکت اللہ نے مل کر حکومت مؤقتۂ ہند کی بنیاد ڈالی جس میں بعض جرمن اور ترک بھی شامل ہوئے (حکومتِ موقتۂ ہند کی یہ تجویز دراصل مولانا سندھی کی تھی۔ جس کا بیان ہم آگے لکھ آئے ہیں)۔ اس حکومتِ موقتۂ ہند نے ایک وفد روس گورنمنٹ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ سردار نائب السلطنت نے اِسے منظور کر لیا۔ اس پروگرام پر کام کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی ہندوستانی نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ نوجوان ان کے ساتھ کام کریں۔ مگر یہ لوگ ہماری تنظیم میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس لیے ہم سے براہِ راست باتیں شروع ہوئیں۔ ہماری ابتدائی گفتگو میں ایک افغانی افسر بھی موجود رہتا تھا۔ اور ہمارے تبادلۂ خیالات سے وہ بہت سی ایسی باتوں کو سمجھنے لگا جو پہلے اس کی توجہ جذب نہیں کر سکتی تھیں۔ ہمارے ساتھ ان نوجوانوں کے علاوہ دو سکھ بھی تھے۔

جو سکھ پارٹی کے ممبر تھے۔ اور ہندوستان سے بھاگ کر بلا پاسپورٹ افغانستان میں داخل ہوگئے تھے۔ (یعنی ایک ڈاکٹر متھرا سنگھ اور دوسرا ہرنام سنگھ)۔ وہ بھی پہلے پولیس کی حفاظت میں تھے۔ پھر آزاد ہو کر ہمارے پاس رہنے لگے تھے (دراصل مولانا سندھی کی کوشش اور سفارش سے نائب السلطنت نے ان لوگوں کو آزاد کیا تھا۔) راجہ صاحب کی یہ تجویز تھی کہ ان میں سے ڈاکٹر متھرا سنگھ کو اس روسی مشن میں بھیجا جائے (یعنی سفارتِ روس پر بھیجا جائے)۔ مولانا برکت اللہ مرحوم کی تائید کے بعد دوسرے ممبر (یعنی جرمن اور ترک) اس داخلی مسئلے سے زیادہ دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ اس لیے وہ راجہ صاحب کی رائے سے موافق ہوگئے۔ اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ ایک فیصلہ شدہ صورت میں ظاہر کیا گیا۔ لیکن ہم ڈاکٹر متھرا سنگھ کی عام سیاسی واقفیت سے آگاہ ہو چکے تھے۔ اس میں ترمیم پیش کر دی کہ اس مشن میں ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ ایک نوجوان مسلمان بھی ہونا چاہیے (اس بات کو ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں) راجہ صاحب نے پسند نہیں کیا اور اس پر مباحثہ ہوگیا میرا خیال تھا کہ مسلمانوں کے اشتراک کا یہ مطلب نہیں کہ کام سوچنے والی جماعت میں ایک مغلوب حصہ مسلمانوں کا شامل رہے۔ اور کام کرنے والی طاقت خالص غیر مسلم رہے بلکہ عملی کاموں میں مسلمانوں کی شرکت ضروری ہے۔ اس مناظرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ سردار نائب السلطنت کے سامنے پیش ہوا۔ ترک جرمن افغان بھی اس میں شریک ہوئے۔ طرفین کی باتیں سن کر ہماری رائے کے موافق فیصلہ ہوا۔ ہماری اور راجہ صاحب کی تلخ گفتگو کا یہ آخری حصہ ہے۔ اس کے بعد پھر کبھی اس قسم کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

روسی ہندوستانی مشن کا مسلمان ممبر:۔ ہم نے نوجوانوں کے رئیس سے اس کام کے لیے ایک ممبر مانگا۔ اس نے اپنی جماعت کے پورے مشوروں کے بعد ڈاکٹر خوشی محمد کو منتخب کیا۔ یہ نوجوان جالندھر کا رہنے والا ہے۔ میڈیکل کالج لاہور میں دو سال سے زیادہ تعلیم حاصل کر چکا ہے۔ مذہبی جذبات جیسے نوجوانوں میں ہوتے ہیں، اس میں کسی سے کم نہیں۔ سمجھ دار ہے، ہنس مکھ ہے، نوجوانوں کی ہجرت کی تحریک کا لیڈر رہا ہے۔ اس کا نام مرزا محمد علی تجویز کیا گیا۔ اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کے ساتھ

دوسرا ممبر قرار پایا۔

شیخ محمد ابراہیم جب کابل چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تو اسی مرزا محمد علی کو میں نے اپنا رفیق بنایا۔ میری جس قدر کامیابی افغانستان اور اس کے بعد روس میں مانی جاسکتی ہے اس میں مرزا محمد علی کی محنت و ہمت کا حصہ غالب ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر وہ ہمارے ساتھ نہ مل جاتا تو شاید کوئی بڑا کام نہ کرسکتا۔ خدا نے صحیح اشتراک میں قوت رکھی ہے۔ اجزار کی انفرادی قوت میں اضعافاً مضاعفہ قوت نازل ہوتی ہے "دو دل یک شود بشکند کوہ را"۔ تو اگر دو تین چار کارکن شریک ہو جائیں اور عقلی اصولِ صحیحہ پر شرکت ہو اور عمل و تقسیم فوائد میں عدل ملحوظ رہے تو فقط اتنی طاقت دنیا میں انقلاب پیدا کرنے کے لیے کافی ہے۔ ایک عالمگیر برادری جو قرآن پر ایمان کا دعویٰ رکھتی ہے کیا ان میں سے ایک مختصر جماعت سمجھ دار پیدا نہیں ہو سکتی؟ یقیناً ہو سکتی ہے مگر ان کو قرآن پر غور کرنے کی فرصت کہاں؟ مخالف کے پروپیگنڈے سے مرعوبیت نے انھیں کسی کام کا نہیں چھوڑا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

کابل سے روس کی طرف سفر کرنے سے چند دن پہلے مرزا محمد علی روس کی انقلابی اشتراکی جماعت کا ممبر بن گیا۔ اس کے بعد ہمارا ان کا رسمی اشتراک باقی نہ رہا۔ یعنی مذہبی نقطۂ نظر سے اشتراک باقی نہ رہا۔ فقط دوستی اور محبت ہے وہ ویسی ہی قائم رہی اور رہے گی۔

حکومتِ موقتۂ ہند کے ہندوستانی مشن کا روس کی فوج پر اثر:- جب گورنر نے سونے کی تختی والی کتاب کھول کر پڑھی تھی تو اس کا فوٹو اور اپنے خط کا فوٹو بھی اتارا تھا۔ یہ فوٹو کمیونسٹ انقلابیوں کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کو ایک کتابچہ کی صورت میں چھاپ کے ساری روسی فوج میں تقسیم کیا اور ہر شہر میں بلکہ چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی تقسیم کیا۔ اس سے فوج بڑی متاثر ہوئی اور محاذِ جنگ کو چھوڑ کر ماسکو کی طرف بھاگ گئی۔ عام لوگ بھی ناراض ہو گئے۔ جب برطانیہ کو اطلاع ہوئی تو لارڈ کچنر کو جو اس وقت ساری برطانیہ فوج کا فیلڈ مارشل تھا ماسکو بھیجا تاکہ یہ غلط فہمی دور کرے۔ مگر اس کے جہاز کو تارپیڈو لگا اور

ڈوب گیا۔ لارڈ کچنر بھی مر گیا۔ اور روس میں کمیونسٹوں کا زور ہوتا گیا۔ پھر لینن پریسیڈنٹ ہوا۔ اُس نے زار کو اور زار کے تمام خویش و اقربا کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مولانا سندھی کے برخلاف انگریزوں نے تھوڑا بہت پروٹسٹ کیا۔ اور اس کا اثر مولانا سندھی کے کچھ خلاف بھی پڑا۔ مگر نائب السلطنت نے ان کی ہمت بڑھائی اور کہا کہ اب کام کرنے کا وقت ہے۔ ڈرو مت۔ نائب السلطنت بیعت لینا چاہتے تھے۔ اس لیے انھوں نے افغانی مولویوں اور سرداروں کو پیغام بھیجا کہ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے جو تم سے بیعت نامے لیے ہیں ان سے تقاضا کرو کہ ہندوستان پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ بڑے بڑے سردار افغانستان کے اور بڑے بڑے مشہور علماء اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں کے پاس آئے کہ ہم اب اتنا صبر نہیں کر سکتے۔ اب جنگ کرو۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ میں اب تمام افغانستان کا جرگہ بلاتا ہوں وہ جو فیصلہ کرے گا میں اس پر کاربند ہوں گا اعلیٰ حضرت اور معین السلطنت کو یہ خبر نہ تھی کہ نائب السلطنت نے سارے افغانستان میں آگ بھڑکا دی ہے۔

پھر اعلیٰ حضرت نے افغانستان کے سرداروں اور مولویوں کا بڑا جرگہ بلایا۔ اور اس جرگہ میں تقریر فرمائی اور افغانستان کی جنگی قوت بھی سمجھائی کہ اس میں جنگی قوت نہیں۔ پھر بھی لوگوں سے رائے لی کہ جنگ کریں یا نہ کریں۔ تو سب نے اُٹھ کر یک زبان ہو کر بڑے زور شور سے کہا کہ ضرور جنگ کرو۔ اگر افغانستان کی سلطنت میں طاقت کی کمی ہے تو ہم اس کو پورا کر دیں گے۔ فقط سردار عنایت اللہ خان (معین السلطنت) نے کہا کہ ہم کو جنگ نہیں کرنی چاہیے۔ اعلیٰ حضرت امیر صاحب حیران ہو گئے اور اپنے شاہی حکم سے فرمایا کہ میرا شاہی حکم ہے کہ جنگ نہیں کرنی چاہیے۔

سردار نصر اللہ خاں (نائب السلطنت) کا یہ مظاہرہ اپنے اثر اور رسوخ کے لیے تھا، کہ اندرونی طور سے افغانستان پر میرا اثر ہے۔ اس کے بعد انھوں نے مولانا کو تسلی دی کہ اگر تھوڑا سا لشکر جرمن کا سرحد ایران میں داخل ہو جائے تو ہم اعلانِ جنگ کر دیں گے۔ اس وعدے پر مولانا سندھی نے ریشمی خطوط دے کر شیخ عبد الحق نومسلم کو

ہندوستان بھیجا تھا کہ شیخ عبدالرحیم حیدرآبادی کو پہنچائے۔ اس نے بے ایمانی کر کے حق نواز افغان کو جس کے پاس یہ مسلمان ہوا تھا حوالے کر دیے۔ اور اس نے گورنر پنجاب اوڈ دائر کو دیئے۔ جس سے سندھ اور پنجاب اور دہلی میں گرفتاریاں ہوئیں اور مولانا شیخ الہند کو مکۂ مکرمہ سے گرفتار کر کے مالٹا میں نظر بند کیا۔ اس کا قصہ آگے آئے گا۔ الحمد للہ آج اس قصہ کو ہم نے قلم بند کر دیا۔ اور نوجوانوں کے مطالعہ کے لیے ایک شاہ راہ دکھائی۔

حق نواز کو اس خدمت کے عوض بارہ۱۲ مربع زمین ملی۔ اور خان بہادر کا خطاب ملا۔ ریشمی خطوط بھیجنے سے پہلے دو مشن اور روانہ کیے گئے تھے۔ ایک مشن استنبول کی کی طرف تاکہ استنبول جاکر ترکوں کو سمجھائیں کہ انگریزوں کو شکست دینے کے لیے اچھا محاذ افغانستان ہے۔ افغانستان کے لوگ اب جنگ کے لیے تیار ہیں۔ اس شرط پر کہ افغانستان کی سرحد میں ایک لاکھ فوج پہنچ جائے۔ یہ مشن ترکی کو مولانا کی منشاء کے مطابق بھیجا گیا تھا۔ اس میں دو ممبر تھے ایک عبدالباری بی۔ اے۔ اور دوسرا ڈاکٹر شجاع الدین۔ ان دونوں کو میں نے منتخب کر کے ان کے ساتھ خطوط بھی دیے۔ مگر جب وہ ایران میں داخل ہوئے تو انگریزوں کی فوج اور پولیس جو ایران میں بکھری ہوئی تھی ان کو دیکھ کر سمجھ گئی کہ ہندوستانی معلوم ہوتے ہیں۔ اس شک میں ان کو گرفتار کر لیا۔ مگر انھوں نے وہ خطوط وغیرہ گٹر میں ڈالا یا جلا دیا۔ اپنے پاس کوئی چیز نہ رکھی تاہم ان کو گرفتار کر کے لاہور لائے۔ مسٹر عبدالباری بی۔ اے۔ جو مولانا سندھی کے ساتھ ہر موقع پر ساتھ رہتے تھے۔ اور نوجوانوں کی جماعت کے رئیس تھے۔ وہ سر محمد شفیع کے رشتہ دار نکلے اور سر محمد شفیع نے ان کو معافی مانگنے پر راضی کر لیا۔ انھوں نے تمام واقعات حکومتِ موقتۂ ہند کے اور جنود اللہ اور جماعتِ مجاہدین کے مفصل لکھ دیے۔ اور ڈاکٹر شجاع اللہ نے اس پر دستخط کر دیے۔ اور جو دوسرا مشن جاپان کے لیے تھا اس کے ممبر عبدالقادر بی۔ اے نے بھی دستخط کر دیے۔ مگر انھوں نے حقیقی راز کو اپنے دل میں مخفی رکھا۔ اور ایسا بیان دیا کہ گویا انھوں نے وہ باتیں سنی تھیں۔

دوسرا مشن جو جاپان جارہا تھا روسی علاقہ میں اس کو بھی گرفتار کر لیا تھا۔ اس میں شیخ عبدالقادر بی۔ اے تھے۔ وہ بھی گرفتار کرکے لاہور لائے گئے۔ جب مسٹر عبدالباری نے واقعات مؤقتہ ہند اور جنود اللہ وغیرہ کے لکھ دیئے اور ڈاکٹر شجاع اللہ نے دستخط کر دیے تو مسٹر عبدالباری نے بھی دستخط کر دیے۔ پھر ان کو کئی دن نظر بند رکھ کر مشروط آزادی دے دی گئی۔

مسٹر محمد شفیع کو اس خدمت کی بنا پر گورنمنٹ نے سر کا خطاب دیا۔ دوسرا مشن جاپان کو بھیجا گیا تھا۔ اور وہ مولانا برکت اللہ کی تجویز پر بھیجا گیا تھا۔ کیونکہ مولوی برکت اللہ کا اثر جاپانی انقلابی نوجوانوں پر تھا۔ اس مشن کے ممبر عبدالقادر بی۔ اے اور ڈاکٹر متھرا سنگھ تھے۔ یہ لوگ روس کے راستے جاپان جارہے تھے۔ روسی سلطنت نے ان کو گرفتار کر کے گورنمنٹ کے حوالے کیا۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ پر مقدمہ چلا کر اُسے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ کیونکہ وہ غدار پارٹی کا ممبر تھا۔ بہرحال یہ دونوں مشن ریشمی خطوط بھیجنے سے پہلے بھیجے گئے تھے۔ اور ریشمی خطوط اِن دونوں مشن کے روانہ کرنے کے تقریباً ایک ماہ بعد جولائی ۱۹۱۶ء میں ایک ماہ کے بعد میں نے سمجھ لیا تھا کہ استنبول کا مشن ترکی پہنچ گیا ہوگا۔ اور جاپانی مشن بھی شاید پہنچ گیا ہوگا۔ اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ اطلاع مولانا شیخ الہند کو بھیجی جائے مگر یہ دونوں مشن گرفتار ہوگئے اور ظاہر ہوگیا کہ یہ ساری انقلابی تحریکیں ہندوستانی لوگوں کی ہیں۔ جو کابل میں ہیں۔

حکومتِ ہند نے حکومتِ افغانستان سے جو پروٹسٹ کیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جتنے ہندوستانی لوگ سرکاری ملازم وغیرہ تھے اور مولانا سندھی سے تعلق رکھتے تھے ان کو حکم دیا گیا کہ افغانستان کی سرحد سے باہر نکل جائیں۔ وہ سارے نکالے گئے۔ اس پروٹسٹ کی پوری حقیقت مجھ کو معلوم نہ ہوئی۔ اور میں اور میرے ساتھی (مہاجرین نوجوانوں) کو اس پروٹسٹ کا اثر کچھ محسوس نہ ہوا۔ ہم ویسے ہی آزاد رہے۔ راجہ صاحب بھی موجود تھے۔ تو جب یہ لوگ کابل سے باہر جارہے تھے اسی زمانے میں ہم نے نومسلم شیخ عبدالحق کو ریشمی خطوط دے کر روانہ کیا تھا۔ اور مسٹر اللہ نواز نے بھی اپنے باپ حق نواز کے نام شیخ عبدالحق

نومسلم کے ہاتھ خط دیا۔ شیخ عبد الحق نومسلم پہلے بستی دین پور متصل خانپور ریاست بہاولپور آیا۔ پھر حق نواز خاں کو وہ ریشمی خطوط دیے۔ یہاں یہ یاد رہے کہ جو مشن ترکی اور جاپان جا رہے تھے ان کے بیانات اس سے بہت آگے لیے گئے تھے۔ بہرحال وہ ریشمی خطوط گورنمنٹ کے ہاتھ آگئے۔ اور نتیجہ یہ نکلا کہ حکومتِ ہند نے مولانا سندھی اور ان کے نوجوان رفقاء وغیرہ جو افغانستان کی رعایا بن چکے تھے، ان کے متعلق حکومتِ ہند نے مطالبہ کیا کہ ان کو ہمارے حوالے کر دو۔ مگر اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں جو اپنے آپ کو آزاد افغانستان کا بادشاہ تصور کرتے تھے انھوں نے حکومتِ ہند کو جواب دیا کہ یہ لوگ افغانی گورنمنٹ کی رعایا ہیں۔ اگر انھوں نے حکومتِ برطانیہ کے خلاف سازشیں کی ہیں تو ان کو میں سزائیں دوں گا۔ اور وہ بھی اس لیے کہ برطانیہ میرا وفادار دوست ہے۔ لیکن میں ان لوگوں کو برطانیہ کے حوالے نہیں کرسکتا۔ کیونکہ وہ اب میری رعایا ہیں۔ پھر حکومتِ برطانیہ نے بھی زیادہ زور نہیں دیا۔ تاہم اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ نے مولانا سندھی کو بلوا کر مع رفقاء کے ایک چھوٹی سی کوٹھری میں نظر بند کر دیا۔ اور یہ سب لوگ امیر حبیب اللہ کے آخر زمانے تک نظر بند رہے۔

مرزا محمد علی کے لیے سفر خرچ :- روسی مشن کے واپس آنے کے بعد جرمن اور ترکی ممبروں کو امیر صاحب نے رخصت کر دیا۔ اور پاسپورٹ دے دیا۔ ایران کے راستے سے وہ ترکی چلے گئے۔ اور انگریزوں نے کچھ تعرض نہ کیا۔ کیونکہ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے انگریزوں کو مطلع کر دیا تھا کہ ان سے تعرض نہ کیا جائے۔ انگریز بھی چاہتے تھے کہ اعلیٰ حضرت کو خوش رکھیں۔ روس کی طرف مشن بھیجنے کی تجویز میں ترک اور جرمن شریک تھے۔ مرزا محمد علی کو مشن میں داخل کرنا مولانا سندھی کی سفارش سے تھا۔ اس لیے اس کا خرچ مولانا کو دینا تھا۔ اگرچہ جرمن مشن موجود تھا لیکن اس کے آگے دست دراز کرنا خلافِ مصلحت تھا۔ اور مولانا مرزا محمد علی کا خرچ برداشت کرنا تھا۔ اس لیے کہ مولانا کو تکلیف ہوتی۔

راجہ صاحب نے ڈاکٹر متھرا سنگھ کا سفر خرچ دے دیا۔ ہم سمجھے تھے کہ

راجہ صاحب پورے مشن کا خرچ دے دیں گے۔ یا شاید حکومت افغانیہ انتظام کر دے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ ہماری ساری زندگی اس طرح گزری کہ روپیہ پیسہ کا کوئی شخص خاص اہتمام نہیں کیا کرتا تھا۔ جب ضرورت پیش آئی کسی نہ کسی طرح روپیہ مل گیا۔ اسی طرح سے ہمارے دل میں اپنے پروردگار پر زیادہ اعتماد ہوتا گیا۔ اور اسی کو میں اپنی زندگی کا روشن پہلو شمار کرتا ہوں۔

ہندوستان سے کابل کا سفر بھی اسی قاعدہ پر تھا۔ جب ہم قندھار پہنچے تو ہمارے پاس فقط ایک پاؤنڈ تھا۔ اور جب ہم کوئٹہ سے نکلے تھے تو ہمارے ساتھ سات سو روپیہ تھا۔ اب قندھار میں ہم چار آدمی تھے۔ وہاں ہم ملا محمد حسن صاحب کے مہمان رہے۔ مگر آگے کابل تک سفر کرنے کا خرچ یہی ایک پاؤنڈ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سمجھئے کہ نائب الحکومت نے ہمیں کابل کے سفر کا خرچ دے دیا اور اچھا انتظام کر دیا۔ یعنی پانچ سو روپیہ سرکاری خزانہ سے عطا کیا۔ مگر نائب الحکومت کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ خالی ہاتھ ہیں بلکہ اس کو یقین تھا کہ بڑے کام کے لیے ہندوستان سے آئے ہیں۔ ان کے پاس کافی روپیہ ہوگا۔ اپنی فیاضی دکھانے کے لیے پانچ سو روپیہ بھی عطا کر دیا' تاکہ کابل میں جا کر یہ لوگ ہماری تعریف کرتے رہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ ہم دراصل مہمان سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت کے ہیں۔ اور انھوں نے ان کو ہندوستان سے بلایا ہے۔ ہم نے اپنا حال جب نائب الحکومت قندھار کو بتایا تھا تو یہ کہہ دیا تھا کہ ہم کو سردار معین السلطنت نے بلوایا ہے۔

مگر جب ہم کابل پہنچے تو ایک مہینے میں ہمارا خرچ ختم ہو گیا۔ اور بہت سی رقم تو سفر ہی میں خرچ ہو گئی تھی۔ پھر ایک مہینے کے بعد ہم نے جس قدر کپڑے یا سامانِ ضرورت سفر کا قندھار میں خریدا تھا سب کابل میں نیلام کر دیا یا بیچ ڈالا۔ اس وقت ہندوستان سے ایک دوست نے کچھ روپے بھیجے۔ یعنی مسٹر ابراہیم خاں کے گھر میں وہ روپے پہنچا دیے اور گھر والوں سے چٹھی لکھوا کر ایک افغانی تاجر کے ہاتھ میں دی کہ یہ تین سو روپیہ فلاں شخص نے ہم کو دیا ہے کہ مولانا سندھی کو پہنچا دو۔ آپ اپنی تنخواہ سے

یہ تین سو روپیہ دلوا دیا۔ یعنی ہنڈی تھی۔ تو مسٹر شیخ ابراہیم نے وہ روپیہ ہم کو دے دیا۔

جب روپے ہم کو مل گئے تو ہم کابل کے سرداروں سے ملنے کے قابل کپڑے بنا سکے۔ پھر جب ہم نائب السلطنت سے ملے تو اس نے بطور مہمان کے پانچ سو روپے بھیج دیے تھے۔ ہمارے بعض ساتھی جو ہندوستان کو واپس ہوئے تھے کچھ روپیہ ان کی ضروریات میں صرف ہو گیا۔

جب نائب السلطنت کے مشورے سے حکومت مؤقتہ ہند قائم ہوئی اور روس میں مشن بھیجنے کا فیصلہ ہو چکا تو مولانا کو اپنے ساتھیوں کو اطلاع دینا تھا۔ ان میں قابل ذکر ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ اور کچھ خطوط راجہ مہندر پرتاب کے تھے، جو شردھانند کو دینے تھے۔ اس کی معرفت راجہ صاحب کے دوستوں کو اطلاع دینی تھی۔ پھر آپ نے اپنے ساتھیوں میں سے دو کو بھیج دیا۔ انھوں نے نہایت آہستگی سے کام کیا۔ اور مولانا احمد علی لاہوری کی معرفت جو اس وقت دہلی میں نظارت المعارف میں کام کر رہے تھے ان کے توسط سے خطوط تقسیم ہو گئے۔

میں تو کابل پہنچنے پر پہلے ہی دن سے شیخ محمد ابراہیم خاں کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا تھا۔ مگر اور کسی قسم کی اعانت ہم ان سے نہیں چاہتے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں ہندوستان سے کام کے لیے بہت سا روپیہ لے کر آیا ہوں۔ اور میں اسے مایوس کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اب جبکہ مرزا محمد علی کا خرچ دینا مجھ کو ضروری تھا۔ میں نے شیخ محمد ابراہیم خاں سے روپیہ مانگا۔ مگر اس مرحوم نے اس وقت انکار کر دیا۔ اگرچہ بعد میں ان کا تمام روپیہ اور سب سامان اسی کام میں صرف ہوا۔ اور اپنے فیصلے سے شیخ محمد ابراہیم خاں مرحوم نے یہ سب کام کیا۔ لیکن اس خاص وقت پر ان سے غلطی ہو گئی۔ ان کے دوسرے ساتھی محمد علی قصوری تھے۔ ان کے والد مولوی عبد القادر قصوری سے ہماری ملاقات تھی۔ اور کابل میں محمد علی قصوری سے ہماری سرسری ملاقات ہوئی تھی اور مولوی محمد علی کا تعارف مولانا ابو الکلام نے ہندوستان میں کرا دیا تھا۔ جب مولانا محمد علی قصوری یورپ سے ڈگری لے کر آئے تھے اور دہلی میں ان کو

پارٹی دی گئی تھی تو میں بھی اس پارٹی میں تھا۔ مولانا ابو الکلام نے ہم کو مولانا محمد علی قصوری سے ملایا اور تعارف کرایا تھا۔

مگر وہ شیخ ابراہیم کی طرح کابل میں ہمارے کاموں میں شریک نہیں تھے۔ نہ کسی خاص مشورے میں ہم ان کو بلاتے تھے۔ خاص مشوروں میں فقط شیخ محمد ابراہیم خاں پر ہمارا اعتماد رہتا تھا۔ عام معاملات میں مولوی محمد قصوری صاحب بھی شریک ہوتے تھے۔ جب میں نے شیخ محمد ابراہیم صاحب سے روپیہ مانگا اور انھوں نے انکار کر دیا تو میرے دل پر مایوسی چھاگئی۔ مولوی محمد علی قصوری نے میرے چہرے سے معلوم کیا کہ میں غمگین ہوں تو نہایت مہربانی سے پوچھا کہ آپ آج کیوں ملول ہیں؟ میں نے اپنی حالت مناسب طریقے اور مختصر الفاظ میں ذکر کیا۔ مسٹر محمد علی قصوری صاحب بڑے حساس اور ذکی الطبع تھے۔ ان کے دل میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اپنے والد کی طرح مدد دینے میں دریغ نہ کرتے تھے۔ میری بات سن کر بہت متاثر ہوئے اور انھوں نے جلد ہی اپنی دو ماہ کی تنخواہ پیشگی وصول کر کے ہماری ضروریات پوری کر دیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص انعام تھا۔ ہم مولوی محمد علی قصوری کے بہت ممنون ہوئے۔ ہمارے ہندوستانی مسلمان نوجوانوں میں کام کرنے کا جذبہ دیکھ کر بہت اللہ کا شکر کیا۔ اسی طرح محمد علی قصوری نے جس قدر کابل میں کمایا تھا، وہ سب ہمارے ہندوستانی کاموں میں صرف ہوا۔ جیسے آخر میں شیخ ابراہیم کا تمام اندوختہ ہمارے کاموں میں صرف ہوا۔ جزاک اللہ خیراً۔

ہندوستان کی آزادی میں ان دونوں نوجوانوں نے خصوصاً اور باقی نوجوانوں نے عموماً جو کام کیا ہے ہندوستان کی تاریخ آزادی میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔ ان سب نوجوانوں نے جس خلوص و ایثار سے آزادی ہندوستان میں کام کیا، اس کی مثال اگر تاریخ میں ہے تو وہ مہاجرین و انصارینِ سلف میں ملے گی۔ جب کبھی ہندوستان آزاد ہوگا تو ہمیشہ تاریخ میں ان کے نام عزت کے ساتھ لکھے جائیں گے۔

سیاسی کام فقط نظریات یا عملی تجربات کے مالک ہونے سے نہیں چلتے۔ اس میں کامیابی کے لیے ایک مستعد جماعت اور روپیہ کی بھی ویسی ہی ضرورت ہے، جیسے علم وعمل کی۔ ہندوستان کے مسلمان جس قدر اللہ تعالیٰ کا شکر کریں وہ تھوڑا سمجھا جائے گا کہ ان کے نام سے کابل میں بے سروسامانی سے جو کام شروع ہوا اس میں اُن کے نوجوان بہترین کارکن ثابت ہوئے۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے ہندو نوجوان بھی کام کرتے رہے۔ مگر ان میں اور مسلمان نوجوانوں کے کاموں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے نوجوانوں نے ایسا اعلیٰ درجہ کا کردار ادا کیا جس سے مجھ کو امید اور یقین ہے کہ صرف اِن ہی نوجوانوں کے کاموں سے ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ روپیہ تو محمد علی قصوری اور شیخ ابراہیم کا تھا۔ اور کام باقی نوجوانوں کا تھا۔ وقت پر روپیہ ملتا گیا اور وقت پر نوجوان کام کرتے گئے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہندوستانی قوم کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً ان لوگوں کا نام خاص طور پر یاد رکھنا چاہیئے اور ہمیشہ ان کے حق میں کلماتِ خیر ادا کرنے چاہئیں۔ اگر ہندوستان ان نوجوانوں کی حیات میں آزاد ہو جائے تو کلیدی عہدے ان کے سپرد کرنے چاہئیں۔ یہ میری وصیت ہے۔ اگر ان کی عزت واحترام میں قوم نے قصور کیا تو آئندہ آنے والی نسلیں ان پر لعنت کریں گی کہ جن لوگوں نے آزادی کے لیے اپنے جان ومال کی پروانہ کی، جب بھی ان کو ان کی عزت افزائی سے محروم رکھا گیا؟ اور جن لوگوں نے ایک تولہ بھر زر اور ایک قطرہ خون نہیں بہایا ان کو کیوں کلیدی عہدے دیے گئے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ قوم کو اپنا احترام قائم رکھنے کے لیے ہمیشہ ان نوجوانوں کی اور ان کی اولاد کی عزت کرنا چاہیئے۔

حکومتِ موقتہ ہند میں ہماری شمولیت:۔ راجہ مہندر پرتاب معمولی سمجھ بوجھ کے آدمی تھے اور مولوی برکت اللہ صاحب ہاں میں ہاں ملانے والے تھے۔ مشن جرمنی کی طرف سے ترکی آرہا تھا جس میں یہ لوگ آئے تھے۔ ان میں سمجھ دار آدمی جرمن کیپٹن تھا۔ حکومت موقتہ ہند کی حکومت بنانے کی تجویز مولانا سندھی کے خود کے اختراع میں سے تھی۔ بنڑ دار نائب السلطنت

سے تجویز بیان کی گئی۔ انھوں نے منظور کیا۔ اس کے بعد مولانا سندھی جا کر جرمن کیپٹن کے کان میں پھونک آئے وہ تو ایسی باتیں چاہتا تھا۔ میں نے مشورہ دیا کہ جلدی کام کرو اور راجہ صاحب کو اس کا پریسیڈنٹ بناؤ۔

مولانا کی عادت تھی کہ ایسے بڑے بڑے کاموں کے خود صدر یا پریسیڈنٹ نہیں بنتے تھے۔ جب حکومتِ مؤقتۂ ہند بن گئی اور راجہ صاحب اس کے پریسیڈنٹ بنے اور مولانا برکت اللہ صاحب اور ترک اور جرمن اس کے ممبر بنے، اب کارروائی کے لیے اُن کو آدمی درکار تھے۔ انھوں نے چاہا کہ ہمارے نوجوانوں کو وہ اپنے ساتھ ملائیں۔ مگر ہمارے نوجوان ہماری تنظیم میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس لیے مولانا سے باتیں شروع ہوئیں۔ مگر راجہ صاحب کی اپنی خواہش نہ تھی کہ مولانا سندھی اس میں شریک ہوں۔ کیونکہ کام چلانے کے لیے مولانا کے مشورے ایسے ہوں گے کہ ہمیشہ مجھے ماننے پڑیں گے۔ کیونکہ ان کی ہی اکثریت تھی۔ مگر راجہ صاحب مجبور بھی تھے کہ حکومتِ مؤقتۂ ہند بن بھی گئی اب کریں تو کیا کریں۔ البتہ اتنی بات میں نے جرمن کیپٹن سے کہہ بھی دی تھی کہ روس کی طرف مشن بھیجنا ضروری ہے تاکہ اگر ہم ماورائے سندھ پر حملہ کریں تو وہ ہماری پشت پر حملہ نہ کریں۔ روس کی طاقت کا اندازہ لگانا ضروری ہے۔ اب یہ ایسے بڑے کام تھے کہ راجہ صاحب کا دماغ ان کے سوچنے سے عاجز تھا۔ راجہ صاحب کے بڑے سے بڑے مددگار ڈاکٹر متھرا سنگھ تھے۔ ان کی حقیقت بھی مولانا کو معلوم تھی۔ وہ جوشیلے تھے مگر عقلی طاقت ان میں خس کے برابر بھی نہ تھی۔ ہمارے نوجوانوں کو اگر انصاف سے دیکھا جائے تو راجہ صاحب سے عقل اور صحت میں سو اور ایک کا فرق ہے۔ اس حکومت موقتہ کے بنانے کے بعد راجہ صاحب پریسیڈنٹ ہو گئے۔ اس خوشی میں پھولے نہ سماتے تھے۔ اور حکومتِ مؤقتۂ ہند میں شامل ہونے کے لیے حلفِ وفاداری لیا جاتا تھا۔ جرمن کیپٹن بڑے عقلمند آدمی تھے۔ مگر تھے پولیٹیکل۔ پولیٹیکل کاموں میں چالبازیوں سے کام لیا جاتا ہے۔ اس نے حلف اٹھا لیا۔ اور پھر باقیوں نے بھی باری باری حلفِ وفاداری اٹھایا۔

جرمن ترکی مشن کے افغانستان سے روانہ ہونے سے پہلے ہم نے جرمن ممبروں سے

زیادہ ملنا شروع کر دیا تھا۔ اس میں ہمارے دوست عبدالباری بی۔ اے کی رفاقت ہمارے کام آئی۔ راجہ صاحب نہیں چاہتے تھے کہ جرمن ممبر کسی دوسرے ہندوستانی سے ملیں۔ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ دیکھ کر راجہ صاحب نے ہمیں حکومت مؤقتہ میں شمولیت کی دعوت دی۔ انھیں خیال تھا کہ شاید اس میں شامل ہونا پسند نہ کریں۔ کیونکہ اس کا جس قدر نظام راجہ صاحب اور مولانا برکت اللہ نے تجویز کیا تھا اس میں راجہ صاحب کے نام پر وفاداری کا حلف ضروری تھا۔ مگر میں نہایت مسرت سے اس میں شامل ہو گیا۔ کیونکہ دراصل یہ میری ہی بنائی بات تھی۔ البتہ حلف نامہ تبدیل کر دیا جسے انھوں نے منظور کر لیا۔ اس کے بعد ہندوستانی معاملات میں ہماری گفتگو بیرونی مداخلت سے پاک ہو گئی۔ یعنی ہم صرف ہندوستان کی ہی خدمت کریں گے۔ ابتدا میں حکومتِ مؤقتہ ہند کے تین ممبر رہے (یعنی ایک راجہ صاحب، دوسرے مولانا برکت اللہ صاحب اور تیسرے مولانا سندھی)۔ یہی کام چلاتے رہے۔ اور ان کے سوا باقی لوگ مشورہ دینے والوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ مگر اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ کے زمانے میں جنگ افغانستان کے خاتمہ پر اور ممبر بڑھائے گئے۔ اس میں جماعتِ مجاہدین کے وکیل مولانا بشیر صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ راجہ صاحب بے شمار خوبیوں کے مالک ہیں۔ مگر اپنی شخصی ڈکٹیٹر شپ کا خیال ان کے دماغ پر غالب تھا۔ یوروپین لوگوں سے وہ اُن کی زبان میں باتیں کر لیتے۔ اور ڈیموکریسی (Democracy) کے لکچر دے ڈالتے تھے۔ لیکن ہندوستانی معاملات میں ان کی موروثی خصلت نمایاں رہتی تھی۔ ہم نے بڑے داؤ پیچ سے انھیں راضی کیا کہ حکومتِ مؤقتہ اپنا چارج اس جماعت کو دے دے گی جسے انڈین نیشنل کانگرس نے اس کام کے لیے معین کیا ہو۔ وہ اس کے سوا اور کوئی بات نہیں جانتے تھے کہ کام پریسیڈنٹ کے اختیار میں چھوڑ دینا چاہیے۔ اور وہ لائق پریسیڈنٹ اپنے ہی تجویز کردہ قانون سے مقرر ہو چکے تھے۔

اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کے بادشاہ ہونے کے وقت راجہ صاحب موجود نہ تھے۔

ورنہ اس وقت بہت روڑے اٹکاتے۔

جب پہلی بار راجہ صاحب نے کابل چھوڑا تو حکومت موقتہ ہند کے لیے تین مرکز تجویز ہوئے ایک کابل، دوسرا نیپال اور تیسرا بنگال (شمال مشرق) کابل کے مرکز میں کام ہمیں تفویض ہوا۔

جب روسی مشن واپس آیا۔ اور روس کی حالت کی خبر ہوئی تو اس وقت جرگہ بھی بلایا گیا تھا۔ جرگہ میں اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے سب لوگوں سے پوچھا کہ جنگ میں شریک ہونا چاہیے یا نہیں تو سب سرداروں نے کہا کہ جنگ کرنی چاہیے۔ مگر ایک سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت نے فرمایا کہ ہم کو جنگ نہیں کرنی چاہیے۔ اور پھر اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے اپنے شاہی حکم سے جنگ میں شریک نہ ہونے کا اعلان کر دیا......

......اس کا ذکر صفحہ ۱۱۵ میں بھی آچکا ہے۔

لطیفہ :۔ سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت ہمارے ایک جلسہ میں شریک تھے۔ اس میں دو سردار جو ایسی باتوں میں ہمارے شریک ہوتے تھے وہ بھی تھے۔ اس جلسہ میں مولانا سندھی اور راجہ صاحب، دو افغان سردار اور پریسیڈنٹ سردار نائب السلطنت تھے۔ جب یہ باتیں شروع ہوئیں تو ایک سردار نے کہا کہ اب ہم ہندوستان فتح کر کے اس پر حاکم ہو جائیں گے مولانا سندھی نے سخت لہجہ میں فرمایا کہ آپ کے مقابلہ میں انگریز سو گُنا تعلیم یافتہ اور خوش اخلاقی سے ہندوستان کو چلا رہے ہیں۔ جب ہم ان کو پسند نہیں کرتے تو آپ جیسے افغانوں کو اپنے سر پر کیسے بٹھا سکتے ہیں؟ نائب السلطنت نے فرمایا کہ ہم فقط ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ حکومت خود ان کی اپنی ہو گی۔ ترکی اور جاپان میں مشن بھیجنے کی تدبیر کے وقت راجہ صاحب بھی شریک تھے۔ اور خرچ کے لیے وہ روپیہ تھا جو تین سو پونڈ جرمن کیپٹن میرے نام پر افغانی خزانے میں داخل کر گئے تھے۔ اس کا حال آئندہ بیان ہو گا۔ راجہ صاحب ترکی کی طرف مشن بھیجنے کے بعد مزار بلخ کو چلے گئے تھے۔ مولوی برکت اللہ کی تجویز سے ہم آگے لکھ آئے ہیں کہ یہ دونوں مشن گرفتار ہو گئے۔ مگر راجہ صاحب نے جاتے وقت کچھ خطوط دیے کہ میرے بھائی کو ہندوستان میں پہنچا دو۔ تو مولانا سندھی نے اپنے بھتیجے محمد علی کو وہ خط دیا اور وہ راجہ صاحب کے بھائی کے پاس پہنچ کر کچھ روپیہ بھی لایا۔ راجہ صاحب کی موجودگی

میں ریشمی خطوط لکھے گئے اور بھیجے گئے۔

ترکی اور جاپان دونوں مشنوں کے ممبروں کو گرفتار کرکے لاہور میں لایا گیا۔ انھوں نے جو کچھ بیان دیا اس کا اثر یہ ہوا کہ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے سب ہندوستانیوں کو اپنے ملک سے نکال دیا۔ مگر مولانا سندھی کو نہیں نکالا (وجہ صفحہ ۱۱۸ پر درج ہی) کیونکہ نہ ان کو نہ ان کے رفیقوں (نوجوانوں) کو نکالا۔ ہجرت کا سرٹیفکیٹ بھی مل گیا تھا کہ کچھ گزند نہ پہنچے۔ اس لیے جب یہ لوگ کابل سے یاغستان کو جا رہے تھے تو مولانا سندھی نے ریشمی خطوط بھی بھیجے۔ یہ خطوط نومسلم شیخ عبدالحق نے حق نواز خاں ولد اللہ نواز خاں کو دیے اور حق نواز خاں نے گورنر سر اوڈوائر لاہور کو دیے۔ اس سے ہندوستان میں جو گرفتاریاں ہوئیں وہ تو ظاہر ہے اور باقی مولانا سندھی اور باقی نوجوانوں کو بھی کابل میں نظر بند کیا گیا۔ اُن کو افغانستان کا تشکیل سرٹیفکیٹ مل چکا تھا۔ مولانا سندھی کی نظر بندی سے پہلے ان کا بھتیجا محمد علی واپس آ گیا تھا۔ اگرچہ محمد علی اور عبدالحق نومسلم کو ساتھ ہی ہندوستان بھیجا گیا تھا مگر عبدالحق نومسلم نے ایک ماہ نظر بند رہ کر اور معافی کا سرٹیفکیٹ لے کر بیان دینا شروع کیا اور محمد علی جلدی اپنا کام سرانجام دے کر واپس آ گیا۔ راجہ صاحب جب مزار بلخ میں تھے تو مولانا سندھی کا بھتیجا محمد علی اور برادر مولوی احمد علی لاہوری ہندوستان سے واپس آیا۔ مولانا نے خطوط وغیرہ راجہ صاحب کو مزار میں پہنچا دیے۔ وہ مزار سے ہندوستانی تاجروں کی معرفت سمرقند سے ہوتا ہوا اور روسی سلطنت میں بھٹکتا ہوا سوئزرلینڈ پہنچا تھا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے بھائی کو بلایا تھا۔ پھر جب امان اللہ خاں کی حکومت قائم ہوگئی پھر واپس آیا۔ اس نے سوئزرلینڈ میں جا کر جو کچھ کیا اس کی حقیقت مولانا سندھی کو معلوم تھی۔ مگر مولانا سندھی دریا دل تھے سب کچھ فراموش فرما کر عزت کرتے رہے۔ اگر کوئی مسلمان انقلابی ہندوؤں کے خلاف کام کرتا تو وہ لوگ اس کو منہ بھی نہ لگاتے۔ اور اس کو بدنام کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتے۔ مسلم اور ہندو کی ذہنیت کا یہی فرق ہے۔ اس قصے کو گزشتہ قصوں سے ملانا چاہیے۔

اس کے بعد ہم نے جنود اللہ اور باقی تمام کام کرنے والوں کو حکومت موقتہ ہند مرکز کابل سے پیوند کر دیا۔ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں صاحب جب برسر اقتدار ہوئے

تو انھوں نے ہمیں حکومتِ مؤقتۂ ہند کا نمایندہ تسلیم کرکے سرکاری معاملات صلح و جنگ میں شریک کر لیا۔ جب جنگ کا فیصلہ ہونے لگا تو اس خاص مجلس میں مجھے بلا کر سرفراز فرمایا دَورانِ جنگ میں بعض اہم امور میرے حوالے کیے گئے۔ یعنی مشرقی جنگ میرے حوالے ہوئی جنگ ختم ہونے پر اچھی کامیابی حاصل کرنے میں ہماری خدمات خاص طور پر تسلیم کی گئیں۔ اس تمام زمانہ میں ہمارے نوجوان رفیقوں کے کارنامے سنہری حرفوں سے لکھے جائیں گے۔ اگرچہ ایک زمانہ تک ان پر پردہ ڈالنا ضروری ہے۔

جنگِ افغانستان کے ایام میں اور دَورانِ زمانۂ صلح میں جو ہماری جماعت نے کام کیے ان میں سے ایک تو یہ تھا کہ دورانِ جنگ کے زمانہ میں روس میں کمیونزم پھیل گیا تھا۔ ہمارے نوجوانوں نے وہاں جا کر ان کو امداد دینے کے لیے بڑے بڑے کام کیے۔ دورانِ صلح میں تو حکومتِ مؤقتۂ ہند کے وسیلے سے ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے روسی سلطنت نے ایک لاکھ فوج دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اور سرکاری طور پر یہ معاہدہ ہو چکا تھا۔ یہ ہند اور افغانستان کی ایک اہم خدمت تھی۔ جس سے ڈر کر برطانیہ نے افغانستان کی آزادی تسلیم کر لی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ دس سال کے بعد ہندوستان کو سیلف گورنمنٹ دینے کا بھی وعدہ کر لیا تھا۔ صلح نامۂ افغانستان میں یہ باتیں درج ہیں۔ اور افغانستان کو فقط مدد دینے سے روس سلطنت گریز کرتی تھی۔ یہ ہمارے نوجوانوں کی عقل اور تدبر کا بڑا ثبوت ہے کہ انھوں نے ایسی بڑی سلطنت کو نازک وقت میں اپنی مدد کے لیے تیار کر لیا۔ اِن نوجوانوں کے آنے جانے کا راستہ تاشقند تھا، جو اشتراکی پروپیگنڈے کا مرکز تھا۔ اور اس کا لیڈر جوبندر ناتھ رائے اور راجہ مہندر پرتاب تھے۔ جس سے امداد کا وعدہ ہو گیا تھا۔ بڑی سے بڑی سلطنتیں بھی دوسری سلطنت کو اپنے ساتھ ملانے میں بہت مدت کے بعد کامیاب ہوتی ہیں۔ اس کو کرامت کہو یا نوجوانوں کے عقل اور تدبر کی داد دو کہ تھوڑے ہی عرصہ میں انھوں نے کامیابی حاصل کر لی۔ ہم مانتے ہیں کہ برطانیہ وغیرہ سلطنتوں میں بھی ایسے عقل مند مدبر ہیں۔ مگر اتنے تھوڑے عرصہ میں جادو کر دینا یہ کبھی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا۔

دوسرا یہ کہ اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں سے عرض کیا گیا کہ افغانستان میں گاؤکشی بند کرنے کا اعلان کر دیں تاکہ ہندوستان کے ہندو آپ کی طرف مائل ہو جائیں۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔

تیسرا جب امرتسر میں کانگرس کا اجلاس ہوا تو مولانا محمد علی نے فرمایا کہ اگر برطانیہ ترکی کو آزاد نہ کردے گی تو ہم ہندوستان سے باہر نکل جائیں گے۔ اور ہجرت کر کے دوسرے ملکوں میں بیٹھ کر برطانیہ سے جنگ کرتے رہیں گے۔ مولانا سندھی نے اس وقت اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں سے کہا کہ اعلان کردو کہ جو شخص ہندوستان سے ہجرت کر کے افغانستان میں آئے گا اس کو زمین اور مکان اور نوکری حسب لیاقت دی جائے گی۔ تو اعلیٰ حضرت نے اعلان کر دیا۔ لوگ آنا شروع ہو گئے۔ اور انگریزوں کا دماغ پریشان ہو گیا اور دوسرے ملکوں نے بھی پروٹسٹ کیا۔

چوتھا ان نوجوانوں کے ذریعے سارے ہندوستان کے بڑے بڑے لوگوں میں خطوط تقسیم کیے گئے۔ ان خطوط کا مضمون تھا کہ چونکہ آپ لوگ ہمارے اندرونی دوست ہیں ہم ہندوستان کی آزادی کے لیے عنقریب دوسری بار حملہ کرنے والے ہیں۔ آپ کو چاہیے کہ آپ اپنی تمام قوت سے اپنی حیثیت کے موافق ہماری امداد کریں۔ ایسے خطوط ہر ایک ممبر اسمبلی کو اور بڑے چودھریوں اور سیٹھوں کو اور ریاستوں کے نوابوں اور راجاؤں کو ہر جگہ پہنچا دیے گئے۔ اگرچہ انھوں نے یہ خطوط اپنے علاقہ کے گورنروں یا کمشنروں کو دے دیے گویا اپنے بے تعلق ہونے سے ان کو واقف کر دیا۔ مگر انگریزوں کو بہت شکوک پیدا ہو گئے اور جب افغانستان اور انگریزوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی اسی زمانہ میں کانگرس کا اجلاس احمد آباد میں ہونے والا تھا۔ اس میں آزادی کے جھنڈے لگانے کی بھی تدبیریں ہو رہی تھیں یعنی احمد آباد میں اعلان کر دیا جائے گا کہ ہندوستان آزاد ہے۔ پھر انگریزوں اور ہندوستانیوں میں لڑائی ہوگی۔ ایسے نازک وقت میں کانگرس کے اجلاس سے مہینہ پندرہ دن پہلے وائسرائے نے نمایندۂ صلح سردار محمود خاں طرزی کو جو افغانستان کے نمایندۂ صلح تھے' صاف صاف کہہ دیا کہ تم دس پندرہ دن کے اندر اپنی صلح کی شرائط پیش کر دو کہ کیا چاہتے ہو؟ ہم اب زیادہ دیر نہیں چاہتے۔ اور ہم بھی اپنے شرائط لکھ دیتے ہیں۔ اگر قبول ہوں تو فبہا۔ ورنہ پھر دوبارہ جنگ کرنے کو تیار ہیں۔ تم بھی جا کر جنگ کی تیاری کرو اور ہم بھی کرتے ہیں۔ سردار محمود خاں طرزی خواہ مخواہ صلح کے انعقاد میں دیر کر رہے تھے اور روڑے اٹکا رہے تھے۔ ادھر احمد آباد میں کانگرس کے اجلاس کی بڑی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ انگریزوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ دیر فقط اس لیے کر رہے ہیں کہ

کانگرس کی آزادی کا اعلان ہو جائے۔ شاید کانگرس کے اجلاس کے دس بارہ دن پہلے سردار محمود خاں طرزی کو وائسرائے نے بلا کر کہا کہ آج ہی صلح کے شرائط ہم کو لکھ دو۔ اگر ہم نے قبول کیے تو کریں گے نہیں تو چلے جاؤ۔

سردار محمود طرزی نے اپنے شرائط لکھ دیے۔ ان میں تھا کہ افغانستان کی مکمل آزادی سمجھ لو اور دس سال کے اندر ہندوستان کو سیلف گورنمنٹ دے دو۔ ہم ان دو کاموں کے لیے لڑے ہیں۔ وائسرائے نے شرائط قبول کرلیں اور سردار محمود خاں طرزی سے کہا کہ اب چلے جاؤ۔ اور افغانستان آزاد ہو گیا۔ انگریزوں کو خوف تھا کہ دوبارہ جنگ افغانستان اور انگریزوں کے درمیان نہیں بلکہ سارے ایشیا اور انگریزوں کے درمیان ہے۔

کانگرسی ہندوستانی آزادی کا جھنڈا احمد آباد میں کھڑا کرنے والے تھے۔ ان کی امداد کے لیے افغانستان اور روس تھا۔ اس لیے ذلیل سے ذلیل شرطیں انگریزوں کو قبول کرنی پڑیں۔ یہ سب کام ان نوجوانوں کا ہے جو ہمارے ساتھ تھے۔ غور سے دیکھا جائے تو مولانا سندھی اور ان کے رفیق نوجوانوں کی جد و جہد نے ہندوستان میں حقیقی آزادی کی روح پھونک دی تھی۔ یہ خدمت کوئی معمولی نہیں۔ سیاسی دماغ کے لوگ (اس دوسری جنگِ عظیم کے بعد جو انگریزوں نے ہندوستان کو آزادی دی ہے) سمجھ سکتے ہیں کہ جنگِ عمومی ۱۹۱۴ء میں ہندوستانی نوجوانوں نے جو کام کابل میں بیٹھ کر کیا تھا اس کا نتیجہ جنگ ۱۹۳۹ء کے بعد ظاہر ہوا۔

پانچواں:۔ کانگرس کی ہل چل کے مقابلے میں گورنمنٹ نے امن سبھائیں قائم کیں جن کا مقصد تھا کہ کانگرس کی ہل چل سے جو فساد پیدا ہوئے ہیں اور افغانستان نے اس سے فائدہ اٹھا کر حملہ کیا ہے اور آیندہ کرنا چاہتا ہے وہ بند ہو جائے۔

چھٹا:۔ کانگرس کا اجلاس احمد آباد میں ہوا۔ مالوی جی کی کوشش سے آزادی کا جھنڈا نہ بلند کیا گیا۔ استقبالیہ کمیٹی کانگرس کے پریسیڈنٹ مسیح الملک حکیم اجمل خاں تھے۔ انھوں نے اپنے خطبے میں فرمایا کہ کاش، افغانستان صلح کرنے میں بارہ دن دیر کر دیتا تو اچھا تھا! جس کا مطلب ہے کہ آزادی کا جھنڈا بلند کرنے کا ارادہ افغانستان کی مدد پر موقوف تھا۔ جب ان کی صلح ہو گئی تو اس کے بعد لڑنا بے سود تھا۔ افغانستان کی مدد سے روس بھی مدد دیتا

تو یہ آزادی کی جنگ ایشیا بھر کی جنگ ہو جاتی۔

اس طویل بات کو لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ سنہ ۱۹۴۶-۴۷ء میں جو ہندوستان کو آزادی مل گئی ہے وہ سب انھیں کاموں پر موقوف تھی۔ جیسا گاندھی جی نے وعدہ کیا تھا کہ اگر افغانستان حملہ کرے گا تو ہندوستان بھی اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے۔ اور افغانستان جو ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہا ہے اس کی وجہ سے ہم اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کو قانونی بادشاہ ہندوستان کا تسلیم کرلیں گے۔ مگر پہلی بار اس نے غلطی کھا کر کچھ ہل چل نہ کی۔ اگرچہ مسٹر گاندھی نے مولانا سندھی کو اپنے دستخط سے لکھ دیا تھا کہ اگر افغانستان مدد کرے گا تو ہم ضرور مدد کریں گے۔ اور خاص خط لکھ کر دیا تھا کہ ہم ضرور بغاوت کردیں گے۔

دوسری بار جب کانگرس کا اجلاس احمد آباد میں ہو رہا تھا اُس وقت سب لیڈر دل کا متفقہ فیصلہ تھا کہ آزادی کا جھنڈا بلند کریں گے۔ مگر جب افغانستان کی صلح ہو گئی تو ان کی کمر ٹوٹ گئی اور پنڈت مالوی جی کا جادو ان پر چل گیا۔

افسوس ہے کہ اس وقت مولانا محمد علی مرحوم جیل میں تھے۔ اگر وہ آزاد ہوتے تو بڑی بہادری سے کسی کی پروا نہ کرکے آزادی کا جھنڈا بلند کر دیتے۔ مولانا محمد علی بڑے باہمت سیاستداں تھے۔

مولانا شیخ الہندؒ نے جیسا ہم پہلے لکھ آئے ہیں، مولانا محمد علی کو مسلمانوں کا لیڈر بنا دیا تھا۔ اور مسلمان متحد ہو گئے تھے۔ پھر آگے چل کر ہندو مسلمان کا اتحاد ہو گیا۔ اور سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں مولانا شیخ الہندؒ نے مولوی عبید اللہ سندھی کو کابل بھیج کر تحریک آزادی شروع کر دی تھی۔

جب مولانا شیخ الہندؒ مالٹا کی اسیری سے آزاد ہو کر دہلی آئے تو جمعیت العلماء کا پریسیڈنٹ بھی مولانا محمد علی کو مقرر کیا۔ اب اس حیثیت سے کہ وہ جمعیت العلماء کے پریسیڈنٹ ہیں مسلمانوں کے حقوق کی نگہداشت کرنے کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔ اور مسلمانوں کو ایک جدا قوم بنانے کے لیے جدوجہد شروع کر دی اور مسلم لیگ کو زندہ کرکے پوری ہمت سے

مسلمانوں کو ہندوؤں کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش کرنی شروع کی۔ اس وقت مسٹر محمد علی جناح کانگرس کے حامی تھے۔ مولانا محمد علی کی تحریک کا یہ اثر ہوا کہ مسلمان بیدار ہو گئے۔ اور مولانا محمد علی مشن جو انگلینڈ گیا تھا اس میں یہی کوشش کر رہے تھے کہ مسلمانوں کو جدا قوم سمجھا جائے۔ اور ان کے حقوق کی نگہداشت کی جائے۔ اور اگر ہندو مسلمانوں کے حقوق تسلیم نہیں کرتے تو مسلمانوں کے لیے ایک ٹکڑا ملک کا جدا کر کے مسلمانوں کو دے دیا جائے۔ یہی کوشش کرتے کرتے وہ فوت ہو گئے۔ اور جگہ خالی ہو گئی۔ مسٹر محمد علی جناح اس سے کچھ عرصہ بعد تک بھی کانگرس میں رہے۔ آخر سندھ اور بمبئی کے علاقہ کے لوگوں کی کوشش سے مسٹر محمد علی جناح کانگرس سے نکل کر مسلم لیگ میں شامل ہوئے اور تحریک چلانے لگے۔

صوبوں کی آزادی ہندو قبول نہیں کرتے تھے۔ مطلب تھا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہو وہاں سوائے مسلمانوں کے اور کسی کی حکومت نہ چلائی جائے۔ جب ہندوؤں نے صوبوں کی آزادی نہ مانی تو مسلمانوں نے تقاضا کیا کہ ایک ٹکڑا اہم کو جہاں مسلمان زیادہ ہیں دے دیا جائے۔ انگریزوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کو ہندو برباد کر دیں گے، اور انگریزوں کا بھی اس میں فائدہ تھا کہ اگر مشرقی بنگال، ڈھاکہ، سندھ اور پنجاب جدا کر کے مسلمانوں کو دیا جائے تو اس میں مسلمانوں کا بھی فائدہ ہے اور انگریزوں کا بھی فائدہ ہے۔ اس مشورہ کے طے ہونے کے بعد مسٹر محمد علی جناح کو ان علاقوں کا گورنر جنرل بنا دیا گیا۔

اجتماعی فلاسفر تو اس پاکستان کے وجود میں آنے کا سبب عام اقتضا میں مسلمانوں کو سمجھے گا۔ اور اگر زیادہ غور کرے گا تو مولانا شیخ الہندؒ کو اس کا امام اور پیشوا مقرر کرے گا۔ مثلاً کارل مارکس کے نظریہ کو عمل میں لانے کے لیے فرانس میں تجربہ ہوا۔ اس کے بعد پھر ہوتا رہا۔ مگر لینن نے آ کر اس نظریہ کو روس میں چلایا۔

اس پاکستان کے بنانے میں مسلمانوں نے بہت جلد بازی کی۔ صوبہ پنجاب کی آبادی کا دارومدار گرداس پور ضلع پر تھا اس کو حاصل کرتے۔ اگر نہ دیتے تو سارے پاکستان کو چھوڑ دیتے۔ سب سے زیادہ غلطی مسلم لیگ کے ممبروں سے یہ ہوئی کہ انھوں نے نیچ قوم کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ سکھوں کو ملانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

یہ غلطی مولانا محمد علی سے ہوئی۔ اگر وہ اس کوشش میں رہتے تو کامیابی ہو جاتی۔ اس کے بعد بھی مسلم لیگ کے ممبروں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی۔ کہتے ہیں کہ جب پاکستان دینے کے لیے انگریز اور ہندو تیار ہو گئے تو اس وقت مسٹر محمد علی جناح نے سکھوں سے کہا تھا کہ ہم سے مل جاؤ تو ہم تمھاری ریاست بنا دیں گے۔ مگر ایسے کام ایک روز میں نہیں ہوتے۔ ان کے لیے بہت مدت چاہیے۔ یہ موقع مولانا محمد علی کو حاصل تھا۔ مگر انھوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ پھر مسلم لیگ کے ممبر بھی اس غلطی میں مبتلا رہے۔ دوسری غلطی یہ کی کہ کشمیر کا تقاضا اس وقت نہ کیا گیا۔

(پاکستان پر کتاب کے آخر میں بحث کریں گے کہ مسلمانوں کو کتنا فائدہ ہوا اور کتنا نقصان۔ اور اس کو کس اسکیم پر چلانا چاہیے؟ یہ کتاب کے آخری حصہ میں ہوگا۔ یہاں تو فقط اس جملہ کی تشریح کی گئی ہے کہ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ "ہمارے نوجوانوں اور رفیقوں کے کارنامے سنہری حرفوں سے لکھے جائیں گے۔ اگرچہ ایک زمانہ تک ان پر پردہ ڈالنا ضروری ہے"۔ اس جملہ کی تشریح کچھ تھوڑی بہت میں نے کر دی ہے اور آیندہ تاریخ لکھنے والا کامل طور سے لکھ دے گا)۔

ہندوستان ایک دن میں آزاد نہیں ہوا۔ اس کی آزادی دیوبند کے قائم ہونے سے واقع ہوئی۔ دیوبند کا اسکول اس لیے قائم ہوا کہ ہندوستان آزاد ہو جائے۔ مثلاً مذہب حنیفی کی بنیاد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رکھی۔ تین سو سال تک ان کی اولاد نے اس مذہب کو عام ملکوں میں جاری کرنے کی کوشش کی۔ تین سو سال کے بعد یوسف علیہ السلام مصر کے ملک پر بادشاہ ہوئے اور یوسف علیہ السلام کے بعد داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی دمشق میں قائم ہوئی۔

اجتماعی فلاسفر یہی کہیں گے کہ قوم کی اجتماعی حالت اور تقاضے کے بعد سلطنتیں قائم ہوتی ہیں۔ انفرادی نظریہ والا کہے گا کہ یوسف علیہ السلام چھو منتر کر کے مصر کے بادشاہ بن گئے۔ اور اسی طرح داؤد علیہ السلام بادشاہ بن گئے۔ یا کہے گا کہ محمود غزنوی نے حملہ کر کے ہندوستان لیا تھا۔ یا کہے گا کہ مسٹر محمد علی جناح نے کوشش کر کے پاکستان

حاصل کیا۔ یہ نظریہ اور فلسفہ عقل مند جماعت قبول نہیں کرتی۔ جب تک کہ اجتماع انسانی میں تقاضا نہ ہو تو کوئی اس کا لیڈر بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ قوم لیڈر کو پیدا کرتی ہے، نہ کہ لیڈر قوم کو پیدا کرتا ہے۔

پھر جب جنگ افغانستان ختم ہونے پر راجہ صاحب دوبارہ کابل میں تشریف لائے تو اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے ان کے اعزاز میں ایسے کام کیے جن کی راجہ صاحب کبھی توقع نہیں رکھتے تھے۔ اس میں اعلیٰ حضرت امیر صاحب نے ہمارے مشورے حرفاً حرفاً قبول فرمائے۔

ہم آگے لکھ آئے ہیں کہ ہمارے ریشمی خطوط بھیجنے سے پہلے راجہ صاحب مزار بلخ کو چلے گئے تھے۔ پھر وہاں سے بڑی محنت کر کے سوئٹزرلینڈ میں پہنچے۔ اس کے بعد جب اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے ہندوستان سے جنگ کی اور صلح کے لیے وفد دہلی گیا اسی زمانے میں راجہ صاحب واپس کابل آئے۔ جو کچھ انھوں نے غلطی کی تھی مولانا نے معاف کر دی۔ اور مولانا دوستوں کی غلطی کو درگزر کرتے تھے۔ پھر اپنے ساتھ ملا کر کام کرتے تھے۔ جب راجہ صاحب کابل آئے اور افغانستان کو آزاد دیکھا تو اس کی کامیابی کو انھوں نے حسرت سے دیکھا ایک بار میری مجلس میں آکر کہنے لگے کہ اگر میرے پاس سفر خرچ ہوتا اور عزت و احترام سے میں نیپال جاتا تو نیپال کو بھی آزاد کرا دیتا جیسے کہ آپ نے افغانستان کو آزاد کرا دیا ہے اور یہ الفاظ راجہ صاحب نے بڑی حسرت اور افسوس سے کہے۔ میں نے راجہ صاحب سے پوچھا کہ کتنی رقم چاہیے؟ انھوں نے کہا کم از کم تیس ہزار روپیہ چاہیے جس سے میں اپنی جماعت تیار کر کے نیپال جاؤں اور ان کو سمجھاؤں۔

مولانا سندھی فرماتے ہیں:۔ میں نے اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کی خدمت میں یہ بیان کیا۔ اور مشورہ دیا کہ اس نوجوان کی آرزو کو پورا کرنا چاہیے تاکہ یہ بھی اپنی ہندو ریاست نیپال نیم آزاد کو جا کر آزاد کرائے۔ مجھ کو یقین تھا کہ وہ ناکامیاب ہو گا۔ مگر تاہم راجہ صاحب کو اپنی ہوس پوری کرنے کا موقع دیا جائے۔ میں نے اعلیٰ حضرت سے کہا کہ یہ تمھارا احسان ہندو قوم پر ہو گا۔ آپ نے فوراً حکم لکھ کر خزانے کے منشی کو بھیجا۔ اس نے

دوسرے دن آکر تیس ہزار روپیہ میری وصیت سے راجہ صاحب کو دیا۔ اب راجہ صاحب نے تیاری شروع کردی۔ گھوڑے خرید کیے اور اپنے ساتھ ہندو نوجوان قابل کو ساتھ لیا بڑے تزک وشان سے کابل سے نیپال کو روانہ ہوگئے۔ راستہ کا پاسپورٹ دیا گیا جو روس سے ہوکر نیپال جاتا تھا۔ آخر تین چار مہینے کے بعد واپس آگیا۔ نہایت مغموم تھا اور ہندو قوم کو لعنتیں کر رہا تھا کہ بڑے بزدل ہیں۔ میں نے حال پوچھا۔ راجہ صاحب کہنے لگے کہ میں بڑی مشقت سے سفر کرتا ہوا نیپال کی سرحد پر پہنچ گیا۔ وزیراعظم نیپال کو معلوم تھا کہ راجہ مہندر پرتاب انگریزوں سے باغی ہے۔ اس لیے وزیراعظم نے مجھ کو اطلاع دی کہ اگر تو نیپال کی سرحد میں قدم رکھے گا تو ہم تجھ کو گرفتار کرکے انگریزوں کے سپرد کردیں گے۔ آخر میں ناامید ہوکر واپس آیا ہوں۔ اور باقی جو دس بارہ ہزار اس کے پاس بچے تھے وہ..... اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کی خدمت میں بھیج دیے۔ ناظرین کرام سے امید ہے، کہ مسلمانوں کی ذہنیت اور ہندوؤں کی ذہنیت کے تفاوت کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہیں۔

آخری سال جب ہم کابل سے رخصت ہوئے امیر صاحب نے ہمیں افغانستان میں رہ کر حکومتِ مؤقتہ ہند کا کام کرنے سے روک دیا تھا۔ انٹرنیشنل سیاست کی پابندی ضروری ہے۔ ہم نے ایک شرط پر اسے منظور کرلیا۔ جب وہ وعدہ کرنے میں تامل کرتے نظر آئے تو ہم نے افغانستان سے رخصت ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ میں بذاتِ خود تھوڑے سے تغیر کے ساتھ آرام و عزت سے کابل میں رہ سکتا تھا۔ مگر میرے نوجوان رفیقوں کا (جن کی مشقتیں ہماری عزت افزائی کا سبب بنیں) مستقبل برباد ہو جاتا۔ اس لیے میں کابل سے چلا آنا ضروری سمجھتا تھا۔ کیونکہ میں اپنے اطمینان کا خواہش مند نہ تھا، بلکہ اِن نوجوان رفیقوں کا اطمینان میرے لیے سخت ضروری تھا۔ لیکن اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ فلاں (مولانا سندھی) نے اپنے فائدے کے لیے دوسروں کا نقصان کردیا۔ اب کابل میں ہمارا اجتماع نہ رہا تھا۔ کسی کا کسی طرف رخ تھا، کسی کا کسی طرف اگر کبھی کوئی موقع میسر آیا تو تمام دوست پھر ایک جا ہو جائیں گے۔ وَاللہ الموفق والمعین۔

اس میں بڑی بات چھپی ہوئی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حکومت مؤقتۂ ہند کا کام یہ تھا کہ ماوراے دریاے سندھ یعنی پنجاب، کشمیر، سندھ اور وہ علاقے جو ان کے متعلق ہیں ان کو آزاد کرایا جائے۔ پہلی بات تو وہ تھی جو ہم پیشتر لکھ آئے ہیں کہ روس کے حملے کا خوف تھا۔ اب روس کو مشن گیا تھا۔ اور سونے کی پٹڑی والی جو کتاب شایع ہوئی تھی اس کے دو اثر پیدا ہوئے ایک تو روسی طاقت کا علم ہوگیا کہ اس میں حملے کی طاقت نہیں۔ دوسرا یہ کہ سونے کی پٹڑی کتاب شایع ہونے سے روس کے تمام لشکر میں گڑبڑ ہوگئی۔ اور انھوں نے معلوم کر لیا کہ انگریز ہمارے دشمن ہیں۔ اس خیال کو باطل کرنے کے لیے اور روس کو مدد دینے کے لیے لارڈ کچنر نے روس کا سفر اختیار کیا۔ اس کا جہاز سمندر میں ڈبو دیا گیا اور تمام لشکر روس کا زار روس سے مخالف ہوگیا۔ اور دوسرا یہ تھا کہ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں بذریعہ سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت دوسرا بیعت نامہ لے رہے تھے۔ اس کا مظاہرہ بھی ہو چکا تھا۔ اب ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے ایک رکاوٹ تھی۔ اور وہ یہ کہ سکھوں سے معاہدہ کیا جائے۔

ہم نے دو بڑے لیڈر سکھوں کے پنجاب سے اور دو کابل اور صوبہ سرحد سے بلوائے ان سب کو سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت کے سامنے پیش کیا۔ یہ ایک خفیہ جلسہ تھا جس میں اور نائب السلطنت اور یہ چار لیڈر شامل تھے۔ ان سے بحث و مباحثہ شروع ہوا کہ ہم پنجاب پر حملہ کرتے ہیں اور پنجاب میں سکھوں کے سوا اور کوئی ہندو بہادر قوم نہیں ہے۔ مسلمان اور سکھ اگر آپس میں اپنے اپنے حقوق کا تصفیہ کر لیں اور آپس میں بھائی بھائی ہو جائیں تو پنجاب دہلی تک اور ادھر کشمیر سے سندھ تک فتح ہو سکتا ہے۔ ان سرداروں سے ایک نے کہا کہ مسلمانوں نے ہم پر ظلم کیے ہیں۔ ہمارے گرو کے چھوٹے معصوم بچوں کو مسلمان بادشاہ عالمگیر نے ناحق قتل کرایا۔ اگر ہم آپ سے مل جائیں اور حملہ ہو افغانستان کی طرف سے۔ پھر بھی ہم کو یہی ڈر رہتا ہے کہ آخر کار ہم مظلوم نہ ہو جائیں۔

نائب السلطنت صاحب نے فرمایا۔ بیشک تم مظلوم ہو۔ تمھارے گرو کے بچے ناحق قتل کر دیے گئے۔ اور پھر تمھاری دلجوئی نہ ہوئی۔ ہم ان بچوں کا خون بہا دینے کے لیے تیار ہیں

میں ان دو لڑکوں کے عوض اپنے بچے اور اپنے بھائی کے بچے (بارہ لڑکے) دینے کو تیار ہوں یہ بارہ لڑکے میرے خاندان سے ہوں گے اور تم میرے روبرو ان کو ذبح کرو۔ پھر تو تم راضی ہو جاؤ گے۔ پھر تو تمہارا دل ٹھنڈا ہو جائے گا۔ یہ بات سن کر وہ سکھ لیڈر بہت روئے اور کہا کہ "اب ہم کو عوض مل گیا۔ اس طرح کی گفتگو ہم سے کبھی مسلمانوں نے نہیں کی۔ آپ بادشاہ ہو کر جب اپنے بچے پیش کرتے ہیں تو کیا ہم اپنے تمام اختیارات اور حقوق آپ کے سامنے پیش نہیں کر سکتے۔ اب ہم نے دعویٰ چھوڑا۔ اور اب جن امور پر معاہدہ منظور ہو پیش کر دیجیے۔ ہم آپ کے ساتھ ہی مرنے اور زندہ رہنے میں شریک ہوں گے۔" پھر سردار نائب السلطنت کی باتوں میں آ گئے اور صلح کی باتیں شروع ہوئیں۔

ہم نے صلح کی بڑی سے بڑی شرط یہ پیش کی کہ پنجاب میں دہلی تک دو قومیں بستی ہیں۔ ایک قوم مسلمان ہے اور دوسری ہندو۔ اب ہندو قوم بنیئے ہیں اور تجارت وغیرہ میں بہت عقل رکھتے ہیں۔ وہ ہندو قوم سب کی سب آپ کے ماتحت رہے گی۔ اور حقوق ملکی تمہارے اور ہمارے درمیان بطور آبادی کے تقسیم کیے جائیں گے۔ نوکریوں وغیرہ، زمین کے حقوق اور سول کے حقوق سب اسی طرح ہوں گے۔ آپ کی سکھ قوم سردار ہو گی۔ اور باقی ہندو قوم اس کے ماتحت ہو گی۔ ہندو قوم کے حقوق وغیرہ کے نگہبان سکھ ہوں گے۔ اور مسلمانوں کے حقوق کے نگہبان مسلمان ہوں گے۔ اور مذہبی آزادی ہر ایک کی پورے پورے احترام کے ساتھ رہے گی۔ اس پر سکھ لیڈر راضی ہو گئے۔ اور یہ معاہدہ پختہ ہو گیا۔ اور باقی سکھ جو پنجاب میں رہتے ہیں ان کی ذمہ داری انھوں نے اپنے سر پر لی۔ اور کہا کہ جنگ میں ہم آپ کے ساتھ شریک ہوں گے۔ یہ ایک معاہدہ ہوا جس کو مسلمان لیڈروں نے جو ہندوستان میں تھے اُن کی طرف خیال بھی نہ کیا تھا۔ اور اسی طرح مسلم لیگ نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ اگر مسلم لیگ اس طرف توجہ کرتی اور سکھوں کو راضی کرتی تو پنجاب کبھی تقسیم نہ ہوتا۔

کہتے ہیں کہ مسٹر محمد علی جناح قائدِ اعظم کو جب پاکستان ملنے کا پورا وعدہ مل چکا تھا اس وقت سکھ لیڈروں سے کہا تھا کہ تم ہمارے ساتھ مل جاؤ ہم تمہاری ایک ریاست پنجاب میں بنا دیں گے۔ مگر ہر ایک عقل مند جانتا ہے کہ ایسے بڑے معاہدے ایک لحظہ میں

نہیں ہوتے۔ مسٹر محمد علی جناح کو چاہیے تھا کہ جب وہ مسلم لیگ اور مسلمانوں کے قائدِ اعظم بنے تھے اس وقت سے سکھوں کو راضی کرنے کے لیے تدبیریں کرتے اور مسلم لیگ میں ان کو لے آتے۔ اور مسلم لیگ کا ممبر بناتے۔ اور باقی مسلمان لیڈروں کا خیال بھی اس طرف نہ گیا۔ اس غفلت کا نتیجہ اب ہم بھگت رہے ہیں۔ یہ مولانا سندھی کی دُور اندیشی تھی کہ انھوں نے سکھوں کو راضی کیے بغیر پنجاب وغیرہ کی آزادی کو ناممکن سمجھا۔ اور دوسرا معاہدہ ڈوگرا قوم سے کیا تھا ڈوگرا قوم پنجاب کے پہاڑی علاقہ میں بڑی طاقت والی ہے اور ان کی ریاست جموں اور کشمیر پر ہے۔ ان سے معاہدہ ہوا تھا کہ تمھارے حقوق بطور آبادی کے دیے جائیں گے۔ اور باقی ہندو قوم تمھارے ماتحت رہے گی۔ اور ان کی نگہبانی تمھارے ہاتھ ہوگی۔ اور ضلع گورداسپور میں بھی ہندو قوم تمھاری نگہبانی میں رہے گی۔ اور تم ان کے جاگیردار ہوگے۔

اس معاہدہ کے بعد ہم نے ریشمی خطوط مولانا شیخ الہند کو بھیجے جو انگریزوں کے ہاتھ لگے۔ جس میں مولانا سندھی اور ان کے رفقا نظربند ہو گئے۔ مگر تاہم نظربندی کی حالت میں بھی مولانا سندھی نے اس معاہدے کی تحریک کو جاری رکھا۔ جب امان اللہ خاں برسرِ اقتدار آگئے اور جنگ چھڑ گئی پھر صلح کے معاہدے ہونے لگے تو، ہم جیسا کہ پہلے لکھ آئے ہیں کہ مولانا سندھی نے روس کے ساتھ جنگی معاہدہ کیا۔ اس وقت جنگی معاہدہ ہونے کی حالت میں مولانا شیخ الہند نے بھی آزاد ہو کر دہلی میں آکر جمعیت العلماء کا جلسہ کیا اور تقریر میں فرمایا کہ جن لوگوں کو ہم مدرسوں اور خانقاہوں میں ڈھونڈتے تھے وہ ہم کو اسکولوں اور کالجوں سے ملے اور مولانا محمد علی مرحوم کو جمعیت العلماء کا پریسیڈنٹ کر دیا۔ جس سے پرانے تعلیم یافتہ ایک پلیٹ فارم پر آگئے۔ مگر کراچی کے مقدمے میں نہیں بلکہ رولٹ ایکٹ کے ماتحت ان کو چار سال جیل میں رہنا پڑا۔ اور کراچی والے مقدمہ کا صرف بہانہ تھا۔ ہم آگے لکھ آئے ہیں کہ احمد آباد میں کانگرس کے اجلاس میں آزادی کا اعلان ہندوستان کے لوگ کرنے والے تھے۔ مگر اس سے دس پندرہ دن قبل ہی انگریزوں نے افغانی وفد پر زور ڈالا کہ جنگ یا صلح کرو تاکہ کانگرس آزادی کا اعلان نہ کر سکے۔

مولانا شیخ الہند کراچی کے اجلاس جمعیت العلماء کے بعد تھوڑے دن زندہ رہے اس کے

بعد فوت ہو گئے۔ اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں نے مولانا شیخ الہند کی تعزیت کا جلسہ کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ جو کام مولانا شیخ الہند شروع کر گئے ہیں ہم اس کو پورا کریں گے۔ اس کے چند ماہ بعد صلح افغانستان ہوئی۔ انگریزوں نے افغانستان کو آزاد کر دیا۔ اور دس سال کے بعد سیلف گورنمنٹ کا ہندوستانیوں کو دینے کا وعدہ اس صلح نامہ تحریر کیا گیا۔

جشن صلح میں جو گورنمنٹ ہند سے ایک افسر آیا تھا اُس نے اپنی تقریر میں کہا کہ "یہ آزادی افغانستان کی نہیں بلکہ مولانا سندھی کی فتح ہے۔" اس کے بعد اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے انگریزوں سے وہ روپیہ طلب کیا جو اعلیٰ حضرت امیر شہید سے انگریزوں کو ان کے غیر جانبدار رہنے کے عوض میں دینا تھا۔ بہت بحث مباحثہ کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ ہم آپ کو وہ رقم دینا منظور کرتے ہیں اس شرط پر کہ آپ جس سلطنت سے معاہدہ کریں اُس معاہدے کی کاپی ہم کو ضرور دکھلائیں۔ افغانستان آزاد ہے جس بادشاہ سے تم صلح کرو بیشک کرو مگر اس کی کاپی ہم کو دکھاؤ تاکہ ہم دیکھیں کہ کس شرط پر صلح کرتے ہیں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ مولوی عبید اللہ سندھی اور ان کے رفقاء نے جو حکومت مؤقتۂ ہند بنائی ہے اس کے کام کو روک دو۔

اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے مولانا سندھی کو بلا کر حکم دیا کہ حکومتِ مؤقتۂ ہند کا کام اب بند کر دو۔ مولانا سندھی تو اس پر راضی نہ تھے۔ مگر انٹرنیشنل معاہدے کی پابندی ضروری ہوتی ہے۔ لیکن اس ایک شرط پہ راضی ہو گئے کہ ہم کو کابل میں یونیورسٹی بنانے کی اجازت ملے۔ تاکہ میرے رفیق نوجوان بیکار نہ بیٹھے رہیں۔

مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ "مجھ سے وعدہ کیا کہ تم میرے مشیروں کی اول صف میں رہو گے۔ اور تمھارے اور تمھارے رفیق نوجوانوں کا خرچ ہم دیتے رہیں گے۔ اور تم یہاں خوش رہو گے۔ مگر یونیورسٹی بنانے کی اجازت دینے میں تامل کرتے رہے۔ آخر معلوم ہوا کہ گورنمنٹ ہند نہیں چاہتی کہ ہم کابل میں بیٹھ کر یونیورسٹی قائم کریں اس لیے ہم کو کابل سے رخصت ہونا پڑا کیونکہ میرے نوجوان رفیق جو ہماری عزت افزائی کا سبب ہوئے تھے اُن کا مستقبل برباد ہو جاتا کہنے والے کہتے ہیں کہ مولانا سندھی نے اپنے فائدے کے لیے ان نوجوانوں کا نقصان کر دیا۔ اور ان کی عمر برباد کر دی۔

رولٹ ایکٹ کو مہمل بنانے کے لیے گاندھی پیدا ہوئے۔ رولٹ ایکٹ مولانا عبید اللہ اور عبد اللہ کے نام پر بنا تھا۔ مگر اس کی زد مسلمانوں سے ہندوؤں پر زیادہ پڑتی تھی مسلمان اور ہندو مل کر اس رولٹ ایکٹ کے منسوخ کرانے کے لیے جد وجہد کرنے لگے۔ مگر حقیقت گاندھی کی کوئی پوچھے تو یوں کہا جائے گا کہ گاندھی جی کا منہ تو شیر کا تھا اور دُم گائے کی تھی۔ یعنی ظاہر میں بڑے پولٹیکل اور بڑے انقلابی نظر آتے تھے مگر ذہنیت سرمایہ پرستی تھی۔

گورنمنٹ ہند نے ہمارا معاہدہ جو ڈوگروں سے تھا اس کو اس طرح برباد کیا کہ آزادیٔ کشمیر کے لیے مسلمانوں کو ڈوگروں سے لڑوا دیا۔ شروع تو قادیانیوں نے کیا تھا۔ مگر پھر تمام مسلمان اس میں شریک ہو گئے۔ اس کا حال ہر ایک عقل مند کو معلوم ہے۔ معاہدہ سکھوں سے جو ہمارا ہوا اس کو اس طرح برباد کیا کہ مسلمانوں کو مسجد شہید گنج لاہور میں لڑوا دیا۔ اور مسلمان آپس میں خوب لڑے اور ایک دوسرے کے سر پھوڑے۔ یہ اس لیے تھا کہ مولانا سندھی نے جو روس سے معاہدہ کیا تھا وہ اب تک قائم تھا۔ اگرچہ مولانا روس کو جا رہے تھے مگر انگریزوں کو ڈر تھا کہ مبادا وہاں جا کر کوئی اس سے بھی بڑا فتنہ برپا نہ کر دیں۔ میں اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں سے دو باتوں پر سخت ناراض تھا۔ ایک یہ کہ میں نے جو خط سردار محمود خاں طرزی کو دیا تھا اس نے وائسرائے کو پہنچا کر ہمارے جمعیت العلماء کے پریسیڈنٹ مولانا محمد علی کو نقصان پہنچایا۔ میں نے اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں یا سردار محمود خاں طرزی سے کچھ بھی نہ کہا دوسرے جب اتحادیوں نے ترکی جماعت ترکوں کو شکست دی اور کمالی ترک برسر اقتدار آ گئے۔ جمال پاشا جو شام کے فیلڈ مارشل تھے وہ بھاگ کر افغانستان پہنچ گئے۔ اور اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں نے ان کو سرحد افغانستان کی نگرانی پر مامور کیا۔ اُن کو پانچ سو روپیہ کابلی دیتے تھے۔ اور میں بھی اُن کی امداد کرتا تھا، ایک بار میرے پاس آئے اور اپنی عورت کا جو استنبول میں تھی خط دکھایا۔ اس خط میں لکھا تھا اگر تم میرے خرچ کے لیے ایک ہزار روپیہ نہ بھیجو گے تو میں بازار میں بیٹھ کر فاحشہ کسبانی ہو کر کام کروں گی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے ان کو ایک ہزار روپیہ دے دیا۔ انور پاشا استنبول سے بھاگ کر ماسکو گئے۔ روس نے ان کو سمرقند کا علاقہ دے دیا، کہ تم کمیونزم ادھر پھیلاؤ اور مسلمانوں کو کمیونزم میں داخل کرو۔

ایک بار حسین حلمی پاشا میرے پاس آئے اور خبر کی کہ انور پاشا نے سمرقند میں روسیوں کے برخلاف جنگ کر دی ہے۔ میں نے پوچھا کہ اُن کے پاس سامانِ جنگ اور پیسہ کہاں سے آئے گا؟ انھوں نے جواب دیا کہ انگریزوں نے تین لاکھ پونڈ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اور سامانِ حرب وغیرہ دینے کا بھی وعدہ کیا ہے۔ میں نے پوچھا یہ سامانِ جنگ اور روپیہ پیسہ کون پہنچائے گا؟ کس راستے سے پہنچائے گا؟ انھوں نے کہا کہ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے ذمہ اٹھایا ہے۔ میں اس پر بہت غمگین ہوا اور مجھ کو بڑا غصہ آیا۔ میں نے صاف کہا کہ امیر امان اللہ خاں ان کو کچھ بھی رقم نہ پہنچائیں گے۔ ویسا ہی مارا جائے گا۔ حسین حلمی پاشا نے کہا کہ اعلیٰ حضرت نے تیس ہزار پاونڈ تو بھیج دیے ہیں۔ میں نے کہا تیس ہزار پاؤنڈ کیا ہیں۔ مجھ کو تم نے پیشتر کیوں نہ اطلاع کی کہ اگر اعلان کرتے تو میں اُن کو منع کرتا کہ روسیوں سے جنگ نہ کرو۔ وفادار رہو۔ اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں نے اس کے سوا کچھ بھی نہ کیا۔ انور پاشا بے ہتھیار بے خرچ ہو کر شکست کھا گئے اور مارے گئے۔ اس کا مجھ کو بڑا غم ہوا۔ میں نے کہا مسلمان بادشاہ ہو کر غداری کرتے ہیں۔ اس لیے بھی مجھ کو کابل میں رہنا پسند نہ آیا۔

لطیفہ:۔ صلح کا افغانی وفد دہلی میں تھا۔ اِن ایام میں یہ قصہ ہوا کہ قونصل مقیم افغانستان کے ملازم سیر کے لیے کابل شہر سے باہر جا رہے تھے۔ اور ان کے ساتھ اُن کا افسر نہ تھا۔ انھوں نے دیکھا کہ حسین حلمی پاشا گھوڑے پر سوار ہو کر کابل کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ کھڑے ہو گئے اور فوجی سلامی دی۔ مگر حسین حلمی پاشا نے وہ سلامی نہ لی۔ پھر کابل میں آتے ہی سیدھے میرے مکان پر آئے اور کہنے لگے کہ ان بے ایمانوں نے ہم کو سلامی دی۔ میں نے نہیں لی۔ میں نے سخت غصے سے ان کی طرف نگاہ کی۔ میرا چہرہ بگڑا ہوا دیکھ کر وہ چلے گئے۔ پھر اپنے سکریٹری کو میرے مکان پر بھیجا۔ اس نے آکر غصے کا سبب پوچھا۔ میں نے کہا کہ ہمارے نوجوان جو انگریزوں کی نوکری کرتے ہیں اور انگریزوں کی غلامی میں قید ہیں ان میں اتنا ایمان ہے اور اتنی مسلمانوں سے محبت ہے کہ تم کو اسلامی آدمی سمجھ کر سلامی دی مگر تم نے اس کی قدر نہ کی۔ ہم انگریزی غلامی میں رہ کر بھی محبت رکھتے ہیں۔ اگر تم اس حالت میں ہو تو ہم کو یقین ہے کہ تم تُرکوں کے مارے

کسی مسلمان کو دوستی کا ہاتھ بھی نہ دو گے۔ پھر وہ سکریٹری چلا گیا۔ اور حسین حلمی پاشا آئے اور آکر معافی مانگی۔

ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ گورنر یو۔پی کی آمد پر مولانا محمد علی کو مولانا شیخ الہند نے اپنا نمایندہ بنایا۔ نئے پرانے تعلیم یافتہ لوگوں کو جمع کیا۔

حکیم الامت کا خطاب دیوبندی جماعت میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے لیے مخصوص تھا۔ اور شاہ ولی اللہؒ کی جماعت کے سردار مولانا شیخ الہندؒ تھے۔ وہ تو سیاست اور پولٹیکل کاموں میں امامت کرنے لگے۔ اور شاہ ولی اللہ کی جماعت دو سو سال سے آزادی ہند کے لیے کام کر رہی تھی۔ اب جب مولانا محمد علی نئے اور پرانے تعلیم یافتہ لوگوں کو جمع کرنے لگے، یہ بات گورنمنٹ کی آنکھوں میں ایک خار گزری۔ مولانا اشرف علیؒ کے چچا زاد بھائی اس زمانے میں سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی یو۔پی کے تھے۔ ان کی کوشش سے حکیم الامت کا خطاب مولانا اشرف علیؒ کو ملنے لگا۔ اور ان کے مریدوں نے مولانا اشرف علیؒ کو حکیم الامت کہنا شروع کر دیا تاکہ شاہ ولی اللہ صاحب کی تحریک کو ضرب لگے۔ ایسا ہوتا رہا۔ مولانا اشرف علیؒ گریجویٹ نوجوانوں کو بڑا کافر کہتے تھے اور ہندؤں کو چھوٹا کافر۔ یہ بات مولانا اشرف علیؒ کو گوارا نہ تھی کہ علماء کی جماعت یعنی جمعیت العلماء کا یا نئے اور پرانے تعلیم یافتہ لوگوں کا امیر ایک گریجویٹ نیچری ہو۔ مولانا محمد علی نے مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرو دیا۔ اور ہندو مسلمانوں کا اتحاد قائم کیا۔ اور جب مولانا شیخ الہندؒ مالٹا سے آزاد ہو کر آئے تو جمعیت العلماء کا پریسیڈنٹ بھی مولانا محمد علی کو بنا دیا۔ ادھر کابل میں مولانا سندھی ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کر رہے تھے۔ اور ہندوستان پر حملے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

جب مولانا شیخ الہندؒ فوت ہو گئے تو دیوبند کے اراکین نے مل کر دیوبند دار العلوم کا سرپرست مولوی اشرف علی کو بنایا۔ کیونکہ حکومت نے سوچ رکھا تھا کہ کب مولانا شیخ الہند کا انتقال ہو اور مولانا اشرف علی کو دیوبند کا سرپرست بنایا جائے۔ یہ مولانا شیخ الہند اور مولانا محمد علی جوہر کی تحریکوں کو فنا کرنے کا پہلا قدم تھا۔ اور دوسرا قدم یہ تھا کہ مولانا محمد علی جوہر کو جمعیت العلماء کی صدارت سے علیحدہ کر دیا جائے تاکہ مسلمانوں کا زور ٹوٹ جائے۔

اور نئے اور پرانے تعلیم یافتہ حضرات میں نفاق پیدا ہو جائے۔ وہ تو دل سے چاہتے تھے کہ جمعیت العلماء سے نیچریوں (بے دینوں) کو نکال دیا جائے اور خالص اسلامی جمعیت العلماءٔ بنے۔ دہلی میں جمعیت العلماء کا جلسہ کرا کے مولویوں سے ووٹ لیے گئے کہ پریسیڈنٹ کس کو کیا جائے۔ مولوی بیچارے جو عموماً سادے ہوتے ہیں اور پولٹیکل کاموں اور سیاست سے بالکل نابلد ہوتے ہیں، انھوں نے مولانا اشرف علی صاحب کے حسب منشا مولانا محمد علی مرحوم کو معزول کر کے مولانا حسین احمد مدنی کو جو اور بھی سیاست اور پولٹیکل کاموں سے ناواقف تھے اور پھر گریجوئیٹوں کے ویسے ہی مخالف تھے جیسے مولانا اشرف علی، ان کو جمعیت العلماء کا پریسیڈنٹ مقرر کیا۔ اب پرانے تعلیم یافتہ علماء علیحدہ ہو گئے اور گریجوئیٹس نے اپنا رُخ پھیر لیا۔ مولانا محمد علی مرحوم نے جا کر مسلم لیگ کو زندہ کیا۔ اور مسلمانوں کو مسلم لیگ میں جمع کر کے ہندوؤں سے اپنے حقوق منوانے کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔

جب مولانا سندھی مکہ معظمہ میں آئے تو مولانا حسین احمد مدنی بھی حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ میں پہنچ گئے۔ مولانا سندھی نے پہلے آہستگی سے اُن کو سمجھایا اور کہا کہ آپ مولانا شیخ الہند کی جگہ دارالعلوم دیوبند کے استاد بنے ہیں۔ آپ کو حق نہ تھا کہ مولانا محمد علی کو جنھیں مولانا شیخ الہند نے جمعیت العلماء کا پریسیڈنٹ بنایا تھا، ان کو معزول کر کے آپ پریسیڈنٹ بنتے۔ مولانا حسین احمد مدنی نے فرمایا کہ آخر یہ جمعیت العلماء تھی، اس کا پریسیڈنٹ بھی عالم ہونا چاہیے۔ اس پر مولانا سندھی کو بڑا غصہ آیا۔ اور کہا کہ تم کو کیا اختیار تھا، تم میں کیا علم تھا۔ کیا تم میں فضیلت تھی کہ تم ایک پولٹیکل جماعت کے سردار بنتے۔ تم نے کہاں سے سیاست سیکھی۔ مدینے میں تو سیاست ہے بھی نہیں۔ دو چار مہینہ تم شیخ الہند کے ساتھ قید میں رہے۔ بس اس سے تم سیاست سیکھ گئے۔ آپ کا نظریہ اور مولانا شیخ الہند کا نظریہ متضاد چیزیں ہیں۔ تم مولوی اشرف علی کے تابعدار ہو۔ مولوی اشرف علی نہیں چاہتے کہ سارے مسلمان ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو جائیں۔ میں تم کو کہتا ہوں کہ ہندوستان میں جا کر اپنی غلطی کی تلافی کرو۔ اور پھر مولانا محمد علی کو بلوا کر اس کا پریسیڈنٹ بناؤ۔ ورنہ میں تمھارا سر پھوڑ دوں گا۔ تم کیا چیز ہو کہ تم میرے استاد اور شاہ ولی اللہ کی ساری کی ساری تحریک کو برباد کرتے ہو۔

پھر تو مولانا حسین احمد رونے بیٹھ گئے۔ اس لیے جب مولانا سندھی ہندوستان میں آئے تو ہمیشہ مولانا حسین احمد ان کی مخالفت کرتے رہے۔ اور مسلم لیگ کے نوجوانوں کو کافر کہتے رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم لیگ کے نوجوانوں نے ایک ٹکڑا ہندوستان کا پاکستان کے نام پر آزاد کرالیا اور جمعیت العلماء سب کے سب ہندوؤں کے غلام بنے رہے۔ ہندوؤں کے یہاں بھی ان کی عزت نہیں نہ مسلمانوں کے یہاں ان کی عزت ہے۔

مولانا شیخ الہند کی تحریک کو مولانا حسین احمد نے یوں بیکار کر دیا۔ اب دارالعلوم دیوبند مولوی بنانے کی ایک مشین رہ گئی۔ نہ ان کی عزت پاکستان میں ہے نہ افغانستان میں اور نہ ترکی میں۔ مولانا شیخ الہند ہندوستان میں مسلمانوں کے بے تاج بادشاہ تھے۔ اور افغانستان میں ان کا وقار تھا۔ اور ترکی ان کے اشاروں پر چلتا تھا۔ اور ان کے خادم تمام یورپ میں انقلابی کام کر رہے تھے۔ اس بات کو وزیر اعظم انگلستان جانتا تھا۔ اور باقی بادشاہ یورپ کے بھی مولانا شیخ الہند سے ناشناس نہ تھے۔ اس لیے مالٹا میں ان کو کپتان کے درجہ پر رکھا اور تلوار بھی عنایت کر دی۔ اب اس وقت دارالعلوم دیوبند کے سرپرست مولانا طیب صاحب ہیں۔ ان سے کچھ تھوڑی بہت امید ہے کہ شاید وہ دیوبند کو اپنے اصلی منصب پر لے آئیں۔

لطیفہ :- جلسہ دستاربندی دیوبند میں مولانا شیخ الہند نے اپنا خرقہ مولانا سندھی کو پہنایا۔ اور مولانا اشرف علی صاحب نے اپنا خرقہ اتار کے مولانا شبیر احمد کو پہنایا۔ مولانا سندھی آخر تک مولانا شیخ الہند کی تابعداری میں سیاست میں رہے اور سیاست میں وفات پائی۔ ایک انچ بھی اپنے مرشد کے طریقے سے نہ ہٹے۔ مگر مولانا شبیر احمد صاحب دیوبند دارالعلوم کو چھوڑ کر اور مولانا اشرف علی کے طریقے کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں جا ملے جو کہ سراسر گریجوٹ اور نیچری تھے۔ اور مرتے دم تک مسلم لیگ میں رہے۔

جب مولانا محمد علی کو مولانا اشرف علی صاحب نے جمعیت العلماء سے معزول کیا۔ تو گورنمنٹ نے اُن کے بھائی کو جو سی۔ آئی۔ ڈی۔ یو۔ پی کے سپرنٹنڈنٹ تھے سارے ہندوستان کی سی۔ آئی۔ ڈی کا بڑا افسر بنا دیا۔ یہ عجیب بات علم تاریخ میں ایک اضافہ ہے کہ مولانا اشرف علی صاحب اپنے بھائی کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھے۔ ہم یقین کرتے ہیں کہ مولانا اشرف علی صاحب

تصوف میں بڑے مرتبہ کے اولیاء اللہ تھے مگر ان کے دل میں گریجوئٹوں سے نفرت تھی اور ساتھ ہی ساتھ نہیں چاہتے تھے کہ کسی پولٹیکل کام میں دست اندازی کریں۔ اسی طرح مولانا اشرف علی صاحب کو انگریزوں سے بھی نفرت تھی، ان کو دیکھنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اور ہندوؤں سے بھی نفرت تھی۔ اور جس شخص میں تھوڑی بہت بدعت ہو اس کو بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اور نہ اپنی خانقاہ میں رہنے دیتے تھے۔ ایک خاص وضع کے آدمی تھے۔ جس شخص سے ذرا بھی شریعت کے خلاف بات منہ سے نکلے اس کو کبھی منہ نہیں لگاتے تھے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ مولانا اشرف علی نے مولانا محمد علی کو حسد سے نکالا۔ مولانا محمد علی حافظ قرآن اور پکے نمازی تھے۔ داڑھی رکھتے تھے۔ وضع قطع مولویانہ تھی وہ بھی جبہ پہنتے تھے۔ مگر ان کے رفیق سارے کے سارے انگریزی پڑھے نئے فیشن والے تھے۔ اس لیے مولانا اشرف علی کو یہ بات پسند نہ آئی تھی۔

افسوس! جمعیت علمائے ہند کانگرسیوں کا دم چھلا بن کر رہ گئی۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سکھوں اور ڈوگروں سے جو معاہدہ ہوا تھا۔ اور روسی مشن کے ساتھ جو حکومت موقتہ نے سنہری تختی بھیجی تھی ــــ وہ بعد کا ہے۔

باب چہارم

۱۔ ہندوستانی حکومت کا ایک اخلاقی حملہ۔ ۲۔ استنبول مشن اور جاپانی مشن ممبروں کی گرفتاری۔ ۳۔ ہندوستانی مشن جس کے ساتھ ریشمی خطوط تھے۔

۴۔ ہماری نظربندی اور قید۔ ۵۔ انور پاشا کا خط۔

ڈاکٹر متھرا سنگھ اور مرزا احمد علی روسی مشن پر بھیج دیے گئے۔ ممبروں کے ساتھ دو خادم بھی روانہ کیے گئے۔ مرزا احمد علی کا خادم افغان تھا۔ اور ڈاکٹر متھرا سنگھ کا خادم ایک کابلی سکھ تھا۔ مشن ترمذ سے تاشقند پہنچا۔ گورنر تاشقند نے زار (یعنی بادشاہ روس) کو مطلع کیا۔ زار روس اس وقت پریشان تھا۔ اس کو شکستوں پر شکستیں ہو رہی تھیں اس لیے اس نے برطانیہ سے بہت سے مطالبات

شروع کردیے۔ اور اس مشن کی کارروائی کو بہانہ بنایا۔ برطانیہ اس مشن کو جعلی قرار دیتا تھا۔ لیکن روس اسے تسلیم نہیں کرتا تھا۔ اور افغانی حملہ سے خوف زدہ تھا۔ برطانیہ ہندوستانی ممبروں سے تفتیش کی۔ مگر صحیح طور پر معلوم نہ ہوسکا۔

برطانیہ نے وائسرائے ہند کی معرفت اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں شہید سے استفسار کیا۔ چونکہ اس مشن کی کارروائی اور حکومتِ مؤقتہ ہند کا قیام ایک خفیہ سازش تھی۔ اگرچہ سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت اس سے واقف تھے۔ مگر وہ بھی اپنے فائدے کو مدِنظر رکھتے ہوئے اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں کو صحیح بات نہیں بتا سکتے تھے، اس لیے صحیح علم نہ ہوسکا۔

بالآخر زارِ روس نے ممبروں کو .... گرفتار کرنے کا حکم دیا۔ مگر گورنر تاشقند کی مداخلت سے یہ لوگ قید سے بچ گئے۔

گورنمنٹ برطانیہ نے روس پر زور دیا کہ اس مشن کے ممبروں کو گرفتار کرو۔ پھر دیکھا جائے گا۔ مگر گورنر تاشقند کو سلامی وغیرہ سے شبہ پڑ گیا تھا کہ یہ مشن دراصل افغانی ہے۔ اور ڈر گیا تھا کہ اگر ہم نے زارِ روس کا حکم مان لیا اور اِدھر تاشقند پر افغانی حملہ ہوگیا تو میں جواب دِہ ہوں گا اس لیے انھوں نے ممبروں کو گرفتار نہ کیا۔ اس کی حقیقت ہم پہلے لکھ آئے ہیں)۔

یہ مشن بے کار ثابت نہیں ہوا۔ روسی انگریزی اتحاد میں بہت مشکلات پیدا کردیں، جس کی تلافی کے لیے لارڈ کچنر کو خود سفر کرنا پڑا۔ اس کا جہاز راستے میں ڈوب گیا۔ روسی انقلابیوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا، جس کا نام "سونے کی پٹڑی والی کتاب" ہے۔ ایک خط اس مشن کے ساتھ گورنر تاشقند کے نام تھا۔ اس میں اس مشن کے متعلق خط و کتابت مذکور ہے۔

گورنر تاشقند نے سونے کی پٹڑی والی کتاب کی ایک نقل اپنے پاس رکھی۔ اور جو خط گورنر تاشقند کی طرف تھا اس کی نقل بھی اپنے ساتھ رکھی۔ پھر سونے کی پٹڑی اور اپنا خط صندوق میں بند کرکے زار کو بھیج دیا۔ گورنر تاشقند کے مدیر وغیرہ سب کے سب انقلابی تھے۔ انھوں نے اس کا فوٹو اتار کر روسی انقلابیوں کی طرف بھیج دیا۔ اور روسی انقلابیوں نے اس کتاب کو پمفلٹ کی صورت میں سارے روسی لشکر میں تقسیم کردیا۔ لشکر میں بزدلی پہلے ہی سے تھی اور برطانیہ سے بہت سے شبہات اس کے دل میں تھے اس لیے سارے لشکر میں بھگ دڑ پڑ گئی۔ فوجوں نے پیچھے

ہٹنا شروع کر دیا۔ اور ماسکو کی طرف رخ کیا آخر انقلاب آگیا۔

جب یہ مشن واپس آیا تو ڈاکٹر متھرا سنگھ سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت کے سامنے پیش ہوا۔ سردار کے تمام سوالوں کے جواب میں یہی کہتا رہا کہ بخیر رفتیم و بخیر آمدیم۔ سردار صاحب حیران ہو کے رہ گئے۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت نے مرزا محمد علی کو بلایا اور سفر کی کیفیت پوچھی مرزا محمد علی نے تمام واقعات کی مختصر یادداشتیں لکھ رکھی تھیں۔ جیب سے اپنی کتاب نکالی اور مفصل حالات سے گفت و شنید کی اور آمد و رفت کا خلاصہ ذکر کر دیا۔ اس کے بعد سردار نائب السلطنت ہماری بہت زیادہ قدر کرنے لگے۔ اور خاص لوگوں سے کہا کہ اگر ہم مولانا عبید اللہ کی بات نہ مانتے تو راجہ صاحب کا فرستادہ ہمیں ایک حرف بھی نہ بتلاتا۔

اس کے بعد وہ راجہ صاحب اور ان کے ساتھیوں سے بدظن ہونے لگا۔ اور مولانا سندھی کے اوپر بہت اعتماد کیا۔...... پھر مولانا سندھی کے مشورے پر کام کرنا شروع کیا۔ ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ سکھوں اور ڈوگروں سے معاہدہ ہوا۔ یہ سب اس مشن کے آنے پر ہوا۔ اور کام جلدی ہونے لگا۔ اور برطانیہ گورنمنٹ ہند کو اشارہ کیا کہ یہ سب کچھ شاید مولوی عبید اللہ کی تدبیروں سے کام ہو رہا ہے۔ اس لیے گورنمنٹ ہند نے مولانا عبید اللہ پر اخلاقی حملہ کیا۔

ہندوستانی حکومت کا ایک اخلاقی حملہ:۔ ہماری تربیت ہندوستانی تعلیمات میں علمائے دیوبند کے مسلک پر ہوئی ہے۔ دیوبندی جماعت فقہ حنفیہ کی پابند ہے۔ لیکن بہت سے غلط رسوم کی تردید میں مولانا اسمٰعیل شہید کے طریقے پر چلتی ہے۔ اس میں یہاں تک مبالغہ کیا جاتا ہے کہ مولانا اسمٰعیل شہید کی اصل اتباع میں یہ دیوبندی جماعت کے لوگ ہیں۔ دیوبندی جماعت اپنے سوا کسی کو مسلمان نہیں جانتی، یہ گمان دیوبندی جماعت کے مخالفین کا ہے۔ حالانکہ دیوبندی جماعت اور مخالفین دیوبندی جماعت دونوں فقہ حنفیہ کے پابند ہیں۔ اور مولانا اسمٰعیل شہید بھی فقہ حنفیہ کے پابند تھے۔ اور مولانا شہید نے جو غلط رسوم کی تردید کی ہے وہ بھی مسلک فقہ حنفیہ کے عین مطابق ہے۔

سندھ میں میں نے بیس سال زندگی بسر کی ہے۔ میرے بزرگ سندھی سب اسی دیوبندی مسلک کے پابند ہیں۔ اگرچہ علمائے دیوبند سے ان کے افادہ اور استفادہ کا کوئی رابطہ نہیں۔ میرے بزرگ سندھیوں کے مسلک کے مخالف سندھ میں ایک جماعت پیروں اور مولویوں کی کافی تعداد میں ہے۔ ہندوستانی حکومت نے ہمارے بزرگوں کے مسلک کے مخالف جو پیر اور مولوی تھے ان میں سے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جن کا قندھار کے پیروں سے بہت قوی تعلق تھا۔ مثلاً سرہندی مجددی پیروں کا قندھار سے تعلق تھا ان قندھاری بزرگوں میں چند پیر کابل تشریف لائے۔ اور سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت سے ملے اور انھیں یقین دلایا کہ مولوی عبید اللہ سندھی حکومتِ ہند کا فرستادہ ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ افغانستان کے لوگوں کا مذہب خراب کر کے افغانی حکومت کے اسرار اور رازوں سے انگریزوں کو مطلع کرتا رہے۔

پہلے تو انھوں نے گورنر قندھار کو لالچ دیا کہ ان دو مولویوں کو جو تمہارے پاس ہندوستان سے آئے تھے اگر آپ واپس کر دیں تو ہر ایک مولوی کے عوض ایک لاکھ روپیہ ملے گا۔ مولوی دو تھے ایک مولوی عبید اللہ سندھی اور دوسرے مولوی عبید اللہ لغاری۔ اس کا قصہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔

سردار نائب السلطنت کے سکریٹری نے ہم سے ذکر کیا۔ ہم نے اس کو تھوڑا سا سمجھا دیا کہ ہمارے متعلق وہ افغان سی۔ آئی۔ ڈی کے افسروں کو مقرر کر کے حکومت ہند کی رائے معلوم کریں۔ اگر حکومتِ ہند سے ان کو معلوم ہو کہ یہ مولانا عبید اللہ سندھی حکومتِ ہند کے فرستادہ ہیں تو اس بناء پر جس قدر سزا ہو اس سے دریغ نہ کریں۔ اگر ذرا سا شبہہ مجھ پر ثابت ہو، تو مجھے توپ سے اُڑایا جائے۔ دوسری صورت میں جہاں سے میں آج کام چھوڑ دیتا ہوں وہیں سے پھر شروع کروں گا۔ گویا یہ زمانہ میری بیماری کی رخصت میں شمار ہوگا۔ غالباً یہ تجویز نائب السلطنت کو پسند آئی اور اس پر عمل کیا۔ ہمیں معلوم ہوا کہ افغان سی۔ آئی۔ ڈی نے کہا کہ مولانا سندھی انگریزوں کے سخت دشمن ہیں اور گورنمنٹ ہند ان کو گرفتار کرنا چاہتی تھی یہ بھاگ نکلے ہیں

جب یہ بات سردار نائب السلطنت کو معلوم ہوئی، تو پھر انھوں نے خاص طور پر ہمیں باریاب فرمایا۔ اور حکم دیا کہ اپنا کام کرو۔ اور میں اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

یہ اخلاقی حملہ روسی مشن واپس آنے کے بعد واقع ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ پیر لوگ کتنے ہی غداری کے کام کرتے ہیں۔ اور کتنا بدنام کرتے ہیں۔ اور گورنمنٹ ہند کے ہاتھ میں یہ لوگ کٹھ پتلی ہوتے ہیں۔ ان کے اشاروں پر چلتے ہیں۔ یہ پیر لوگ عموماً سرمایہ پرست ہوتے ہیں۔ اور رجعت پسندی اور ری ایکشنری ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔

استنبول اور جاپانی مشن :۔ ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ روسی مشن کامیابی کے ساتھ واپس آیا۔ اس وقت جرمن ترک مشن موجود تھے۔ راجہ صاحب نے ان سے صلاح مشورہ کرکے استنبول مشن اور جاپان مشن تیار کرلیا۔ اور ان مشنوں کو.... جانے سے پہلے جرمن ترک مشن تو اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے رخصت کردیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ اگر جرمن ترک فوجیں افغانستان پہنچیں گی تو دیکھا جائے گا۔ اس لیے انگریزوں نے اپنی فوجیں درۂ دانیال پر اتار دیں تاکہ ترک جرمنوں کو ایک لاکھ فوج کی بھیجنے کی نہ طاقت رہے اور نہ راستہ رہے۔ احتمال ہوسکتا ہے کہ انگریزوں کو خبر پڑی ہوگی کہ مولانا شیخ الہند مدینہ منورہ میں انور پاشا سے مل کر توجہ دلائیں کہ ایک لاکھ فوج افغانستان کو بھیجنا چاہتے ہیں۔ مولانا شیخ الہند کے ساتھی جتنے تھے ان رازوں کو فاش کرنے کے اقرار سے احتراز کرتے تھے۔ اگرچہ وہ نہایت مخلص تھے اور مولانا شیخ الہند نے نہایت احتیاط سے انور پاشا سے ملاقات کی تھی۔ اس خیال سے، کہ ان کے ساتھیوں نے راز فاش کردیا ہو۔ انگریزوں نے احتیاطی تدبیریں کرنی شروع کردی تھیں۔

انگریزوں نے بصرہ پر حملہ کرکے اپنی فوجیں اتار دیں۔ پھر آگے بڑھ کر انگریزوں نے...... قط العمارہ پر قبضہ کرلیا۔ سندھ میں مولانا شیخ الہند کا خاص شاگرد مولانا محمد صادق کراچی والا تھا۔ اس کا اثر تمام سندھ و بلوچستان پر تھا۔ اور مولانا شیخ الہند جس طرح کابل کا کام مولانا عبید اللہ سندھی کو سپرد کیا تھا

اسی طرح سندھ اور بلوچستان کا کام مولانا محمد صادق کو سپرد کیا گیا۔ اس نے کوشش کر کے بلوچستان میں مینگل زئی کے سرداروں کو جس میں سردار نور دین مینگل زئی بہت جوشیلا نوجوان تھا اس کی طرف محمد صالح بردہی کو روانہ کر دیا۔ اس کا اکثر خرچ شیخ عبدالرحیم حیدر آباد سندھ پورا کرتا رہا۔ جب انگریزی فوجوں نے قطالعمارہ پر قبضہ کر لیا تھا اور آگے بڑھنے کی کوشش میں تھے تو اس میں ایک طرف مولانا محمد صادق کے والد کے شاگرد نے چہبار بندرگاہ بلوچستان پر حملے کی تیاری کر لی اور حملہ کرنے لگا۔ اور دوسری طرف مینگل زئی قوم نے بغاوت شروع کر دی۔

انگریزوں کے پاس فوجیں بہت کم تھیں پنجاب سے بھرتی کر کے راولپنڈی میں فوج رکھتے تھے۔ جب کراچی کی فوجیں بصرہ کو گئیں، تو کوئٹہ کی فوجیں کراچی میں آ گئیں اور کوئٹہ میں راولپنڈی کی فوج آ گئی تھی۔ انگریزوں کی تدبیر یہ تھی کہ اب قطالعمارہ پر فوجوں کو آگے بڑھایا جائے تاکہ بندرگاہ پر قبضہ کریں۔ لیکن قطالعمارہ کی فوجوں کے مقابلے پر ترکی فوجیں حاضر ہو گئیں۔ اب ضرورت تھی کہ کراچی کی فوجیں بصرہ پر جائیں اور بصرہ کی فوجیں قطالعمارہ کی مدد کے لیے جائیں، مگر بلوچستان میں سخت بغاوت ہو گئی۔ ایک طرف چہبار پر حملہ کا خوف اور دوسری طرف کوئٹہ اور کراچی پر بلوچستان کی بغاوت کا اثر پڑا تھا اور راولپنڈی پر حاجی ترنگ زئی کی بغاوت کا خوف تھا۔ اس لیے کراچی کی فوجیں اپنا مقام نہیں چھوڑ سکتی تھیں نہ کوئٹہ کی اپنا مقام چھوڑ سکتی تھیں نہ راولپنڈی کی فوجیں اپنا مقام چھوڑ سکتی تھیں۔ اس لیے قطالعمارہ کی فوجوں کو انگریزی فوجوں کی مدد نہ پہنچ سکی اور قطالعمارہ میں محصور ہو گئے۔ اور ترکوں نے ان کو گرفتار کر لیا۔ جب درۂ دانیال پر انگریزوں کا سخت حملہ ہوا تو ترکی کی فوجیں جو بغداد میں تھیں ان کو درۂ دانیال کی طرف لوٹنا پڑا۔ اور بلوچستان کی بغاوت بند کرنے کے لیے انگریزوں نے کوشش کی اور مولانا محمد صادق کو گرفتار کر کے پونا کی طرف بھیج دیا۔ اس جد و جہد سے بلوچستان کی بغاوت بند ہو گئی۔ اور چہبار کی طرف مولانا محمد صادق کے والد کے شاگرد نے، شاید اس کا نام خیر محمد تھا اس نے انگریزوں کو شکست دی۔ انگریزوں کی فوج بند ہو گئی۔

اس کے بعد جب شورشیں بند ہو گئیں تب بصرے کی فوجوں کو مدد ملی اور انھوں نے جاکر قط العمارہ پر قبضہ کر لیا اور مولوی محمد صالح بروہی کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا انگریزوں کو معلوم ہو گیا کہ بلوچستان کی بغاوت میں مولوی محمد صالح کا ہاتھ تھا۔

مولوی محمد صالح مرحوم فرماتے تھے کہ ایک بار کراچی کے کلکٹر نے مجھ کو بلا کر کہا کہ تم کو ہم گرفتار کر کے نظر بند کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے تم کو چاہیے کہ اس میرے آدمی کے ساتھ میری موٹر پر گھر جاکر اپنا بستر اسامان لے کر پھر کراچی بندر پر پہنچ جاؤ۔ گھر میں رہنے اور بال بچوں سے ملنے کی صرف چار منٹ اجازت ہے۔ اور مہربانی کر کے انھیں گرفتاری اور نظر بند کی خبر نہ کرنا کیونکہ اگر تمھاری جماعت ناخہ قوم نے یہ بات سنی تو بغاوت کر دیں گے۔ پھر اس کی ذمہ داری تم پر ہوگی کلکٹر نے کہا کہ یہ رخصت دینی خاص میری مہربانی ہے اور ہوشیار کرنا ہے۔ میں گھر آیا اور کچھ سامان اور روپے لے کر موٹر میں رکھا اور جلدی میں چلتے وقت اپنے گھر والوں کے کان میں کہا کہ میں نظر بند ہو گیا ہوں۔ یہ راز پندرہ منٹ تک کسی کو نہ کہنا۔ اس کے بعد تمھاری مرضی۔ اب میں سفر پر جاتا ہوں۔ پھر میں موٹر میں سوار ہو کر سیدھا بندر پہنچا۔ میرے جانے کے بعد جب پندرہ منٹ گزر چکے تو میری گھر والی نے ناخہ قوم کو اطلاع کر دی۔ ناخہ جماعت بندر کو دوڑی۔ مگر جیسے ہی میں پہنچا مجھ کو جہاز پر سوار کر لیا گیا اور جہاز بندر چھوڑ کر بڑے دریا میں پہنچ گیا۔ اس لیے ناخہ جماعت واپس چلی گئی۔ اور کوئی گڑبڑ نہ ہوئی۔ جب جنگ ختم ہو گئی تو پونا کے کلکٹر نے مجھ کو بلا کر کہا کہ اب ہم تم کو آزاد کرتے ہیں۔ مگر آیندہ ایسا کام مت کرنا۔ میں نے کہا کہ میں نے تو کوئی کام نہیں کیا۔ کلکٹر نے کہا یہ تمھاری ہی کارروائی جو تاریخ بن گئی ہے۔ پھر مجھے رخصت کر دیا۔

یہ مولانا مولوی محمد صادق صاحب کراچی والے کا کارنامہ ہے۔ یہ قصہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔ اب انگریزوں نے پیش بندی کر کے سارے ایران پر اپنی فوجیں پھیلا دیں۔ اب ہمارا مشن استنبول جانے والا تھا۔ اور جاپان مشن کو بھی روانہ کرنا تھا۔ یہ دونوں مشن جرمن ترک مشن کے رخصت ہونے کے بعد روانہ ہوئے۔ اس وقت جرمن ترک مشن کے افسر روانہ ہو چکے تھے۔ اور ہندوستانی کابل میں رہ گئے تھے۔ اور اس مشن کا خرچ تین سو پاؤنڈ

جرمن کیپٹن سرکاری خزانہ کابل میں میرے نام چھوڑ گئے تھے۔

پہلے مشن (یعنی روسی مشن) کی کامیابی پر راجہ صاحب نے دو مشن اور بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ایک ہمارے منشاء کے مطابق استنبول بھیجا گیا۔ اس میں ہمارے رفیق عبدالباری بی۔اے اور ڈاکٹر شجاع اللہ شامل کیے گئے۔ یہ ایران کے راستے استنبول گیا۔ دوسرا مشن مولانا برکت اللہ کی تجویز پر مقرر ہوا۔ اس میں شیخ عبدالقادر بی۔اے۔ اور ڈاکٹر متھرا سنگھ مقرر ہوئے۔ یہ مشن روس کے راستے سے جاپان گیا۔

مشن استنبول کا مقصد تھا کہ ترکی فوج کو جلد سے جلد افغانستان روانہ کرنا ضروری ہے مولانا سندھی نے سکھوں اور ڈوگروں سے معاہدہ کر رکھا تھا۔ اور خوف تھا کہ اگر انگریزوں کو اس کی واقفیت ہو گئی تو اس کا ردِعمل سوچیں گے۔ دورانِ جنگ میں جاپان برطانیہ سے بہت سی باتوں سے ناراض ہو گیا تھا۔ یہ اطلاع پہنچ چکی تھی اس لیے جاپان میں اس مشن نے جاکر برطانیہ کے خلاف کرنے کی تدبیریں کیں۔ جیسے روس میں پہلے مشن نے گڑبڑ مچائی۔ ان دونوں مشن کے ساتھ اہم کاغذات بھی تھے۔ اور خطوط بھی تھے۔

جرمن مشن کا افسرِ اعلیٰ کیپٹن ہنٹیش سب سے پہلے کابل سے واپس ہوا۔ اعلیٰ حضرت امیر صاحب نے رخصت کا فرمان دے دیا۔ یعنی ترکی تک پہنچنے کا پاسپورٹ دے دیا۔ وہ جانے کے وقت تین سو پونڈ میرے نام چھوڑ گیا۔ راجہ صاحب نے مجھے حکم دیا کہ وصول کر لوں۔ اس میں سے ایک سو پونڈ تو راجہ صاحب اور مولانا برکت اللہ صاحب نے اپنے کپڑے تیار کرنے کے لیے لے لیے۔ اور دو سو پونڈ شیخ محمد ابراہیم صاحب کے پاس امانت رکھے گئے۔ شیخ محمد ابراہیم صاحب، مولوی محمد علی صاحب اور میرا بھتیجا عزیز احمد جس گھر میں رہتے تھے، اُس پر رات کو ڈاکہ پڑا اور وہ تمام روپیہ دونوں صاحبوں کے کپڑے اور سامان ڈاکو لے گئے۔

مجھے خطرہ ہوا کہ راجہ صاحب اس ڈاکے کو ہمارے روپیہ ہضم کرنے کا بہانہ تصور کریں گے۔ جب استنبول مشن جانے کا وقت آیا تو اس کے لیے سو پونڈ مولانا محمد بشیر وکیل رئیس المجاہدین سے قرض لے کر ادا کر دیے۔ مولانا محمد بشیر صاحب کا

یہ احسان میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ قرض تو فقط نام کا تھا۔ اگرچہ بعد میں مرزا محمد علی نے ادا کر دیا۔ یہ مشن استنبول روانہ ہو گیا۔ دوسرے مشن کی روانگی سے پہلے سرکاری طور پر ڈاکے کی تصدیق ہو گئی۔ اور چوروں کے پاس روپیہ کا ثبوت مل چکا تھا۔ اگرچہ ہمیں اس سے کچھ بھی نہیں ملا۔

یہ ڈاکہ ڈالنے والے فوجی آدمی تھے۔ کسی فوجی افسر کا اس میں ہاتھ تھا۔ مختلف تعبیریں اس ڈاکے کے متعلق بیان کی جاتی تھیں۔ بعض کا گمان تھا کہ انگریزی کونسل کا اشارہ تھا۔ بعض اس کو کسی ذی اثر شخص کا اشارہ سمجھتے تھے ـــــ افغانی حکومت کا قانون تھا کہ چوری شدہ چیز مل جاتی تو مالک کو واپس کر دی جاتی۔ اگر چوری کا مال برآمد نہ ہو تو سرکاری خزانہ سے ادا کر دیا جاتا تھا۔ اور ڈاکہ شدہ علاقہ کے گرد و نواح سے دس گونہ تاوان لیا جاتا تھا۔ مگر ہمارے ڈاکہ کی تصدیق اور روپیہ کا ثبوت ہونے پر بھی ہم کو کچھ نہ ملا۔ اس لیے ہم کو یقین ہو گیا کہ کسی افسر کا اس میں ہاتھ ہے۔ ورنہ سردار نائب السلطنت ضرور سامان وغیرہ روپیہ ہم کو واپس دلاتے۔ معلوم ہوتا ہے وہ افسر ذی اثر آدمی تھا جس سے نائب السلطنت اور سپہ سالار صاحب کوئی بازپرس نہ کر سکتے تھے۔ اس کا حال کچھ مولانا سندھی کو معلوم تھا۔ مگر وہ بیان نہ کرتے تھے۔

اب راجہ صاحب کے کہنے سے میں اور مولانا برکت اللہ صاحب مل کر سردار نائب السلطنت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ میں روپیہ ضایع ہونے کا ذکر کیا۔ اور ایک سو پونڈ کی ضرورت ظاہر کی۔ سردار صاحب نے بکمال مہربانی وعدہ فرمایا اور شام کو خود سو پونڈ ساتھ لا کر میرے حوالے کیے۔ اس طرح سے دوسرا مشن یعنی جاپانی مشن بھی روانہ ہو گیا۔

ہر دو مشن غالباً مارچ یا اپریل ۱۹۱۶ء میں روانہ کئے گئے سرحد افغانستان تک بھیجنے کا انتظام بہت اعلیٰ پیمانہ پر تھا۔ اور افغانستان کی سرحد پر پہنچ کر ایران کی سرحد میں ترکی مشن داخل ہو گیا۔ وہاں ان کو گرفتاری کا خوف ہوا۔ انھوں نے احتیاطاً سب دستاویز جلا دیں۔ یا گڑھ میں ڈال دیں۔ اور اپنے پاس کوئی مشتبہ چیز نہ رکھی۔ دوسری تیسری منزل پر ترکی مشن گرفتار ہو کر فوراً لاہور پہنچا دیا گیا۔ اور اسی طرح جب جاپانی مشن سرحد میں داخل ہوا تو وہ بھی گرفتار

کرلیا گیا۔ انھوں نے بھی کوئی مشتبہ چیز اپنے پاس نہ رکھی تھی۔ وہ بھی لاہور لائے گئے۔ سر محمد شفیع کی کوشش سے انھوں نے بیان دیے۔

ممبروں کی گرفتاری :۔ استنبول مشن کے ممبروں کو ایران میں خود انگریزوں نے گرفتار کیا۔ دوسرا جاپانی مشن جب روسی سرحد عبور کر چکا تو روس نے ان کو گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کیا۔ چار کے چار ممبر گرفتار ہو کر لاہور پہنچے۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ چونکہ ایک بم کیس میں مفرور تھا نور اُسے پھانسی پر لٹکایا گیا۔ اور باقی تین ممبر نظر بند کر دیے گئے۔ ان میں سے عبدالباری جو ہر موقع پر ہمارے ساتھ اور نوجوانوں کی جماعت کا رئیس تھا سر محمد شفیع کا رشتہ دار نکلا۔ اسے معافی مانگنے پر راضی کیا گیا۔ اس نے تمام واقعات حکومتِ موقتہ ہند کے اور جنود اللہ اور جماعت مجاہدین کے مفصل لکھ دیے .... بعد میں عبدالباری بی۔ اے اور ڈاکٹر شجاع اللہ نے اس پر دستخط کر دیے۔ کچھ عرصہ نظر بند رکھ کر انھیں چھوڑ دیا گیا۔

حکومتِ ہند روسی مشن کے زمانہ سے واقعات کی تحقیق کے لیے پریشان تھی۔ اب اُسے اطمینان سے مفصل حالات کی اطلاع مل گئی۔

"ان نوجوانوں نے جو اپنے بیان میں واقعات بیان کیے تھے، میرا خیال یہ ہے کہ انھوں نے یہ تمام کارروائی حکومتِ موقتہ ہند کی راجہ مہندر پرتاپ پریسیڈنٹ اور جنود اللہ کی تنظیم مولانا بشیر احمد رئیس وکیل مجاہدین کے نام پر بیان کی۔ مگر ہمارے متعلق اور نوجوانوں کے متعلق جو میرے ساتھی تھے ان کا کچھ ذکر نہیں کیا تھا۔ اس کی حقیقت یوں معلوم ہوئی کہ انگریزوں کے اعتراض پر جو انھوں نے افغانستان سے کیا تھا، اس کا اثر مجھ پر اور میرے رفیق نوجوانوں پر نہ پڑا تھا۔ اگر یہ ممبر میرے اور میرے رفیقوں کی رفاقت بھی حکومت موقتہ ہند سے بیان کرتے یا جنود اللہ سے کرتے تو ضرور ہم اس وقت گرفتار ہو جاتے۔ مگر ہماری آزادی ویسی کی ویسی رہی۔ اس لیے ہمارا غالب گمان ہے کہ انھوں نے اپنے بیان میں میرا اور میرے نوجوان رفیقوں کا تعلق ظاہر نہیں کیا۔ اور نہ اپنا تعلق ظاہر کیا۔ یہ تینوں نوجوان میرے ہمراز تھے۔ میرے دست و بازو تھے۔ انھوں نے اپنے بیان میں ہندوستانی مسلمانوں پر

کچھ بھی چھینٹا نہ ڈالا۔ ایک تو اسی سبب سے مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہمارے انقلابی راز بالکل نہیں بتائے تھے۔ دوسرے جب لالہ لاجپت رائے مجھ سے استنبول میں ملنے کے لیے آیا تو جتنی حقیقت ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، اور میرے منہ سے باتیں سن کر پھر جا کر انگلستان کے وزیرِ ہند سے بیان کیں تو وزیرِ ہند کو اس سے آگے یہ سب کچھ معلوم تھا کہ یہ سب سازشیں ہندو لوگ کر رہے ہیں۔ اور حکومتِ موقتہ ہند بھی راجہ صاحب ہی نے بنائی ہے۔ اس لیے الٹا وزیرِ اعظم ہند لالہ لاجپت رائے پر ناراض ہوا۔ اور جب وہ لاہور میں پہنچا تو پولیس نے ان کو اس قدر مار پیٹ کی کہ وہ ان ضربات سے مر گئے۔

اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان نوجوانوں نے اپنے بیان میں ہمارے اور ہمارے رفیقوں کے متعلق کچھ نہیں بتایا تھا۔ اگر بتاتے تو ہم بھی نظر بندی کی زد میں آجاتے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ ان ممبروں کے ساتھ حکومتِ موقتہ ہند کے دستاویز تھے اور سردار نائب السلطنت کے خطوط بھی تھے، جو انھوں نے انور پاشا کو لکھے تھے اور جاپان کے بادشاہ کو لکھے تھے۔ ان نوجوانوں کی یہ عقل مندی تھی کہ انھوں نے یہ سب آگ کی نذر کر دیے۔ ڈاکٹر متھرا سنگھ معمولی عقل والے تھے اس لیے میں نے سب دستاویز عبد الباری کو دیے۔ یہ جلانے کی تجویز اس کی تھی۔

یہ بیان میں نے اس لیے دیا ہے کہ ترکی مشن کے دو ممبر عبد الباری بی۔ اے اور ڈاکٹر شجاع اللہ، اور جاپانی مشن کے افسر ممبر عبد القادر بی۔ اے ایسی ہمت والے تھے۔

حکومتِ ہند کے پروٹسٹ کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ محمد ابراہیم خاں اور مولوی محمد علی قصوری حبیبیہ اسکول سے معزول کر دیے گئے اور میرا بھتیجا عزیز احمد جو حبیبیہ اسکول کا طالب علم تھا، خارج کر دیا گیا۔ عزیز احمد کے ہم جماعت کونسل اور نائب وزیر اور جرنل اور ممبر بن گئے۔ اور یہ میرا بھتیجا عزیز احمد باوجود علمی و عملی لیاقت میں ان سے کسی طرح کم نہیں تھا اسی طرح جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔ اس طرح ہم اپنی حکومت ضائع کر کے اپنی نسل کو برباد کر رہے ہیں۔

پاکستان بننے کے بعد بھی اب تک وہ کراچی میں جوتیاں چٹخا رہا ہے۔ افسوس کہ ہماری

قوم (مسلمانوں) میں احساس نہیں ہے ورنہ مولوی عزیز احمد صاحب انگریزی، روسی، ترکی اور عربی کے بڑے ماہر ہیں۔ مولوی عزیز احمد مولوی احمد علی لاہوری کے بھائی اور مولانا سندھی کے بھتیجے ہیں۔ ان کی انگریزی تعلیم ۔ پھر جب مولانا روس گئے تو ماسکو کے اسکول میں ان کو روسی زبان سیکھنے کے لیے داخل کر دیا۔ روسی زبان لکھنا پڑھنا خوب جانتے ہیں۔ پھر جب مولانا استنبول میں آ گئے۔ تین سال سے زیادہ عرصہ رہے۔ اس عرصے میں ان کو ترکی زبان سیکھنے اور پڑھنے کا موقع مل گیا۔ ترکی بھی لکھ پڑھ سکتے تھے۔ پھر مکہ معظمہ میں مولانا سندھی آئے اور تیرہ سال قیام کیا۔ اس عرصہ میں عزیز احمد نے عربی زبان میں بڑی مہارت حاصل کر لی۔ اُردو، سندھی اور فارسی زبان میں ان کو لطور خاص عبور حاصل ہے (جاوی اور بنگالی بھی جانتے ہیں)۔ میں افسوس کرتا ہوں کہ ایسے لائق آدمی کو پاکستان کے کسی محکمہ میں جگہ نہ ملی۔ ورنہ ان کی لیاقت بڑی اعلیٰ درجے پر ہے۔ یہ عرب میں سفیر بن سکتے ہیں، ماسکو میں سفیر بن سکتے ہیں۔ اور پشتو زبان کے ماہر ہیں افغانستان میں سفیر بن سکتے ہیں۔ اور روس میں بھی۔ مگر پاکستان میں کام کرنے والے نوجوان ان کی عزت نہیں کرتے۔ اس لیے ہم کو کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے مسلمانوں کی سلطنت قائم ہوئی یا بھارت آزاد ہوا مگر یہ بیچارہ ویسا ہی جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔

شیخ محمد ابراہیم خاں اور مولوی محمد علی نے فیصلہ کیا کہ وہ یاغستان میں رہیں گے شروع میں یہ دونوں مجاہدین میں رہے۔ پھر شیخ محمد ابراہیم خاں حاجی ترنگ زئی کے پاس گئے۔ اور پشتو سیکھ کر لوگوں کو قرآن شریف کی تعلیم دیتے رہے۔ کچھ عرصے کے بعد افغانستان سے گزر کر روس پہنچنے کی کوشش کی راستے میں فوت ہو گئے۔ شبہ کیا جاتا ہے کہ ڈاکو یاغستان سے ان کے ساتھ تھے انھوں نے شیخ صاحب کو شہید کر دیا۔ آخری وقت میں شیخ محمد ابراہیم خاں نے دوسرے ساتھی کو ایک خط لکھا، وہ میں نے پڑھا تھا۔ اس کے ایک لفظ سے شبہ ہوتا ہے کہ شیخ صاحب سمجھانا چاہتے ہیں کہ بہت ممکن ہے کہ وہ ڈاکو نہ ہو بلکہ انگریزوں کا ایک کارندہ ہو۔ شیخ محمد ابراہیم نے یہ سفر انقلاب روس کے بعد شروع کیا تھا۔

جب شیخ محمد ابراہیم خاں نے روس کا سفر اختیار کیا تھا، اس وقت مولانا سندھی اور ان کے رفقاء نظر بند تھے۔ سیٹھ عبداللہ ہارون نے مولانا سندھی کے کہنے پر شیخ محمد ابراہیم کو

کابل کے تیار کرنے کے لیے تقریباً ایک ہزار روپیہ امدادی طور پر دیا تھا۔ اس رقم کو دیتے وقت مولانا سندھی اور مولانا محمد صادق کراچی والے بھی تھے۔ جب محمد ابراہیم خاں کی شہادت کی خبر کراچی پہنچی تو سیٹھ عبداللہ ہارون نے ان کی عورت پر ان روپیوں کا دعویٰ کر دیا۔ اور وہ رقم مکان نیلام کر کے حاصل کی۔ مولانا محمد صادق نے ان کو سمجھایا، مگر سیٹھ صاحب یہ کہتے تھے کہ یہ رقم میرے کھاتہ میں لکھی ہوئی ہے۔ اگر میں خیرات دیتا تو کھاتے میں نہ لکھتا۔

مولوی محمد علی قصوری کچھ عرصہ تک مجاہدین میں رہے پھر کسی طرح سر عبدالقیوم جو پشاور کے کمشنر تھے، ان کی معرفت معافی لے کر ہندوستان پہنچ گئے۔ ان کے بیانات سے بھی ہندوستانی گورنمنٹ کے علم میں کچھ اضافہ ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ سر عبدالقیوم خاں کمشنر پشاور نے وائسرائے ہند کو لکھا تھا کہ یاغستان میں جتنی گڑبڑ یا بغاوتیں ہوتی ہیں خصوصاً اس جنگ ۱۹۱۴ء میں سب کے سب ہندوستانی لوگ ہیں، جو ہندوستان سے فرار ہو کر یاغستان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ فراری لوگ یا تو کسی مقدمہ میں پھنسے ہوئے ہوتے ہیں، یا خونی ہوتے ہیں، یا ڈاکو ہوتے ہیں اس لیے سر عبدالقیوم نے لکھا تھا کہ اگر ان لوگوں کو ہر طرح کی معافی دے کر ہندوستان واپس آنے کی اجازت دے دی جائے تو یہ گڑبڑ اور بغاوت فرو ہو سکتی ہے۔ اس لیے وائسرائے ہند نے یہ تجویز منظور کر لی۔ اور جو لوگ ہندوستانی یاغستان میں تھے ان کو اطلاع دی گئی کہ جو شخص میرے پاس آکر معافی مانگے اور وعدہ کرے کہ آئندہ ہندوستان میں پر امن طریقہ سے رہے گا تو میں اُسے معافی کا پروانہ دے دوں گا۔ جتنے ان پر مقدمے اور ڈکیتی کے کیس ہیں سب معاف ہیں۔ مولانا محمد علی قصوری بھی معافی کا پروانہ لے کر واپس ہندوستان آئے۔ اس طرح سے بہت سے سندھی اور پنجابی جو خونی اور ڈاکو مقدموں میں بھاگ کر چلے گئے تھے وہ سب معافی نامہ لے کر واپس آگئے۔ ان سے کوئی بیان نہیں لیا گیا۔ اسی طرح مولوی محمد علی سے بھی کوئی بیان نہیں لیا گیا۔

یہ دونوں مشن استنبول اور جاپان کو جانے والے غالباً اپریل سنہ ۱۹۱۶ء میں روانہ ہوئے تھے اور وہ گرفتار ہو گئے۔ مشن استنبول اور جاپان کی گرفتاری کا حال ہم کو معلوم نہ ہوا۔ اور نہ ان لوگوں کا یعنی مولوی محمد علی کو جو کابل سے نکال دیا اس کا سبب کیا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی۔ نائب السلطنت سے پوچھا۔ مگر انھوں نے کہا ہم کو بھی خبر نہیں۔ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے اپنے حکم سے ان کو نکالا ہے۔

میں نے سردار سپہ سالار سے پوچھا تو ان کو بھی اس کی حقیقت معلوم نہ تھی۔ خیر ہم نے سمجھا کہ غصہ کا کوئی اور سبب ہے جس کی حقیقت ہم کو معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی سیاسی بات ہوتی تو ضرور اس کا اثر مجھ پر بھی پڑتا اور میرے نوجوان رفیقوں پر بھی پڑتا۔ چونکہ ہم مطمئن تھے اس لیے میں نے یہ سمجھا کہ ہندوستان کو بھی ایک مشن بھیجا جائے۔

ہندوستانی مشن:۔ یہ واقعہ غالباً مئی سنہ ۱۹۱۶ء کا ہے جب یہ دونوں حضرات شیخ محمد ابراہیم خاں اور محمد علی قصوری صاحب) یاغستان جا رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک ہندوستانی مشن بھی بھیجا گیا۔ اس مشن کا ایک حصہ وہ کاغذات تھے جو میں نے اور مولانا منصور نے حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں لبطور رپورٹ لکھے تھے۔ ہم نے انھیں نوجوانوں میں سے ایک نومسلم شیخ عبدالحق پر اعتماد کیا۔ اسے ریشمی کپڑے پر لکھ کر مکتوبات دیے کہ وہ شیخ عبدالرحیم حیدرآبادی کو پہنچا دیے کہ شیخ صاحب حج پر جائیں تو مکہ مکرمہ میں حضرت مولانا شیخ الہند کی خدمت میں پیش کریں۔ ان خطوط کا مضمون رپورٹ رولٹ ایکٹ کمیٹی کا تھا۔

اس نومسلم شیخ عبدالحق، اللہ کے بندے نے وہ خطوط اللہ نواز خاں کے والد خان بہادر حق نواز خاں کو دیے۔ یہ واقعات اوپر آ چکے ہیں۔

اس کے بعد کے واقعات مشہور ہیں۔ ہندوستان میں گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ ہم حیران رہ گئے چند روز کے بعد حضرت شیخ الہند اور ان کے رفقاء مکہ معظمہ سے گرفتار ہوئے۔ ایک عرصہ کے بعد ہمیں حقیقت معلوم ہوئی۔ یہ واقعات ہمارے لیے زیادہ ناگوار تھے۔ یہ واقعہ جون سنہ ۱۹۱۶ء کا ہے۔

یہ نومسلم شیخ عبدالحق خان بہادر نواز خاں کے پاس رہتے تھے۔ پھر وہ اور ان کے بیٹے اللہ نواز خاں لاہور کے مسلم کالج میں پڑھتے تھے۔ جب وہ باقی نوجوان طالب علم لاہور سے بھاگ کر کابل میں آئے، یہ شیخ عبدالحق ان کے ساتھ تھے۔ اللہ نواز خاں ایک جوشیلا طالب علم تھا۔ اس نے بڑے بڑے کام کیے ہیں۔ آیندہ اس کے حالات لکھے جائیں گے۔ جب شیخ الحق ہندوستان کو روانہ ہوئے تو اللہ نواز خاں نے بھی ایک خط اپنے باپ کے نام دیا تھا۔ شیخ عبدالحق سیدھا اپنے گھر سے ریل پر سوار ہو کر خان پور ریاست بھاولپور بستی دین پور میں پہنچا۔ اور جناب حضرت خلیفۂ اعظم ابوالسراج غلام محمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور مولانا سندھی کے مکتوبات ان کے سپرد کئے۔ اور کہا کہ میں [illegible]ستان جاتا ہوں، اللہ نواز کا خط ان کے باپ کو پہنچا دوں۔ پھر تیسرے روز حاضر ہو گیا۔ خلیفہ صاحب اس وقت خط پہنچانے کے لیے حیدرآباد سندھ کو آدمی بھیجنے والے تھے کہ شیخ عبدالحق حاضر ہو گیا۔ میں نے کہا کہ یہ خطوط مجھ کو دو میں شیخ عبدالرحیم کو پہنچا دوں گا۔ جماعت کے سمجھ دار آدمیوں نے کہا کہ اس کو نہ دینا چاہیے یہ شاید حق نواز کو دے دے۔ آخر بہت بحث مباحثہ کے بعد خلیفہ صاحب نے فرمایا کہ جب مولانا سندھی نے اس پر اعتبار کیا ہے تو پھر تم کیوں اعتبار نہیں کرتے۔ اسی شیخ عبدالحق کا دعویٰ تھا کہ اگر شیخ عبدالرحیم مکہ کو نہ گیا تو میں چلا جاؤں گا۔ میرے پاس خرچ موجود ہے۔ آخر یہ خطوط ان کے سپرد کئے گئے۔ اور احتیاطاً یہ تجویز ہوئی کہ حضرت خلیفہ کے بیٹے اور دو چار فقیر ان کے ساتھ اسٹیشن خانپور پر گئے اور ان کو ٹکٹ حیدرآباد کا دلوایا گیا۔ اور ریل پر سوار کیا گیا۔ جب ریل چلی گئی یہ واپس آئے۔

مگر اس کے دل میں شیطنت تھی اور یہ میل گاڑی جب کسی اسٹیشن پر ٹھہری تو یہ اتر کر پھر دوسرا ٹکٹ لے کر سیدھا ملتان چلا گیا اور حق نواز خاں کو جا کر یہ خطوط دیے اور وعدہ معافی لے کر سب احوال بیان کر دیے۔ اس سے بہت گرفتاریاں ہوئیں۔

ہم جب کابل پہنچے تو اپنے دو ساتھی واپس آئے تھے۔ ان کے پاس بعض اہم کاغذات اور پیام تھے انھوں نے احتیاط اور آہستگی سے کام کیا۔

وہ دونوں آدمی ریاست بھاولپور پہنچے مولوی احمد علی جو نظارت المعارف دہلی میں

پڑھاتا تھا اس کو بلا کر خطوط دیے۔ اکثر خطوط راجہ مہندر پرتاب کے تھے جو انھوں نے شردھانند کو بھیجے تھے۔ ان کی معرفت پنڈت مالوی جی کو پہنچنے تھے وہ سب پہنچ گئے اور ان خطوط کے جوابات کابل میں پہنچ گئے۔

اب راجہ مہندر پرتاب چاہتے تھے کہ ان کی اطلاع ان کے بھائی کو ملے۔ اور وہاں سے خیریت کی خبر آئے۔ اور کچھ رقم بھی انھوں نے طلب کی تھی۔ ہم نے اپنے بھتیجے محمد علی کو ان کے خطوط پہنچانے پر مامور کیا کہ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ پاغستان جائے اور وہاں سے منزلِ مقصود پر پہنچ کر راجہ صاحب کو خط پہنچا دے۔ میرا بھتیجا محمد علی ہندوستان گیا اور راجہ صاحب کے بھائی سے ملا۔ اُس نے خط پڑھ کر کئی ہزار روپے بھی دیے محمد علی جواب لے کر بخیریت کابل پہنچ گیا۔ مگر راجہ صاحب اس سے پہلے کابل چھوڑ چکے تھے۔ اور عراق کے خطوط میں نے مزار شریف پہنچا دیے اور راجہ صاحب اس کے لیے ممنون ہوئے۔ اس کے بعد جب راجہ صاحب امان اللہ خاں کی حکومت میں واپس آئے تو ہمارے ساتھ سلوک برادرانہ تھا اپنے پرائیویٹ امور میں بھی ہم سے مشورہ لیتے رہے۔ لبسا اوقات ہماری خاطر اپنی رائے چھوڑ دیتے۔

ہندوستانی مشن ریشمی خطوط ...... اور محمد علی کو ہندوستان کی طرف بھیجنا غالباً جون سنہ ۱۹۱۶ء میں تھا ان ریشمی خطوط کے واقعات سے متعلق مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ میں نے ایک خواب دیکھا کہ کسی نے میری پیشانی پر بم مارا جس سے مجھ کو نقصان نہ پہنچا، مگر میرا منھ سرخ ہو گیا۔ میں نے تعبیر کی کہ کوئی حادثہ ہونے والا ہے۔ مگر اس سے مسلمانوں کی سرخ روئی ہو گی۔ کوئی سخت گزند نہ پہنچے گا۔ اس کے بعد گرفتاریوں کا حال معلوم ہوا، جو ہمارے لیے موت سے زیادہ ناگوار تھیں۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ریشمی خطوط پہلے راجہ مہندر پرتاب نے دیکھے تھے۔ اس کے بعد بلخ چلے گئے۔

مگر ایک بات کی مسرت ہم بھول نہیں سکتے۔ اگر خدانخواستہ راجہ صاحب کا خط ہم عبدالحق کو دیتے اور ایسا معاملہ پیش آتا تو ہمارے لیے ناقابلِ برداشت مصیبت ہوتی۔ اب ہم خوش ہوتے ہیں کہ راجہ صاحب کا کام تو ہو گیا۔ ہندوؤں کو مسلمانوں کے بدنام

کرنے کا موقع ہاتھ نہ آیا۔ ہمارے لوگ مسلمان ہند و مصیبت میں گرفتار ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے لیے آسانی کردے گا۔

راجہ صاحب مزار شریف اس لیے گئے تھے کہ وہاں ہندوؤں سے مل کر روسی علاقہ سے سوئزرلینڈ کو پہنچیں۔ بڑی محنت و مشقت سے وہ سوئزرلینڈ پہنچے تھے۔ انھوں نے اپنے بھائی کو بلایا اور ان کو سمجھایا کہ مالوی جی سے کہو کہ مسلمان شمال مغربی ہندوستان پر حملہ کرنے والے ہیں۔ اس لیے ہندو مسلمان کا اتحاد توڑو۔ اور کچھ راز اور کاغذات حکومت موقتہ ہند کے بھی اس کو دیے۔ یہ وہ وقت تھا یعنی ۱۹۱۹ء کہ جب گاندھی جی پیدا ہو چکے تھے۔ اور شردھانند جیل میں تھا۔ پنڈت مالوی جی نے شردھانند کو کہا کہ بلا شرط معافی مانگ کر شدھی کا پروپیگنڈا شروع کرو۔ شدھی کا پروپیگنڈا شروع ہوا تو مولانا محمد علی نے اسلامی تبلیغ شروع کردی۔ ہندو مسلم اتحاد ٹوٹ گیا۔ باقی حقیقت ہم پہلے لکھ آئے ہیں۔

ہماری نظر بندی اور قید :۔ ریشمی خطوط ہندوستانی حکومت کو دستیاب ہوئے تو اس کے بعد ہندوستانی حکومت کے اعتراض کا یہ اثر ہوا کہ ہمیں اپنے ساتھیوں کے ساتھ یکم رمضان ۱۳۳۵ھ کو ایک تنگ مکان میں لا کر قید کردیا گیا۔ ہم لوگ بیس پچیس آدمی تھے اور وہ گھر کسی حالت میں دس سے زیادہ آدمیوں کے لیے موزوں نہ تھا اور ہماری نگرانی سردار سپہ سالار کے متعلق رکھی تھی۔ انھیں ہم نے توجہ دلائی۔ انھوں نے سرکاری باغ میں خیمے لگوائے اور عید رمضان پر خود ہمارے خیموں میں تشریف لائے۔

برٹش گورنمنٹ چاہتی تھی کہ ہم کو ہندوستانی پولیس کے سپرد کردیا جائے۔ مگر اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں نے کہا کہ ان کو افغانستان کا نیشنل سرٹیفکیٹ مل چکا ہے۔ یہ لوگ ہماری رعیت ہیں۔ ہم ان کو سزا دیں گے۔ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں اپنے آپ کو آزاد بادشاہ سمجھتے تھے۔ آزاد بادشاہوں کے طریقے پر چلتے تھے۔

اس اعتراض کا دوسرا اثر یہ ہوا کہ مولانا منصور انصاری اور مولانا سیف الرحمٰن کابل سے یاغستان روانہ کردیے گئے۔ جلال آباد تک دونوں ساتھ رہے۔ مولانا سیف الرحمٰن کو جلال آباد میں برٹش پولس ـــ نے اپنی معیت میں لے لیا۔ اور ہندوستانی معاملات سے

علیحدگی کا وعدہ کر لیا اور برٹش گورنمنٹ کی وفاداری کی قسم لے لی۔ اب مولا سیف الرحمٰن جلال آباد سے واپس کابل آئے اور مستوفی الممالک (وزیر مال) کے مہمان ہو کر رہنے لگے۔ امیر حبیب اللہ خاں کی آخری حکومت تک وہ مستوفی الممالک کے ساتھ رہے اور مستوفی الممالک کو جو کام انگریزوں کی تائید کے لیے دیا جاتا تھا اس میں اس کی امداد کرتے رہے۔

مولانا سیف الرحمٰن صدر مدرس مدرسہ فتح پوری دہلی کے تھے۔ ان کو مولانا شیخ الہند نے ۱۹۱۳ء میں حکم دیا تھا کہ تم یاغستان چلے جاؤ اور حاجی ترنگ زئی کے ساتھ مل کر افغانستان کی سرحد پر انگریزوں سے بغاوت کرتے رہو۔ پھر جب ۱۹۱۴ء میں جنگ جرمنی شروع ہوئی تو انھوں نے انگریزی سرحد پر حملے شروع کر دیے۔ انگریزوں نے مولانا کے بال بچوں کو دہلی میں نظر بند کر دیا اور وائسرائے ہند نے ان کو خط لکھا کہ اگر تم واپس ہندوستان میں آجاؤ تو تمھارے بال بچوں کو آزاد کر دیا جائے گا۔ اور تم کو بھی بڑی عزت دی جائے گی۔ مولانا سیف الرحمٰن نے اس کے جواب میں لکھا کہ "میری عزت یہی ہے کہ تاریخ میں لکھا جائے گا کہ مجھ سے ہندوستان کا بادشاہ ہندوستان آنے کی التجا کرتا ہے کہ تم واپس آجاؤ۔ یہ عزت میرے لیے کافی ہے۔ اور میرے بال بچے میرے نہیں ہندوستان کے بادشاہ کی رعیت ہیں۔ ان کے ساتھ جو برتاؤ چاہو کرو۔ اور میرے ساتھی میرے ساتھ ہیں۔ یہ میرے بچے ہیں اور میرے دوست ہیں۔" یہ مولانا کی بڑی بہادری تھی۔ اس کی مثال تواریخ میں نہیں ملتی۔ جب جنگ کو دو چار مہینے گزرے اور سرحد میں گڑبڑ ہونے کا اندیشہ پیدا ہونے لگا، تو انگریزوں نے تجویز سوچی اور اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ کو لکھا کہ تم سرحد کے مولویوں اور بڑے بڑے لوگوں سے بیعت نامے لو کہ بادشاہ کے بغیر جہاد منع ہے اور میں جنگ کے لیے تیاری کر رہا ہوں۔ جب میں جنگ کروں تب تم جنگ میں میرے ساتھ شریک ہو جاؤ۔ اس سے پہلے کچھ گڑبڑ یا جنگ مت کرو۔ اور بہت سی رقم انگریزوں نے افغانستان کو دینی منظور کی۔ کہتے ہیں فی بیعت نامہ دس گنیاں اور وظیفہ میں اضافہ کیا۔

انھوں نے بہت سے مولویوں کو اپنے ملک میں اور یاغستان اور سرحد میں مقرر کیا تاکہ بیعت نامے لیویں۔ اور وہ بیعت نامے لینے لگے۔ اور سرحد کے مولویوں اور بڑے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ ضرور اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں انگریزوں سے جنگ کریں گے۔ ...... حاجی ترنگ زئی

صاحب وغیرہ نے اپنے ہاتھ گڑبڑ کرنے سے روک لیے۔ اس لیے مولانا سیف الرحمٰن سرحد یاغستان میں بیٹھے بیٹھے اکتا گئے اور کابل چلے آئے۔ اور مولانا سندھی کے ساتھ رہنے لگے۔ ریشمی خطوط ظاہر ہونے کے سبب انگریزوں نے اعتراض کیا۔ مولانا سیف الرحمٰن اور مولانا منصور انصاری کے پاس سرٹیفکیٹ نیشنیل نہ تھا اس لیے ان کو کابل سے باہر نکال کر سرحد یاغستان میں جانے کا حکم ہوا۔ مولانا منصور انصاری تو جلال آباد میں پہنچ کر یاغستان کو چلے گئے۔ اور مولانا سیف الرحمٰن برٹش پولیس افغان جو جلال آباد میں رہتے تھے ان کے پاس ٹھہر گئے۔ اور مولانا کو معلوم تھا کہ اس وقت یاغستان میں کوئی موقع گڑبڑ کا نہیں رہا ہے۔ اس لیے ناچار ہو کر انگریزی نوکروں کے پھندے میں پھنس گئے۔ اور انگریزوں کی وفاداری کی قسم کھالی اور آئندہ گورنمنٹ ہندوستان کی تائید میں کام کرنا منظور کر لیا۔ اس لیے انھوں نے مستوفی کو یقین دلایا کہ مولانا اب ہندوستان کی تائید میں کام کرتے رہیں گے۔ تم ان کو اپنا مہمان رکھو۔

یاد رکھنا چاہیے کہ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ کو جو بھی کام بعیت نامے وغیرہ کا کرانا ہوتا وہ نائب السلطنت سے کراتے تھے۔ تمام بعیت نامے اس کے دفتر میں جمع ہوتے اور بذریعہ مستوفی الممالک یعنی وزیر مال انگریزوں کی طرف بھیجے جاتے۔ پھر انگریزوں سے جو رقم آتی علماء کو کچھ دیتے تھے۔ مگر نائب السلطنت کی سفارش اور حکم نامہ کے سوا کسی کو مستوفی الممالک (وزیر مال) رقم نہیں دیتے۔ علمائے افغانستان یا صوبہ سرحد سب کے سب نائب السلطنت کے زیر اقتدار ہوتے تھے اور اس کے اشاروں پر چلتے تھے۔

انور پاشا کا خط:۔ ہندوستانی حکومت کو اطلاع ملی کہ حضرت مولانا شیخ الہند نے ایک خط انور پاشا سے لے کر ہندوستان بھیجا ہے اور وہ اراکین مدرسہ دیوبند کے پاس کہیں محفوظ ہے۔ اس کے لیے ہندوستان میں جس قدر کوشش ہوئی اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ اب جب اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ کی حکومت سے امداد کی درخواست کی گئی، تو مستوفی نے مولانا سیف الرحمٰن کے ذریعہ دیوبند کے ایک پرانے طالب علم کو جو حضرت شیخ الہند سے خصوصیت رکھتا تھا یاغستان سے ڈھونڈ نکالا۔ اسے دیوبند بھیجا گیا کہ اعلیٰ حضرت امیر صاحب وہ کاغذ مانگتے ہیں۔

اس میں اگر مولانا سیف الرحمٰن کی واقفیت مستوفی کی امداد نہ کرتی تو یہ تجویز کارگر نہ ہوسکتی۔ اس دیوبندی بزرگ کا پتہ جس کے پاس انور پاشا کا خط تھا مولانا سیف الرحمٰن نے بتایا تھا۔ کہتے ہیں کہ ان بزرگ کو بھی کچھ شکوک پیدا ہوئے اس لیے خط ہاتھ نہیں آیا۔ اس کے بعد احتیاط پسند لوگوں نے وہ خط جلا دیا۔ یہ خط مولانا عبد الرحیم رائے پوری کے پاس تھا جو اس وقت مدرسہ دیوبند کے سرپرست تھے۔

مولانا منصور انصاری افغانستان سے یاغستان چلے گئے۔ اور ایک مدت تک وہیں رہے۔ جب امیر امان اللہ خاں افغانستان کے تخت کے مالک بنے تب مولانا منصور انصاری واپس کابل آئے۔

جب ہم سب کوتوالی کی حفاظت میں تھے اور ہماری نگرانی سپہ سالار کے متعلق تھی اور انھوں نے ہمارے لیے ایک سرکاری باغ میں خیمے لگوائے تھے ان ایام میں ہمارا ایک رفیق جس کا نام رحمت علی زکریا تھا، اس نے اپنی تجویز ہمیں بتلادی تھی۔ کہ روس کی طرف بھاگنا چاہتا ہوں۔ اس کو ہم منع کرنا نہیں چاہتے تھے اور ہمیں خوف تھا کہ اس کے بھاگنے کا الزام ہم پر عائد کیا جائے گا۔ اس لیے ہم نے مولانا سیف الرحمٰن کو بلا کر کہا کہ میں اپنے رفیقوں سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتا ہوں اور آپ کے توسط سے مستوفی کے پاس رہنا چاہتا ہوں۔ اس لیے آپ مجھ کو مستوفی کی نگرانی میں رکھیں۔ مولانا نے یہ بات قبول کی اور مستوفی سے کہا اس نے بھی قبول کر لیا۔ اب میں مستوفی کے پاس رہنے لگا۔ اور ہمارا رفیق رحمت علی زکریا بھاگ گیا۔ اور افغانستان میں پھرتا رہا۔ وہ انقلاب روس کے بعد بخارا پہنچا اور میں مستوفی الممالک کے پاس نظر بند تھا۔ وہ ہم کو جلال آباد لے گئے۔ ہم وہیں تھے کہ امیر حبیب اللہ خاں شہید کر دیے گئے۔ اور کابل میں امیر امان اللہ خاں مستقل بادشاہ بن گئے۔

افغانستان میں تین قسم کی قید ہوتی ہے۔ ایک جیل، جیسے ہندوستان میں ہے کہ مجرموں کو جیل میں رکھا جاتا ہے۔ ان سے کام کرایا جاتا ہے۔ جیل کے خرچ سے جو کچھ بچ جائے ان کے اہل و عیال کی طرف روانہ کر دیا جاتا ہے۔ اگر مجرم اچھا کاریگر ہوتا ہے جیسے درزی یا معمار وغیرہ

تو اس کے ساتھ پولیس والا ہمراہ رہتا ہے۔ پولیس وغیرہ کے خرچ منہا کر کے باقی اگر قرض دار ہے تو قرض ادا کر دیا جاتا ہے ورنہ پس ماندوں کو دیا جاتا ہے۔ اگر مجرم ضمانت دے تو وہ آزاد ہو کر کام کرتا تھا اور واپس شام جیل میں آجاتا تھا۔ یہ سب سہولتیں اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں شہید نے دی تھیں۔ اور جب اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں افغانستان کے مستقل بادشاہ ہوئے تو انھوں نے اپنی نظر عنایت جیل کی اصلاح کی طرف مبذول فرمائی ان اصلاحوں میں ایک اعلیٰ اصول انسانی سوسائٹی کے متعلق یہ فرمایا کہ جس قیدی کی میعاد ایک سال یا سال کے اوپر ہو تو شش ماہ کے بعد اس کی عورت اس کے پاس رہ سکتی تھی تین دن سے ہفتہ بھر تک رہ سکتی تھی۔ اس کے لیے انھوں نے جیل کے اندر ایسے کمرے بنائے تھے۔ یا ضمانت پر شہر میں رہ سکتے تھے، تاکہ بداخلاقی پیدا نہ ہو اور نسوانی حقوق محفوظ رہیں۔ یہ دوسری کوشش علیا حضرت والدۂ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کی تھی۔

دوسرے خانہ نشینی تھی۔ مجرم اگر ذی عزت آدمی ہوتا تو اس کو حکم ہوتا کہ تم اپنے گھر میں خانہ نشین ہو جاؤ۔ سوائے اسکے بال بچوں یا والد و والدہ کے اس کے گھر جانا منع ہوتا۔ اگر ایسا مجرم گھر سے باہر نکلے تو پولیس کو حکم ہوتا کہ اس پر بندوق چلاؤ۔

تیسری قسم نظر بندی تھی۔ اگر اس کی نظر بندی پولیس کے ماتحت ہے تو اپنے دائرے سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ خلاف ورزی پر سخت محنت سے جیل میں جاتا تھا۔ اگر اس مجرم کی نظر بندی کسی امیر کے سپرد ہوتی تو جہاں وہ امیر جاتا اس کو اپنے ساتھ رکھتا۔ اگر وہ افسر دورے پر جاتا، تو اس نظر بند آدمی کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

مولانا سندھی چونکہ مستوفی الممالک (وزیر مال) کے پاس نظر بند تھے جب اعلیٰ امیر حبیب اللہ خاں جلال آباد کی طرف شکار کے لیے گئے تھے تو نائب السلطنت سردار نصر اللہ خاں اور سردار سپہ سالار صاحب اور سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت بھی اعلیٰ حضرت کے ساتھ تھے۔ مستوفی الممالک شکارگاہ میں نہ تھے۔ کیونکہ شکارگاہ جلال آباد سے تیس چالیس میل دور تھی اس لیے مستوفی الممالک جلال آباد میں ٹھہر گئے۔ مولانا سیف الرحمن اور مولانا سندھی بھی وہیں ٹھہر گئے۔ شکارگاہ میں سب بندوبست کیا گیا تھا۔

اور لشکر کی ایک کمپنی بھی ساتھ تھی۔ اور اعلیٰ حضرت امیر کے سر کے نگہبان ولی خان اور ہاشم خان برادران اور سپہ سالار نادر خاں بھی تھے جن کو سر سروس کا خطاب ملا تھا۔ جب شکار گاہ پر منزل ہوئی تو دوسرے روز اعلیٰ حضرت ناشتہ سویرے سویرے کر کے شکار کو گئے۔ اور سارا دن شکار کے پیچھے رہے۔ ظہر کی نماز کے بعد واپس آئے۔ امیر اعلیٰ حضرت حبیب اللہ خاں کا قاعدہ تھا کہ اپنے مقررہ وقت پر ضرور آتے تھے۔ ہر کام کے لیے ٹائم مقرر تھا۔ اس طرح نماز کا وقت بھی مقرر تھا۔ یہ نماز میں امام ضرور ہوتے تھے دوسرے کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے اِلاّ جمعہ کے دن۔ جب شکار گاہ سے واپس آئے مگر ۲۰ منٹ پہلے آگئے، قاعدہ یہ تھا کہ جب امیر صاحب تنبو میں واپس آجائیں تو ایک آدمی سر سفروں میں سے جا کر فوراً چائے لاتا۔ اب ۲۰ منٹ پہلے آگئے تھے، چائے والے نے چائے تیار نہ کی تھی۔ ہاشم یا ولی چائے لینے گیا تو واپس آ کر کہا کہ چائے تیار نہیں، ابھی ہو جاتی ہے۔ اعلیٰ حضرت واللہ اعلم غصہ میں بیٹھے تھے۔ اُٹھ کر چابک سے مارنا شروع کیا۔ بہت مارا۔ جب اس کو چھوڑا تو وہ فوراً جا کر چائے لایا۔ چائے پی، ناشتہ کیا۔ عصر کی نماز پڑھ کر سو گئے مغرب کے لیے اُٹھائے گئے۔ مگر کہنے والے کہتے ہیں کہ اس وقت بھی غصّے میں تھے۔ مغرب کی نماز کے بعد باہر ٹہلنے لگے۔ عشاء کے بعد کھانا کھا کر سو گئے۔

ہم مستوفی کے پاس جلال آباد میں تھے۔ نصف شب گڑبڑ ہونے لگی مستوفی کے نوکر وغیرہ اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ میں بیدار ہو گیا۔ میرے ساتھ صوبہ سرحد کا ایک طالب علم رہتا تھا جو میری خدمت کرتا تھا۔ اس نے باہر سے آ کر میرے کان میں کہا کہ امیر صاحب کو کسی نے بندوق ماری، شہید ہو گئے اور وہاں سے ٹیلی فون کاٹ دیا گیا۔ ٹیلی فون کا مرکز جلال آباد تھا۔ وہاں آدمی بھیجا گیا ہے۔ بڑے راستہ پر جو کابل اور جلال آباد کے درمیان ہے وہاں اسٹیشن تھا۔ وہاں جا کر امان اللہ خاں کو اطلاع دی۔ شہر جلال آباد میں گڑبڑ تھی اور گھوڑے سب تیار تھے۔ ایک گھوڑے پر سوار ہو کر چلا گیا۔ وہاں ٹیلی فون پر جا کر کہا۔ "معین الدولہ امان اللہ خاں"۔ انھوں نے امان اللہ خاں سے ٹیلی فون ملا دیا۔ "من معین الدولہ امان اللہ خاں ہستم۔ چہ خبر ست؟" اس نے کہا کہ "امیر صاحب شہید شد!"

امان اللہ خاں نے جواب دیا "فہمیدم"۔ اس کے بعد ہی ٹیلی فون کٹ گیا۔ صبح کو قانون کے موافق امان اللہ خاں کو اِدھر شکار گاہ میں حاضر ہونا تھا۔ جو حبیب اللہ خاں کا بڑا بیٹا ہے اُسے کابل جانا تھا۔ جب امان اللہ خاں کو معلوم ہوا کہ امیر شہید ہو گیا ہے تو علیا حضرت کو اٹھایا اور شاہی خاندان کا بڑا بزرگ جو تخت پر بیٹھا تا تھا اس کا خطاب اعتماد الدولہ تھا۔ یہ بڑے بڑے گورنر وغیرہ سپہ سالار وغیرہ سب اس کے بھائی کے بیٹے ہیں۔ اور باہر سے گورنر بھی ایسے ہی تھے لیکن لشکر وغیرہ اور امراء و علماء کو جمع کر کے سب کے روبرو امان اللہ خاں کو بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھا دیا گیا۔

لطیفہ :- جب معین الدولہ امان اللہ خاں کی تخت نشینی کا ریزولیشن پاس ہوا تو اعتماد الدولہ کا ایک بڑا بیٹا جو سردار تھا، اس نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ اس تخت پر اس کو بٹھایا جائے جو خصی ہونا قبول کرے۔ اعلیٰ حضرت حبیب اللہ خاں اس لیے شہید کیے گئے کہ باوجود تین سو عورت اور ایک ہزار لونڈی کے اشرافوں کی بہو بیٹیوں پر دست درازی کرتے تھے۔ دوسرا بادشاہ بھی ایسا ہی کرے گا۔ امان اللہ خاں نے اُٹھ کر خدا کی قسم کھائی اور کہا کہ میں سوائے اپنی ایک عورت کے دوسری عورت سے شادی نہ کروں گا۔ اور نہ کوئی لونڈی رکھوں گا۔ حاصل کلام کہ وہ بادشاہ منتخب ہوا اور فوراً حکم دیا کہ ٹیلی فون درست کرو۔ شکار گاہ میں سردار نادر خاں اور سردار عنایت اللہ خاں دونوں نے کہا کہ اپنا ایک بادشاہ مقرر کرو۔ مولوی لوگوں اور دیگر لوگوں نے کہا سردار نصر اللہ خاں کو بادشاہ بناؤ۔ عنایت اللہ خاں نے کہا کہ کثرت رائے اس طرف ہے کہ نصر اللہ خاں اگر بادشاہ بنے تو میں اپنا حق واپس لیتا ہوں۔ یہ امیر صاحب کی شہادت کے بعد دو چار گھنٹوں میں فیصلہ ہو گیا صبح کو جب ٹیلیفون کا اتصال ہوا تو سارے لشکر اور ملک کے جملہ گورنر و علماء جو کابل کے ہیں انھوں نے امیر امان اللہ خاں کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ نصر اللہ ڈر گئے اور کہا کہ میں مستعفی ہوتا ہوں اپنا بادشاہ عنایت اللہ خاں کو بنا لو۔ پھر صبح سب حقیقت ان کی واضح ہونے لگی اور معین الدولہ امان اللہ خاں نے ٹیلی فون پر نادر خاں کو کہا کہ ان سب کو جمع کر کے شہر میں لے آؤ۔ اور جو مدعیِ سلطنت تھے گرفتار کر کے کابل پہنچا دیے گئے۔ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں

کی شہادت کا سراغ نہ مل سکا۔ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ کو کسی نے ان کے سر میں تمنچہ مارا اور دوسرا اس کے قلب پر مارا۔ جب دربانِ خیمہ نے آواز دی کہ امیر صاحب شہید ہو گئے تو پہلے پہلے جو خیمہ کی طرف آئے وہ ولی خاں اور ہاشم سر سروش تھے ان کا خیمہ امیر صاحب کے خیمہ کے اوپر تھا۔ آتے ہی ان دونوں نے دربان کو تمنچہ مار دیا وہ بھی مر گیا۔ کسی کو خبر نہ ہوئی کہ کون تھا۔ یہ بھی صیغۂ راز میں رہ گیا۔ امیر صاحب کو قتل کرنے کے لیے دشمن بہت تھے۔ مگر یہ دونوں نوجوان اس کو بچایا کرتے تھے۔ مگر جب اُن کو بے عزت کیا تو یہ بھی دشمن بن گئے۔ شاید ان کے سوا دوسرا کوئی اور ہو۔

ضمیمہ :۔ ہم آگے لکھ آئے ہیں کہ افغانستان کا وفد صلح کے لیے دہلی میں آیا تھا۔ اور مولانا محمد علی کے لیے بھی ایک خط اس وفد کے پاس تھا، جو محمود طرزی نے مولانا امام عبید اللہ سندھی سے حاصل کیا تھا۔ اس خیال سے کہ ہم کو اگر کوئی مشکل پیش آئے تو ہم کس سے امداد طلب کریں مولانا سندھی نے مولانا محمد علی کے نام پر ان کو خط لکھ دیا، کہ ان سے مدد طلب کرو۔ اس خط میں کچھ اشارے بھی تھے کہ ہم نے روس سے اتنی مدد حاصل کی ہے۔ تو وہ خط امیر وفد صلح کا جو محمود خاں طرزی کے پاس تھا اس نے وائسرائے ہند کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ... . والسرائے کو دے دیا۔

(آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے جو احمد آباد میں منعقد ہونے والی تھی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ آزادی کا جھنڈا ہم کھڑا کریں گے۔ بڑے زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ آزادی کا جھنڈا بلند کرنے سے ان کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان میں ہم انگریزوں سے لڑ پڑیں گے۔ اس آزادی کے جھنڈے کو بلند کرنے کا' اور انگریزوں سے ہندوستان میں لڑائی شروع کرنے کا دراصل مطلب یہ تھا کہ چونکہ مولانا سندھی نے ایک لاکھ فوج روس سے طلب کی تھی اور معاہدہ ہو چکا تھا اور اس کی اطلاع گاندھی جی کو پہنچائی گئی تھی۔ اور گاندھی جی نے بھی مولانا کو لکھا تھا کہ جب ہم آزادی کا جھنڈا بلند کریں تو فوراً تم معاہدہ کو چھوڑ کر یعنی انگریزوں سے معاہدہ ترک کر کے اور روس اور افغانستان کی فوج میں شامل ہو کر ہندوستان پر حملہ کر دینا)۔

جب وائسرائے کو یہ خط ملا جو مولانا نے مولانا محمد علی کو لکھا تھا تو اس نے گاندھی جی اور مالوی جی کو بلا کر وہ خط دکھایا اور ان سے کہا کہ اس خط کا تو مطلب یہ ہے کہ مسلمان ہندوستان میں اپنی بادشاہی قائم کرنا چاہتے ہیں نہ کہ ہندوستان کی قومی بادشاہی۔ اب آپ کی مرضی، ہماری غلامی سے نکلتے ہو تو مسلمانوں کی غلامی میں آجاؤ گے۔ اس سے گاندھی جی بھی ڈر گئے اور مالوی جی بھی ڈر گئے۔ اور آزادی کا جھنڈا احمد آباد میں کھڑا نہ کیا۔ یہ حقیقت ہے۔

باب پنجم

امیر حبیب اللہ خاں بادشاہ ہوئے تو سردار نائب السلطنت نصر اللہ خاں ولی عہد مقرر ہوئے ..... ان دونوں کے اتفاق سے سلطنت کا کام چلتا رہا۔

جب امیر عبد الرحمن خاں بادشاہ کابل بیمار ہوئے اس وقت اعتماد الدولہ وزیر اعظم تھے۔ انھوں نے امیر صاحب کی بیماری کو چھپا رکھا تھا۔ نہ ان کے بیٹوں کو آنے دیتے تھے اور نہ اُن کے اہل و عیال کو خبر دیتے تھے۔ وزیر اعتماد الدولہ کے بہت سے بیٹے تھے ایک بار اُن سے پوچھا گیا تھا کہ تمھارے کتنے بیٹے ہیں؟ تو انھوں نے ہنس کر جواب دیا "یاد نہ دارم دوازدہ درجن یا زیادہ باشند" اس سے ان کے بیٹوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔ یہ وزیر اور ان کے بیٹے امیر عبد الرحمن کی بیماری کی حالت میں نگہبان تھے اور حکم احکام ویسے ہی جاری رکھتے تھے جیسے صحت کے دنوں میں۔ اور کسی بیٹے یا نوکر کو جب تک امیر صاحب بلاتے نہ تھے ملاقات کی اجازت نہ تھی۔ ویسے کوئی شخص نہیں آسکتا تھا۔ کابل کے باہر باغ کی طرف بنگلہ امیر حبیب اللہ خاں کا تھا۔ وہ وہاں رہتے تھے۔ جب امیر صاحب فوت ہوئے تو اعتماد الدولہ نے امیر حبیب اللہ خاں کے بڑے بیٹے کو بلایا۔ اور پھر نصر اللہ خاں کو بلایا اور کہا کہ امیر صاحب کے منہ سے چادر اٹھا کر دیکھو کہ مر گیا ہے یا نہیں؟ انھوں نے کہا کہ مر گیا۔ اعتماد الدولہ نے کہا کہ آپ دونوں بھائی اپنے میں سے کسی کو امیر بنائیں۔ اگر نہیں بناتے ہیں تو

وزیر اعتماد الدولہ نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ ان کو فوراً گولی مار دو۔ میں نہیں چاہتا کہ انگریز سلطنت میں دست اندازی کریں۔ دونوں خاموش ہو گئے۔ پھر نصر اللہ خاں سے کہا کہ میں حبیب اللہ خاں کو بادشاہ بناتا ہوں کیا آپ اس کی اطاعت کریں گے۔ انھوں نے اقرار کیا تو وزیر نے کہا جاکر ان کی بیعت کرو۔ اس وقت حبیب اللہ خاں سے کہا کہ اپنے بھائی نصر اللہ کو نائب السلطنت بناؤ اور مل کر کام کرو۔ امیر عبدالرحمٰن کا چھوٹا بیٹا مسمیٰ عمر جان تھا۔ وہ اس خیال میں تھا اور کوشاں تھا کہ ولی عہد میں ہوں۔ پھر اعتماد الدولہ اس کے گھر گئے اور اس کو بلاکر اس کی ماں کے پاس بٹھایا اور کہا کہ دیکھو امیر عبدالرحمٰن فوت ہو گئے ہیں اُن کی بیوی کے منھ سے نکلا کہ میرے بیٹے کو بادشاہ بناؤ۔ اعتماد الدولہ نے کہا کہ ہم نے امیر حبیب اللہ خاں کو بادشاہ افغانستان بنا دیا ہے۔ اب تمھیں اور تمھارے بیٹے کو چاہیے کہ ان سے بیعت کریں۔ اگر نہیں چلتے تو ہم تم کو ڈھیر کر دیں گے۔ اس پر انھوں نے اقرار کیا اور ہمراہ آکر بیعت کر لی۔ ان تینوں بیٹوں کو اندر رکھ کر دربار کیا اور سب لشکر امراء و وزراء اور علماء کو بلوایا گیا۔ سب کے روبرو جناب اعتماد الدولہ نے اعلان کیا کہ ہم سب نے خاندانی طور پر اپنے میں سے امیر حبیب اللہ خاں کو بادشاہ افغانستان بنا لیا ہے۔ میں ان سے بیعت کرتا ہوں تم سب ان کی بیعت کرو۔ اس کے بعد اعلانِ شاہی ہوا۔ بیعت عام ہوئی اور نصر اللہ خاں نائب السلطنت بنائے گئے۔ کسی نے بیعت کرنے میں عذر نہیں کیا۔ امیر اعتماد الدولہ وزیر اعظم — اور شاہی خاندان محمد زئی کے سردار بھی بیعت میں شامل تھے۔

امیر حبیب اللہ خاں اور نصر اللہ خاں عید کی مبارک باد دینے اعتماد الدولہ وزیر اعظم کے گھر جاتے تھے۔ وہ خود نہیں آتے تھے۔ ان کی حاضری معاف تھی۔

حکومت کی تقسیم کار اس طرح تھی کہ ملک میں نائب الحکومت (گورنر) کا عہدہ، فوجی اعلیٰ عہدے اور وزیر، امیر صاحب مقرر کرتے تھے۔ باقی سارے ملکی عہدوں پر تقرری کا اختیار نصر اللہ خاں نائب السلطنت کو تھا۔ مالیے کی وصولی کا ذمہ دار بھی نائب السلطنت تھا۔

جب امیر حبیب اللہ خاں کے بیٹے جوان ہوئے تو انھوں نے خواہش ظاہر کی۔

کہ سردار عنایت اللہ معین السلطنت کو ولی عہد بنا دیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے نہایت دانائی سے کام لیا۔

جب سنہ ۱۹۱۴ء میں حرب عمومی (I Great war) شروع ہوئی تو ہندوستانی مسلمانوں اور ترکوں کی طرف سے اولاً اور ترکوں اور جرمنوں کی طرف سے بعدہٗ امیر حبیب اللہ خاں پر زور دیا گیا کہ وہ انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیں۔ امیر حبیب اللہ نے تمام انٹی برٹش (Anti-British) معاملات سردار نائب السلطنت نصر اللہ خان کے سپرد کیے۔ اور پرو برٹش (Pro-British) معاملات کو خود سنبھالا۔

انگریزوں نے امیر حبیب اللہ خاں کو یاغستان میں تقسیم کرنے کے لیے بہت روپیہ دیا۔ اور ان کی حکومت کا کام یہ تھا کہ قبائلِ افغانیہ سے بیعت نامہ حاصل کرے پشاور میں افغانوں کو کہا جاتا کہ امیر کابل جہاد کرے تو اس وقت تم بیشک جہاد میں شریک ہو جاؤ۔ لیکن بغیر بادشاہ کے جہاد ناجائز ہے۔ اس لیے بدنظمی سے پرہیز کرو۔ اس طرح حاجی ترنگ زئی اور دوسروں کا کام بند ہو گیا۔ یہ حاجی ترنگ زئی کے آدمی اور ہندوستانی مجاہدین کے کارندے سب اسی کام پر مامور ہو گئے کہ وہ امیر کابل کے نام بیعت نامہ حاصل کریں۔ انگریزی روپیہ اِنھیں لوگوں کے ہاتھ یاغستان میں تقسیم ہوا۔ اس کام کو انجام دینے والے نائب السلطنت نصر اللہ خاں تھے۔ تمام بیعت نامے ان کے دفتر میں محفوظ رہتے تھے۔

جب حرب عمومی (Great warI) سنہ ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی تو یاغستان کے لوگوں نے جن کا تعلق دیوبندی جماعت سے تھا انگریزوں کے خلاف شورش شروع کر دی اور مجاہدین کی جماعت کو سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید کی جماعت کہا جاتا تھا۔ انھوں نے جہاد کا پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ ترکوں کا افغانستان میں پہلے سے رسوخ تھا۔ کابل کا شفاخانہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ اور بڑا ڈاکٹر غرت بیگ (ترک) تھا۔ اسی طرح ان کے رسوخ کی وجہ سے علمائے افغانستان جہاد جہاد پکارنے لگے۔ افغانستان میں علماء کا اقتدار بہت ہے۔ اس لیے گورنمنٹ ہند (برطانیہ) کو بڑی تشویش ہوئی۔ اس وقت پشاور کا کمشنر سر عبد القیوم تھا۔

اس نے گورنمنٹ کو مشورہ دیا کہ امیر صاحب کو کہا جائے کہ علماء بعیت کریں کہ جب امیر صاحب جہاد میں شریک ہوں وہ بھی شریک ہو جائیں۔ اس کی رائے کو وائسرائے نے قبول کیا۔ امیر حبیب اللہ کی دلی خواہش یہی تھی کہ اس جنگ میں شریک نہ ہونا چاہیے بلکہ غیر جانبدار رہا جائے۔ اس نے اس بات کو مان لیا۔ وائسرائے ہند نے امیر صاحب سے کہا کہ تم یاغستان کے امراو علماء پر ظاہر کرو کہ میں جنگ میں شریک ہو جاؤں گا۔ تم اس امر کی بعیت ان سب سے لو کہ جب میں جنگ میں شریک ہوں تو میرے ساتھ شریک ہو اس سے پہلے شورش نہ کرو۔ اپنا گولہ بارود حفاظت میں رکھو۔ اور ہر ایک بعیت نامہ پر علی حسب مراتب تین گنیوں سے لے کر پندرہ گنیوں تک دیا جاتا تھا۔ اس طرح عام مولویوں کو خرید لیا گیا۔ اور وہ سب لالچ کی وجہ سے بعیت نامہ حاصل کرنے اور کرانے میں لگ گئے۔ اور اس طرح یاغستان کے علاوہ امیر صاحب نے اپنے ملک میں بھی یہ جال بچھا دیا جب مولانا سندھی اپنی جماعت کے ساتھ کابل پہنچے تو یہ کام دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اور اصل حقیقت سے بے خبر رہے۔ بعد مدت کے اس کی خبر ہوئی۔ مولانا کی معرفت بھی اکثر پنجاب اور سرحد سے لوگوں نے بعیت نامے بھیجے جن میں مولانا تاج المحمود امروٹی بھی تھے جو شکار پور کے قریب رہتے تھے بڑے ذی اثر آدمی تھے۔ انھوں نے بھی اپنا بعیت نامہ اور حضرت پیر غلام محمد صاحب بڑے صوفی بزرگ تھے اور خانپور ریاست بھاولپور میں رہتے تھے، انھوں نے بھی اپنا اور اپنی جماعت کا بعیت نامہ بھیجا تھا۔ اسی طرح یہ کھیل بڑے زور شور سے چلا، جس سے حاجی ترنگ زئی کی جماعت کا ولولۂ جہاد سرد پڑ گیا۔ اور یاغستان میں مجاہدین ترنگ زئی بھی اس کام میں لگ گئے۔ اس کے بعد سر عبد القیوم نے گورنمنٹ کو تجویز پیش کی کہ ان لوگوں کو جنگ کے لیے ابھارنے والے اور شورش پھیلانے والے ہندوستانی لوگ ہیں، جو ہندوستان سے بھاگ کر اس طرف آ گئے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر خونی ملزم اور سرکاری افسر تھے جو غبن کے مجرم تھے، وہ شورش برپا کرنے والے تھے۔ سر عبد القیوم نے کہا کہ ایسے سب ہندوستانی لوگوں کو معافی دی جائے تو بڑی حد تک شورش کم ہو جائے گی۔ گورنمنٹ ہند نے یہ رائے قبول کر لی۔

اس کے بعد سر عبدالقیوم کمشنر پشاور نے ایسے بہت سے لوگوں کو واپس بلا کر معافی نامے دیدیے جن میں سندھی، بنگالی، پنجابی اور سب ہی صوبوں کے لوگ تھے۔ اسی طرح جو سلطنت افغانستان کے اندرونی علاقہ میں لوگوں کی شورشیں تھیں ان بیعت ناموں اور انعام وغیرہ سے ان کا ولولۂ جہاد سرد پڑ گیا۔ اس سے کافی روپیہ امیر حبیب اللہ نے گورنمنٹ آف انڈیا سے حاصل کیا۔ یاغستان کے لوگ اور افغان علماء نے کہا کہ امیر صاحب آج یا کل ضرور اعلانِ جہاد کر دیں گے۔ (یہ بیعت نامے وائسرائے ہند کو پہنچا دیے جاتے تھے۔ اور مزید روپیہ بھی وصول کیا جاتا تھا)۔

امیر صاحب نے ترکی، جرمنی اور ہندی وفد کو یہ جواب دیا کہ جب تک امدادی فوجیں افغانستان نہ پہنچ جائیں اس وقت تک روس اور انگریز دونوں کے خلاف اعلانِ جنگ خلاف مصلحت ہے۔ البتہ جس وقت ترک جرمن فوج کا پیش خیمہ افغانستان پہنچ جائے گا اسی دن اعلانِ حرب کیا جائے گا۔ دوسری طرف روس اور انگریزوں نے تمام راستے روک لیے تھے اور انگریزی فوج کا عراق پر حملہ محض اس پیش قدمی کی روک تھام کے لیے تھا۔

ترک، جرمن ہندی وفد جو کابل میں آیا تھا اُن کو رخصت کیا اور ان کے پاسپورٹ بھی جلا دیے۔ اور اس کے ساتھ امیر حبیب اللہ صاحب نے انگریزوں کو بھی اطلاع کر دی کہ میں نے اس وفد کو کہا ہے کہ اگر جرمن ترک افواج ایران کے راستے افغانستان میں آجائیں تو اس وقت اعلانِ حرب کیا جائے گا۔ اس لیے انگریزوں نے اپنی فوجیں ایران وعراق پر مسلط کر دیں اور عراق پر حملہ کر دیا۔ (نوٹ) قط العمارہ پر انگریزوں کی ناکامی کا قصہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ مولانا محمد صادقؒ کراچی والے کے تدبر سے انگریزی فوجیں قط العمارہ میں محبوس ہو گئیں)۔

اس دوران میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اگر روس کا خطرہ نہ رہے تو سرحدی قوم ہند پر حملہ کر سکتی ہے اس خطرے کو معلوم کرنے کے لیے روس وفد تجویز ہوا۔ اس وفد کا ذکر اس سے پہلے کر چکے ہیں مگر مختصراً یہاں بیان کرتے ہیں۔ مولانا سندھی

کی انقلابی تحریک میں نصر اللہ خاں نائب السلطنت شریک تھے۔ اُن کو ایسے آثار نظر آرہے تھے کہ میری ولی عہدی ختم کردی گئی ہے۔ اور امیر حبیب اللہ اپنے بیٹے عنایت اللہ معین السلطنت کا خیال رکھتے ہیں جس کو انگریزی امداد سے ولی عہد بنایا تھا۔ تو اس تحریک انقلابی کو کامیاب بنانے کے لیے نصر اللہ خاں نائب السلطنت زیادہ کوشاں تھے وہ جانتے تھے کہ اگر ماورائے دریائے سندھ یعنی سندھ، پنجاب اور بلوچستان مفتوح ہو جائے تو میں اس کا قانونی طور پر بادشاہ ہو جاؤں گا۔ یہ لالچ مولانا سندھی نے اس کو دیا تھا۔

جب امیر صاحب نے جرمن ترک وفد کو جواب دے دیا تو اس وقت تک وہ کابل میں تھے۔ مولانا نے حکومت موقتہ ہند کی بنیاد رکھی۔ اس کا ظاہری پریسیڈنٹ راجہ مہندر پرتاب کو بنایا۔ اور سونے کی تختی پر حروف لکھ کر چاندی کے صندوق میں بند کرکے بھیجنے کا ارادہ کیا۔ اس کا حال ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ڈاکٹر متھرا سنگھ اور مرزا احمد علی کو سفیر بنا کر گورنر تاشقند کے پاس بھیجا گیا۔ اس سونے کی تختی میں جو رازہ روس کو لکھے گئے تھے یہ مضمون تھا کہ انگریزوں کی دلی خواہش ہے کہ سلطنت روس کو شکست ہو۔ اس وقت جرمن سے روس کو شکست ہو رہی تھی۔ اگر انگریزوں کو کوئی ہمدردی ہوتی تو فلاں فلاں راستے سے آپ کو امداد دے سکتے تھے۔ مدد دینے کی بجائے انھوں نے ایسے حالات پیدا کردیے کہ روسی لشکر کو شکست پر شکست ہو رہی ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک خط گورنر تاشقند کو بھی لکھا گیا کہ یہ چاندی کا صندوق حفاظت سے زار روس کو پہنچا دیا جائے۔ اور نصر اللہ خاں نائب السلطنت نے ایسی تدبیر کی کہ ہر ہر پڑاؤ پر جو افغانستان میں ہوتا تھا فوجی سلامی وفد کو دی جاتی تھی۔ ..... دریائے جیحون پر جو افغانستان اور روس کے درمیان سرحد ہے اور وہ روسی چوکی بھی ہے جہاں روسی افسر رہتے ہیں۔ وہاں ہر دو حکومتوں کی طرف سے اپنی اپنی سرحدوں کی پلاٹون بھی رہتی ہے۔ جب یہ وفد سرحد افغانستان پر پہنچا تو افغانی فوج نے پوری سلامی دی۔ اس کے بعد وفد کو فوجی حفاظت میں دریا پار کرایا۔

اور روسی سرحد میں افغانی فوج نے سلامی دی۔ جب روسی وفد کے سامنے روسی سرحد میں افغانی فوج نے سلامی دی تو یہ وفد روسی افسروں کی نظروں میں مشتبہ ہو گیا۔ انھوں نے خیال کر لیا کہ یہ افغانی وفد ہے اور روسیوں نے اس وفد کو بڑی عزت سے گورنر تاشقند کے پاس پہنچا دیا۔ اُس نے وہ خط جو اس کے نام تھا پڑھا۔ اور وہ صندوق کھول کر سونے کی پٹڑی بھی پڑھی اور اس سے زار روس کو مطلع کر دیا۔ اس سے قبل زار روس نے انگریزوں سے بہت سے مطالبے کر رکھے تھے۔ لیکن جب یہ سونے کی پٹڑی زار روس کے پاس پہنچی تو اس کو خوف ہو گیا کہ افغانستان روس پر حملہ کر دے گا۔ اس وقت بخارا، تاشقند اور سمرقند وغیرہ میں روسی فوج بالکل نہ تھی۔ برطانیہ نے امیر حبیب اللہ صاحب سے معلوم کیا تو انھوں نے اپنی بے خبری ظاہر کی۔ اس سے گورنمنٹ برطانیہ نے اس معاملہ کو جھوٹا خیال کر لیا۔ مگر روس نے اس کو نہیں مانا۔ آخر زار نے حکم دیا کہ یہ جو سفیر بن کر وفد کے ساتھ آئے ہیں ان کو گرفتار کر لیا جائے۔ مگر گورنر تاشقند نے اس کو نہیں مانا۔ اور کہا کہ اگر یہ گرفتاریاں عمل میں آگئیں تو فوراً جنگ چھڑ جائے گی۔ اس کے بعد اپنے خاص روسی افسروں کی نگرانی میں اس وفد کو واپس کر دیا۔ اور خفیہ طور پر اپنے روسی افسروں کو ہدایت کر دی کہ اگر افغانی سرحدی افسر روسی سرحد میں اس وفد کے ممبران کو فوجی سلامی دیں تو ان کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ اور اگر وہ سلامی نہ دیں تو ان کو فوراً گرفتار کر لیا جائے۔ لیکن جب یہ وفد واپس سرحد پر پہنچا تو افغانی فوج نے فوراً استقبال کیا اور فوجی سلامی دی اور بڑی عزت سے اپنی سرحد میں لے آئے۔ اور جب اپنی افغانی سرحد میں آئے تو پھر فوجی سلامی دی۔ اتفاقاً وہ سرحدی فوج بدل کر کابل جانے والی تھی اس کے بجائے دوسری افغانی فوج آچکی تھی۔ یہ وفد اس فوج کے ساتھ بڑی عزت سے کابل کو واپس روانہ ہوا۔ اور یہ وفد بہ سلامت واپس پہنچ گیا۔ اس پورے معاملہ کی امیر حبیب اللہ خاں کو کوئی خبر نہ تھی۔ یہ ساری تدبیریں نصر اللہ خاں نائب السلطنت صاحب کی تھیں۔

جب گورنر تاشقند نے اس وفد کی پیش کردہ سونے کی تختی کھول کر پڑھی تو اس کا فوٹو بلاک لیا گیا۔ اور عام انقلابی مارکس ازم والوں (Communists) نے اس عبارت کو عام کر دیا۔ اس سے روس میں عام انقلاب برپا ہوا۔ زار روس نے برطانیہ سے امداد طلب کی جس پر برطانیہ نے لارڈ کچنر کو روس کی طرف بھیجا۔ راستہ میں جرمن نے اس کا جہاز ڈبو دیا۔ زارِ روس کو بروقت امداد نہ پہنچنے پر روسی انقلاب کامیاب ہو گیا۔ اس عارضی (Provisional) گورنمنٹ کا پریسیڈنٹ راجہ مہندر پرتاپ تھا۔ اس کے اس پر دستخط ثبت تھے۔

جب میں روس پہنچا تو عام روسی انقلابیوں نے کہا کہ مولانا صاحب آپ ہی اس روسی انقلاب کے روح رواں ہیں۔ اور اس کتاب سونے کی پٹڑی کے مصنف ہیں۔ اس لیے روسی آپ کے معتقد ہو گئے ہیں۔

جب روس کی قوت کمزور ہو گئی اور اس مشن کے ذریعہ یہ معلوم ہو چکا کہ روس افغانستان پر حملہ نہیں کر سکتا تو نائب السلطنت سے جو لوگ ملتے تھے انھوں نے اپنا وعدہ پورا کرنے کا تقاضا کیا۔

تقاضا پورا کرنا بعیت ناموں کی باتوں کو عملی جامہ پہنانا تھا۔

سردار نائب السلطنت نصر اللہ خاں نے اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ سے ذکر کیا۔ اعلیٰ حضرت امیر صاحب نے جرگہ بلایا جس میں تمام فوجی افسر اور فوجی بزرگ شریک تھے۔ اعلیٰ حضرت امیر صاحب نے اس مسئلہ میں رائے طلب کی۔ یعنی انگریزوں کے خلاف جنگ کرنی چاہیے یا نہ کرنی چاہیے۔ تو سردار عنایت اللہ خاں صاحب معین السلطنت کی رائے سے سب نے متفق ہو کر یہ قرار دیا کہ لڑنا ضروری ہے۔ شوریٰ کو اس نقطہ پر جمع کرنا سردار نائب السلطنت کی قوت کا مظاہرہ تھا۔ اعلیٰ حضرت امیر صاحب حیران ہو گئے اور اپنے شاہانہ فیصلہ سے اس کو رد کر دیا۔

یہ واقعہ سنہ ۱۹۱۶ء کا ہے۔ روسی وفد روس کا حال معلوم کر کے واپس آیا تھا۔

نصراللہ خاں نائب السلطنت کو پختہ یقین ہو گیا کہ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ صاحب نے اپنے بیٹے عنایت اللہ خاں معین السلطنت کو انگریزوں کی امداد سے ولی عہد بنا دیا ہے، نصراللہ خاں اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خان پر ثابت کرنا چاہتے تھے کہ تمام امراء وزراء اور عام رعایا اس کی طرف ہے۔ کیونکہ جرگہ نے نصراللہ خاں کی حمایت کی تھی۔ اور اُن کو حمایت حاصل ہے۔ اور اس امر سے نصراللہ خاں یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ انگریزوں سے لڑ سکتے تھے۔ اور ان کی حکومت کو بھی ختم کر سکتے تھے۔ اس سے اُن کا یہ خیال تھا کہ امیر حبیب اللہ خاں اُن سے التماس کریں گے کہ وہ لوگوں کا ہیجان بند کریں۔ مگر امیر حبیب اللہ اور ان کے بیٹے عنایت اللہ خاں اس بات پر قائم ہو گئے کہ انگریزوں سے نہ لڑنا چاہیے۔ اس معاملہ کے بعد اعلیٰ حضرت اور نائب السلطنت کا اتحاد ٹوٹ گیا۔ اور افغانوں میں انقلابی آثار ظاہر ہونے لگے۔ اور سردار نائب السلطنت نصراللہ خاں کو یقین ہو گیا کہ ان کی تمام کارروائی سے مطلب میرے جنگ کے فیصلہ کو انگریزوں کی تائید سے منسوخ کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اور اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں۔

مولانا سندھی جب قندھار میں پہنچے تو سراج الاخبار جو کابل سے نکلتا تھا اس کے ایڈیٹر محمود خاں طرزی تھے۔ اس میں ایک مضمون تھا "حیّ علی الفلاح"۔ کہتے ہیں کہ یہ مضمون سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت نے اپنے قلم سے لکھ کر شایع کرایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ تمام افغان جہاد کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس وقت اس قوم افغان کو جہاد کا شوق تھا۔ مگر انگریزوں نے ایک چال چلی کہ عنایت اللہ خاں معین السلطنت کے مرشد حضرت چہار باغ جو ہجرت کر کے مکہ معظمہ میں چلے گئے تھے۔ ان کو انگریزوں نے مکہ معظمہ سے بلا کر اس کام پر متعین کیا کہ تم عنایت اللہ خاں کو کہو کہ مجھ کو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ ہوا ہے کہ افغانستان کو اس جنگ میں شریک نہ ہونا چاہیے۔ انھوں نے آکر عنایت اللہ خاں کو سمجھایا کہ اگر اس جنگ میں افغانستان شریک ہوا تو وہ ختم ہو جائے گا۔

یہ عجیب بات دنیا سنے گی کہ حضرت صاحب چہار باغ کو جو معین السلطنت عنایت اللہ خاں کے مرشد تھے انگریزوں نے مکہ معظمہ سے اس حرکت کے لیے بلایا کہ سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت اپنے فوجی منصوبوں کو ...... جنگ سے علیحدہ رکھنے کی کوشش کرے۔ اور حضرت صاحب چہار باغ اس پر افغانستان کلام واپس آئے اور یوں خواب سنائے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مامور کیا ہے کہ میں افغانستان کو جنگ سے علیحدہ رکھنے کا کام پورا کروں۔ اور حضرت صاحب چہار باغ اس میں کامیاب ہو گئے۔ یعنی معین السلطنت کو جنگ سے بلند رکھنے میں کامیابی ہوئی۔

حضرت صاحب چہار باغ اچھے صوفی تھے، مگر انگریزوں کے دام میں آگئے۔ جس طرح تمام پیر ہوتے ہیں اور قصہ پیر سرہندیوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ انگریزوں نے ان کو کابل و قندھار بھیجا کہ جا کر گورنر قندھار اور نصر اللہ خاں نائب السلطنت سے کہو کہ مولوی عبید اللہ سندھی اور مولانا عبد اللہ لغاری دونوں وہابی ہیں اور سرکاری جاسوس ہیں اور انگریزوں کے نمائندے ہیں۔ یہ افغانستان کا مذہب اور سیاسی حالت خراب کریں گے۔ مگر سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت اور امیر حبیب اللہ خاں نے اُن کو جواب دے دیا کہ ہم ان لوگوں کے حالات سے واقف ہیں۔ یہ دونوں مولانا شیخ الہند حضرت محمود الحسن دیوبندی کے آدمی ہیں۔ اور نصر اللہ خاں صاحب نے تو یہ بھی کہہ دیا کہ ہمارے ملک میں ہندو، سکھ، عیسائی وغیرہ سب رہتے ہیں۔ اگر یہ وہابی ہیں تو کوئی بات نہیں۔ اس لیے یہ ناکام واپس ہوئے۔ لیکن انگریزوں سے بہت کچھ پیسے لینے دینے میں کامیاب ہو گئے۔ اسی طرح سادی طبیعت والے پیر غداریاں کرتے رہتے ہیں۔

امیر حبیب اللہ عام بادشاہوں کی طرح اخلاقی عیوب سے پاک نہیں تھے اب یہ مرض بہت ترقی کر گیا۔ اور شرفا کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ دراز کرنے لگے۔ اس میں بعض عفیف عورتوں نے عصمت دری کے بعد خودکشی کر لی۔

امیر صاحب کے لیے ان کے خادم خوبصورت لڑکیاں خرید اکرتے تھے۔ اور یہ

لڑکیاں امیر حبیب اللہ کو پیش کی جاتی تھیں جو ان میں سے پسند کی جاتی تھیں وہ خود رکھتے تھے اور باقی امیروں کو نوکرانیاں بنا کر دیتے تھے۔ اس کے علاوہ نکاح بستہ عورتیں تین سو سے زیادہ تھیں۔ اور ایک جرمن ماہر ڈاکٹر رات کے وقت انجکشن لگاتا تھا تو خواہش ہوتی تھی۔ اور امیر صاحب ایک عورت کو بلاتے تھے۔ پھر تو یہ مرض اتنا بڑھ گیا کہ شہری شرفاء کی خوبصورت بہو بیٹیوں کی تلاش میں دلالہ عورتوں کو بھیج دیتے تھے تاکہ خوبصورت لڑکیاں تلاش کریں۔ پھر ان لڑکیوں کو جو امیرزادیاں ہوتیں پیغام بھیجتے تھے کہ علیا حضرت والدہ امیر امان اللہ خاں آپ کو بلاتی ہیں۔ اور علیا حضرت شہر میں بڑی سخی اور فیاض تھیں۔ غرباء کی بہت دادرسی اور پرورش کرتی تھیں۔ اور شرفاء کے گھروں میں ان کی راہ و رسم بہت تھی۔

امیر حبیب اللہ خاں کی طرف سے بہت سی عورتیں دلالہ قسم کی اُن کی نفسانی خواہش کو پورا کرنے کے واسطے معصوم اور شریف عورتوں کو پھنسانے کے واسطے ملازم تھیں۔ وہ عورتیں جب معلوم کرتی تھیں کہ کسی گھر میں کوئی عورت خوبصورت ہے تو کہتی تھیں کہ بہن تم کو علیا بیگم صاحب نے یاد فرمایا ہے۔ جب وہ اس کے ہمراہ آجاتی تھیں تو بجائے علیا بیگم صاحب کے وہ عشرت خانے میں پہنچا دیتی تھیں۔ اور منہ کالا کیا جاتا تھا۔ یہ راز آخر میں فاش ہو گیا پوشیدہ نہ رہا۔ ایک بار ایک ترک ملازم کی عورت جو بہت خوبصورت تھی، اُسے دھوکا دے کر بلایا گیا، اور اس کی عصمت لوٹی گئی۔ اس نے ایک کاغذ لکھ کر ساری حقیقت کھول کر بیان کی کہ میری عصمت کو امیر حبیب اللہ نے یوں لوٹا ہے۔ اس کے بعد اس نے ریوالور سے خودکشی کر لی۔ اس خط کا چرچا کابل میں عام ہوا، تو علیا بیگم صاحبہ امیر حبیب اللہ سے بہت ناراض ہوئیں۔ اور تمام اراکین اور شرفاء امیر حبیب اللہ سے ناراض ہو گئے۔ پھر تمام راز کی باتیں منظر عام پر آگئیں۔

سردار معین الدولہ امان اللہ خاں تمام خوبیوں سے آراستہ تھے۔ ان کی والدہ علیا حضرت کے نام سے موسوم تھیں۔ بادشاہوں کی عورتیں بہت ہوتی ہیں۔ لیکن بیگم ایک ہی ہوتی ہے، جس سے کاروبارِ سلطنت میں مشورہ لیا جاتا ہے۔

علیا بیگم صاحب سے بھی اسی طرح امیر صاحب مشورہ لیا کرتے تھے۔ اور یوں بھی وہ اعتماد الدولہ کی صاحبزادی تھیں جو حکمران طبقہ کے خاندان کے بزرگ تھے۔ دوسرا سبب یہ تھا کہ یہ بذاتِ خود بڑی نیک پارسا اور سخی عورت تھیں۔ معین الدولہ امیر امان اللہ خاں کا مخالفین سے ملنا ان کا طبعی میلان تھا۔ اور نصر اللہ خاں، نائب السلطنت سے مل گئے۔ جشن کی سیر میں امیر حبیب اللہ صاحب پر بالاخانہ سے گولیاں چلائی گئیں۔ مگر امیر صاحب بچ گئے۔ ابھی حرب عمومی (Great War) ختم نہیں ہوئی تھی۔ مستوفی الممالک (وزیر مال) نے اس کا الزام سردار معین الدولہ امان اللہ خاں اور ان کے رفیقوں پر لگایا۔ اس سبب سے سردار نائب السلطنت نصر اللہ خاں اور سردار معین الدولہ امان اللہ خاں میں اتفاق ہو گیا۔ اور ان کے ساتھ محمود خاں طرزی اڈیٹر اور سردار سپہ سالار نادر خاں بھی مل گئے۔ اب یہ جماعت بہت قوی ہو گئی۔ یہ دونوں سردار یعنی محمود خاں طرزی اور سپہ سالار نادر خاں دونوں کے دونوں سردار معین الدولہ امان اللہ خاں کے طرفدار تھے۔ اور سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اس لیے امیر امان اللہ خاں کے زمانہ میں جس قدر ظلم اور داخلی نظام میں خرابیاں ظاہر ہوئیں اس کے ذمہ دار براہ راست سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت تھے۔ اس طرح جس کا لوگ تجربہ کر چکے ہوں اس کو دوبارہ بادشاہ نہیں دیکھ سکتے۔ اور سردار عنایت اللہ معین السلطنت نہایت سادہ مزاج تھے۔ اس لیے انھیں سیاسی انقلاب میں قابلِ اعتبار نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ اور اس وقت تو وہ علانیہ باپ کے طرفدار تھے۔ سردار امان اللہ خاں کی شرکت سے تکمیلِ انقلاب میں بہت آسانی ہو گئی تھی۔ علیا حضرت صاحبہ امیر حبیب اللہ کی خانگی زندگی پر حاوی تھیں۔ امیر صاحب کو ان کے توسط سے پیغام پہنچایا گیا کہ اگر وہ اپنی بداخلاقی سے باز نہ آئے تو ان کی خیر نہیں۔ مگر اس کا ان کے مزاج پر اُلٹا اثر ہوا۔

امیر حبیب اللہ خاں صاحب اس جستجو میں تھے کہ جشن کی سیر میں جو گولیاں برسائی گئی تھیں

اس کی ذمہ دار کون سی جماعت تھی۔ مستوفی الممالک یعنی وزیر مال اور ان کے رفیقوں کا یہ خیال تھا کہ امیر امان اللہ خاں کے رفیقوں نے یہ کام کیا ہے۔ اور یہ بات امیر حبیب اللہ خاں کے کانوں میں پہنچا دی۔ مگر امیر حبیب اللہ خاں نے جلد بازی سے کام نہ لیا۔ لیکن جب علیا حضرت صاحبہ نے اُن کو سمجھایا اور بہت نصیحت کی تو امیر حبیب اللہ خاں یہ سمجھے کہ واقعی امیر امان اللہ خاں اس سازش کے سرغنہ ہیں۔ علیا حضرت کے سمجھانے کے بعد امیر شہید جلال آباد شکار کے لیے تشریف لے گئے۔ اور معتمد لوگوں سے سنا گیا تھا کہ وہ شکار گاہ جا کر ایسا حکم نکالیں گے کہ اس سازش کے سرغنہ لوگوں کو قتل کیا جائے۔ مگر تقدیر کچھ اور چاہتی تھی۔ شکار گاہ میں پہنچ کر پہلے ہی وہ شکار کو چلے گئے۔ امیر صاحب کی عادت تھی کہ عصر کے وقت شکار گاہ سے واپس آتے تھے۔ نیز ان کے سب کام کے اوقات مقرر تھے۔ اور امیر شہید کے سر کی نگہبانی کی ذمہ داری ولی اور ہاشم برادران سردار سپہ سالار نادر خاں کی تھی۔ جب امیر شہید خیمہ میں ۲۰ منٹ وقتِ مقررہ سے پہلے آ گئے تھے تو آپ نے ولی یا ہاشم کو چائے لانے کے لیے کہا۔ قاعدہ یہ تھا کہ باہر سے آتے ہی فوراً چائے پیش ہو جاتی تھی۔ لیکن ان میں سے جو چائے لانے کے لیے گیا تھا اُس نے واپس آ کر کہا کہ آپ ذرا وقت سے پہلے آئے ہیں اس لیے چائے تیار نہیں ہے۔ اس پر امیر شہید نے غصہ میں آ کر ہاشم کو بہت مارا۔ پھر جب اس کو چھوڑا تو وہ بھاگا اتنے میں چائے تیار ہو گئی۔ وہ لے آیا اور پیش کر دی۔ وقت قریب الغروب تھا۔ چائے پی کر امیر شہید نے نماز مغرب پڑھائی۔ نماز مغرب کے فوراً بعد روٹی کھائی اور نماز عشا پڑھائی اور سو گئے۔ بارہ بجے رات کے قریب کسی نے امیر صاحب کو گولی سے ہلاک کیا۔ گولی سر میں لگی تھی۔ دربان نے آواز دی کہ امیر صاحب شہید ہو گئے۔ ولی اور ہاشم سر کے نگہبان تھے اور ان کا خیمہ امیر صاحب کے خیمے کے قریب تھا۔ وہ دوڑتے آئے اور دربان کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ اس سے امیر شہید کا قاتل مخفی ہو گیا۔ مولانا سندھی اس وقت مستوفی الممالک وزیر خزانہ کے ہاں نظر بند تھے۔ وزیر خزانہ جلال آباد میں تھے۔ اور مستوفی الممالک صاحب نے مولانا کی نگرانی پر مولانا سیف الرحمٰن کو مقرر کیا ہوا تھا۔

یہ مولانا سیف الرحمٰن قوم کے افغان اور مدرسہ نعمانیہ دہلی کے صدر مدرس تھے۔ حدیث مولانا رشید احمد سے پڑھی اور باقی علوم مولانا شیخ الہند سے پڑھے تھے۔ اور لطف یہ ہے کہ مولانا سندھی کے ہم عمر تھے اور آپس میں دوست تھے۔ مولانا شیخ الہند نے مولانا سیف الرحمٰن کو حکم دیا کہ صوبہ سرحد میں حاجی ترنگ زئی کے پاس جاؤ۔ اس کے گھر کا بوجھ اور پس ماندگان کا بوجھ مولانا سندھی نے اٹھایا۔ مولوی عبید اللہ لغاری صاحب بھی اس وقت حاضر تھے۔ مولانا شیخ الہند جناب مولوی محمود الحسن صاحب کے شاگرد رشید تھے۔ مولانا شیخ الہند نے مولانا سیف الرحمٰن کو حاجی ترنگ زئی کی طرف بھیج دیا کہ وہ وہاں رہ کر یاغستان میں اپنی تحریک آزادی قائم کریں۔ پھر یہ ۱۹۱۶ء کے آخر میں کابل آگئے۔ اور مولانا سندھی کے ساتھ رہتے تھے۔ جب مولانا سندھی نے ریشمی خطوط ہندوستان بھیجے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے تو وہ بگڑ گئے۔ انگریزوں نے احتجاج کیا۔ اس پر امیر شہید نے باہر کے لوگوں کو افغانستان سے نکال دیا۔ چونکہ مولانا سندھی کے پاس افغان نیشنل سرٹیفکیٹ تھا اس لیے ان کو نظر بند کر دیا۔ اسی طرح ان کے ساتھی صاحبان کو ان کے ہمراہ نظر بند کر دیا۔ اور مولانا سیف الرحمٰن نے انگریزی عملداروں سے کہا کہ میں آئندہ گورنمنٹ برطانیہ ہند کے لیے کام کروں گا تو انھوں نے مولانا سیف الرحمٰن کو سفارشی خط دے کر کابل واپس کر دیا۔ اپنے قول کے مطابق مولوی سیف الرحمٰن انگریزوں کے بہت ہی کام آئے۔ تفصیل ہم بیان کر چکے ہیں۔

مولوی سیف الرحمٰن جناب مولانا مولوی عبید اللہ صاحب سندھی کی سخت نگرانی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات تنگ کرنے پر اتر آتے تھے۔ اس وقت مولانا مستوفی الممالک کے ہاں نظر بند تھے۔ مولوی عزیز احمد ان کا بھتیجا ان کے ساتھ رہتا تھا۔ مولانا عزیز احمد فرماتے ہیں کہ مستوفی الممالک شکار گاہ نہیں گئے تھے، بلکہ جلال آباد میں ٹھہر گئے تھے۔ مولانا سندھی بھی مستوفی الممالک کے ساتھ تھے۔ اور اس وقت جب امیر صاحب شہید ہوئے تو مستوفی الممالک جلال آباد میں تھے۔ اور مولانا بھی وہیں تھے۔

مولانا کو صبح خبر ہوئی کہ امیر صاحب شہید ہو گئے ہیں۔ اگرچہ مستوفی الممالک کو ٹیلی فون کے ذریعہ خبر مل گئی تھی، اور مولوی سیف الرحمن کو بھی خبر تھی، مگر ہم لوگوں کو خبر نہیں تھی۔ مولانا عزیز احمد صاحب فرماتے ہیں کہ امان اللہ خاں کے دوست شکارگاہ میں بہت تھے۔ جب امیر صاحب شہید ہوئے تو شکارگاہ سے ٹیلی فون کاٹ دیا گیا۔ اور آدمی کو بھیجا کہ ٹیلی فون کا مرکز جو جلال آباد میں ہے وہ بھی کاٹ دیا جائے۔ امان اللہ خاں کے دوستوں نے ایک آدمی روانہ کر کے جلال آباد سے کابل کو جانے والے راستہ پر ٹیلی فون اسٹیشن سے معین الدولہ امان اللہ خاں کو ٹیلی فون کیا تو کابل کے اسٹیشن نے امیر امان اللہ خاں سے ٹیلی فون ملا دیا۔ امان اللہ خاں نے پوچھا "چہ خبر است؟" اس نے کہا "امیر صاحب شہید شد"۔ معین الدولہ نے کہا "فہمیدم!"

جب مرکز جلال آباد سے ٹیلی فون کاٹنے کا حکم دیا تو امان اللہ کے دوستوں نے یہ تجویز کی کہ اگر معین الدولہ کو خبر نہ ہوئی تو صبح سویرے شکارگاہ میں آجائیں گے۔ شکارگاہ میں یہ تجویز ہوئی تھی کہ نصر اللہ خاں کو بادشاہ بنا دیا گیا تھا اور اس کی بیعت شروع ہو گئی تھی۔ اور کابل کا لشکر امیر امان اللہ خاں کی زیر نگرانی تھا۔ جب بارہ بجے رات کو امیر صاحب شہید ہوئے اور امیر امان اللہ خاں کو بھی خبر ہوئی تو امیر امان اللہ خان نے ارکین دولت کو بلا کر اعتماد الدولہ (امیر عبد الرحمن خاں کے وزیر جوان کے خاندان محمد زئی کے سردار تھے) کو بلایا۔ اور علیا حضرت ان کی لڑکی تھیں۔ اعتماد الدولہ کی مرضی تھی کہ امان اللہ خاں بادشاہ بنے۔ اس لیے ان کو بادشاہ بنا دیا گیا۔

دو بجے رات کو امان اللہ خاں کی بیعت ہوئی۔ سب لشکر اور ارکینِ دولت نے امان اللہ خاں کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس وقت جلال آباد کے مرکز سے ٹیلی فون کاٹ دیا گیا۔ امیر امان اللہ خاں نے حکم دیا کہ ٹیلی فون درست کر دیا جائے۔ موٹریں دوڑ پڑیں۔ سورج نکلنے سے پہلے ٹیلی فون درست ہو گیا۔ اور شکارگاہ میں بھی اعلان ہوا کہ امیر امان اللہ خاں کو لشکر اور ارکینِ دولت نے بادشاہ تسلیم کر لیا ہے تو ہنستے ہوئے امیر نصر اللہ خاں نے اپنی بادشاہی سے استعفا دے دیا۔ امیر صاحب کے

بڑے بیٹے عنایت اللہ خاں کو بادشاہ کر کے اس سے بیعت لی تاکہ آپس میں دو بھائیوں کی لڑائی ہو۔ پھر صبح کو سورج نکلنے کے بعد سپہ سالار نادر خاں کی طرف یہ حکم آیا کہ عنایت اللہ خاں اور نصر اللہ خاں دونوں کو گرفتار کر کے کابل بھیج دیا جائے۔ تو نادر خاں نے دونوں کو گرفتار کر کے کابل روانہ کر دیا اور سر شہید کو وہیں دفن کر دیا گیا۔

اور دوسرا حکم یہ تھا کہ جو اجنبی لوگ ہندوستانی یا کسی اور ملک کے ہیں ان کو حکم دیا جائے کہ اپنے اپنے ملک چلے جائیں۔ ورنہ یہاں گرفتار کر لیے جائیں گے۔

مولانا سندھی نے یہ حکم جلال آباد میں سنا تو مولانا بھی یاغستان جانے کی تیاری میں لگ گئے۔ جلال آباد میں ایک امیر کے ہاں ٹھہرے تاکہ یاغستان کو روانہ ہو جائیں مگر ایک اور امیر کو امیر امان اللہ خاں بادشاہ نے روانہ کر دیا کہ مولانا سندھی کو ہمارے پاس حاضر کرو۔ جلال آباد میں ڈھونڈ کر آؤ۔ تمام اسٹیشنوں پر حکم دیا گیا کہ کسی اجنبی کو کابل آنے کی اجازت نہیں ہے۔

مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ اُس نے ہمیں موٹر میں بٹھا کر پردہ کر دیا۔ اور کابل کو روانہ ہوا۔ ہر اسٹیشن پر موٹر کو بند کر دیا جاتا۔ اور جب ان سے پوچھا جاتا "یہ کون ہیں؟" تو کہتا "ہمارا اعیال ہے۔" کیونکہ انھیں سب ہی پہچانتے تھے کہ امیر امان اللہ خاں کا خاص آدمی ہے۔ یہاں تک کہ ہم کابل پہنچ گئے۔ بڑی تفتیش ہوتی رہی۔ اس نے موٹر کو جا کر دربار میں روکا۔ اور میرا ہاتھ پکڑ کر امان اللہ خاں کے دربار میں لے گیا۔ امان اللہ بادشاہ افغانستان نے ہمیں دیکھ کر بڑی خوشنودی کا اظہار کیا۔ اور فرمایا "من ہمو ہستم کہ باشما ملاقات کردہ بودم۔" مولانا فرماتے ہیں کہ جب میں پہلی بار کابل آیا اور محمود خاں طرزی کے ہاں دعوت تھی۔ اس وقت امان اللہ خاں اسی دعوت میں مدعو تھے۔ میں دوران گفتگو ایسے الفاظ سے امیر امان اللہ خاں کو مخاطب کرتا رہا جس سے وہ سمجھتا تھا کہ میں اُسے ولی عہد سمجھتا ہوں۔ پھر اس کے بعد بھی جب امیر امان اللہ خاں سے ملاقات ہوتی تو ہم نے ویسے ہی خطاب کیا گویا وہ سمجھ رہا ہے کہ ولی عہد میں ہوں۔ اور امیر امان اللہ خاں

اس وقت شہزادے تھے۔ اس لیے بہت خوش ہوئے۔ میں نے اس دعوت میں یہ الفاظ بھی کہے تھے کہ "من بجز شما کسے را لائق نمی دانم کہ والی افغانستان باشد" اس لیے اس دربار میں فرمایا "من ہمو ہستم" یعنی جیسے آپ فرماتے تھے کہ ولی عہد میں ہوں تو اب بھی میں وہی ہوں۔ اس کے چند دن بعد مجھے بلایا اور کہا کہ میں آپ کو بڑا وزیر بناتا ہوں۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ یہ عہدہ کسی افغان کو دیا جائے پھر وہ جو مشورہ لے گا میں دوں گا۔ میں کسی منصب یا عہدے کو قبول نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اگر میں وزیر اعظم بن جاؤں تو سردارانِ افغانستان میں ناراضگی پھیل جائے گی۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کر دیا جو مصلحت اور خیر خواہی استقلالِ افغانستان کے متعلق ہوگی آپ کی خدمت میں عرض کرتا رہوں گا۔ اور جو وزیر اعظم بنایا جائے گا اُسے بھی مشورہ دیتا رہوں گا۔ تو امیر امان اللہ اس سے بہت خوش ہوئے۔

مولانا فرماتے ہیں اس کے بعد جو بھی ملکی مصلحت ہوتی تھی مجھ کو اس میں شریک کرتے تھے۔ کوئی ایسا کام نہ تھا اور ملکی مصلحت نہ تھی جس میں ہمیں شریک نہ کیا جاتا ہو۔ لوگوں میں انگریزوں سے جنگ کرنے کے لیے امیر امان اللہ خاں نے زور دیا اور جرگہ بلایا۔ سب سردار اور علمائے افغانستان اس پر متفق ہوئے کہ افغانستان کے استقلال کے لیے جنگ ضرور کی جائے۔ مولانا سندھی فرماتے ہیں کہ میں وہاں خاموش رہا۔ پھر مخاطب ہو کر امیر امان اللہ خاں نے مجھ سے مصلحت طلب کی۔ میں نے کہا کہ میں سوچ کر جواب دوں گا۔ اس کے بعد مجھے تخلیہ میں بلایا۔ میں نے اپنی رائے عرض کی کہ افغانستان کو انگریزوں سے جنگ کرنی چاہیے۔ مگر اعلانِ جنگ نہ کیا جائے اور سرحدوں پر لشکر جمع کر لیا جائے۔ جب توپ انگریزوں کی طرف گولہ پھینکے اس وقت سارے بادشاہوں میں اعلان کر دیا جائے کہ انگریزوں نے ہم پر حملہ کر دیا ہے۔ انھوں نے اس رائے پر عمل کیا۔

لطیفہ :۔ جب سب صاحبانِ اراکین جمع ہو کر یہ رائے تجویز پیش کر رہے تھے۔ تو ان میں سے ایک سردار بڑے آدمی نے آواز دی کہ امیر حبیب اللہ کو اس لیے

قتل کیا گیا ہے کہ وہ بہت عورتیں رکھتا تھا۔ اب امیر امان اللہ خاں جو امیر حبیب اللہ خاں کا بیٹا ہے یہ بھی اپنے باپ کی تقلید کرے گا۔ اول اس کو خصی کرو پھر بادشاہ بناؤ ورنہ جو خصی ہونے پر راضی ہو گیا اس کو بادشاہ بنایا جائے گا۔ اس پر امیر امان اللہ خاں نے قسم کھائی کہ میری ایک عورت ہے اس سے علاوہ کوئی اور عورت نہیں کروں گا اس وقت امیر امان اللہ خاں کے گلے میں قرآن شریف حمائل تھا۔ اس قسم کے بعد بیعت شروع ہوئی۔ یہ بادشاہ اپنی قسم پر اس وقت جما ہوا ہے۔

جس رات امیر حبیب اللہ خاں قتل ہوا اس رات کا پروگرام یہ تھا، کہ صبح کو امیر معین السلطنت عنایت اللہ خاں کابل پہنچے گا اور کابل کا کام سنبھال لے گا۔ اور معین الدولہ امان اللہ خاں صبح کو یہاں شکارگاہ میں پہنچے گا۔ یہ پروگرام امیر شہید نے قتل سے ایک روز پہلے بنایا تھا۔ عام لوگوں کا یہ خیال تھا کہ جب امیر امان اللہ خاں صبح کو شکارگاہ پہنچیں گے تو جتنے ان کے رفیق سازشی ہیں اور جن کے نام مستوفی الممالک نے بتلائے تھے، امیر شہید حکم دیں گے کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ یہی پروگرام کا مطلب تھا۔ مگر خدا کی قدرت اسی رات یہ واردات قتل ہو گئی۔ اگر یہ پروگرام عمل میں آجاتا تو امان اللہ خاں اور سپہ سالار نادر خاں اور ان کے بھائی سب قتل ہو جاتے مولانا سندھی اپنا غالب گمان بتلاتے تھے کہ باڈی گارڈ ولی یا ہاشم دونوں میں سے ایک امیر صاحب کا قاتل تھا۔ اور وہی خاص خیمے میں آتے جاتے تھے۔ جب وہ دشمن بن گئے تو محافظ دوسرا کوئی نہ تھا۔

سازشیوں نے یہ ڈراما اسی طرح سوچا تھا کہ امیر صاحب کو قتل کر دیا جائے تو وہاں نائب السلطنت نصر اللہ خاں کے روبرو سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت کا حق زائل ہو جائے گا اور پھر نائب السلطنت کے مقابلے میں امیر امان اللہ خاں کو امیر بنا دیا جائے گا اور سردار نائب السلطنت نصر اللہ خاں کو ختم کر دیا جائے گا کئی موقعوں پر یہ کام بنتے بنتے رہ گیا۔ لیکن خدا کو منظور تھا، اس لیے یہ سارا معاملہ بخیر و خوبی اس طرح انجام پذیر ہوا۔ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے پہلے دن استقلال کا دعویٰ کیا۔

بیعت سے قبل امان اللہ خاں سے ارا کینِ سلطنت نے عہد لیا تھا کہ وہ انگریزی تسلط سے آزاد ہوں گے۔ اور بیعتِ استقلال لی تھی۔ اور دوسرا یہ کہ اس استقلال کے لیے انگریزوں سے جنگ کرنی ہو گی۔ امیر امان اللہ خاں نے بادشاہ ہونے پر استقلال کا دعویٰ کر دیا۔ اور انگریزوں، روسیوں، ایرانیوں کو اپنی آزادی وخود مختاری سے مطلع کر دیا۔ انگریزوں نے مبارک بادی میں وہی آزاد حکمرانوں والا آرڈریا خطاب نہ کیا بلکہ ہز ہائینس (His Highness) امیر کے لفظ سے خطاب کیا۔ اس سے امیر امان اللہ خاں جل گئے۔

اور ہم قید وبند سے آزاد ہو گئے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

امیر امان اللہ خاں سے ہمارا التعارف:۔ شروع میں جب ہم کابل پہنچے تو شیخ ابراہیم جو مولوی محمد صادق کراچی والے کے چچا زاد بھائی اور حبیبیہ کالج کابل کے پروفیسر تھے ہم سے ملے۔ انھوں نے ہمیں دولتِ افغانیہ اور تمام اراکین کے متعلق مفصل اطلاعات بہم پہنچائیں۔ جب سردار نصر اللہ خاں نائب السلطنت اور اور سردار عنایت اللہ خاں معین السلطنت کے معاملات بتا چکے تو آخر میں کہنے لگے کہ پسِ پردہ ایک قوت ہے جو نہایت سنجیدگی سے باقاعدہ ترقی کر رہی ہے۔ اور وہ سردار امان اللہ خاں معین الدولہ ہے۔ اس کے بعد ہماری ملاقات اُن سے نہ ہو سکی۔ پہلے ایک دفعہ سردار امان اللہ خاں معین الدولہ نے ہم کو اپنے پاس بلایا تھا اور مستقبل کے متعلق اشارہ وکنایہ میں باتیں ہوتی رہیں۔ یہ ملاقات بھی ہمارے خاص دوست کی مہربانی سے تھی۔ یعنی میرا پروگرام ان کو سردار محمود خاں طرزی نے بتا دیا تھا۔ اور کھانے پر مجھ کو محمود خاں طرزی نے دعوت دی تھی، اس میں امان اللہ خاں بھی آئے تھے۔ اس وقت تو معمولی باتیں ہوئیں تھیں۔ مگر یہ دوسری دفعہ میرا پروگرام سننے کے لیے مجھ کو بلایا اس میں اشارہ وکنایہ میں باتیں ہوئیں۔ میں ان کو اس طرح خطاب کرتا رہا جیسے وہ ولی عہد ہونے والا شہزادہ ہو۔ اور مستقبل کے متعلق بہت سی باتیں ہوئیں۔ ہم نے انھیں یقین دلایا کہ ہم

آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کے فضل سے میں اس میں کامیاب رہا۔ اس کے بعد ہمارے متعلق مفصل معلومات سردار محمود خاں طرزی سردار امان اللہ خاں معین الدولہ کو پہنچاتے رہتے تھے۔ اور دوسری طرف نادر خاں کے توسط سے اس کو پہنچتی رہتی تھیں۔

جب ریشمی خطوط ہندوستان میں پکڑے گئے تو انگریزوں نے امیر حبیب اللہ خاں (کابل) سے احتجاج کیا۔ جس پر مولانا سندھی اور ان کے ساتھی نظر بند کر دیے گئے۔ اس ریشمی خطوط بھیجنے کے وقت ایک مشن ترکی کو بھیجنا تھا۔ اور دوسرا جاپان کو۔ اس وقت پیسوں کی ضرورت ہوئی۔ مولانا سندھی نے ڈاکٹر عزت بیگ سے جو شفاخانہ کے بڑے ڈاکٹر تھے بطور قرض ایک ہزار کابلی روپیہ ایک سال کے وعدے پر اُدھار لیا تھا۔ اب مولانا سندھی مستوفی الممالک وزیر مال کے پاس نظر بند تھے۔ اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ:-

ہم نے بعض اشد ضرورتوں کی وجہ سے ڈاکٹر عزت بیگ سے ایک ہزار روپیہ ایک سال کے وعدے پر قرض لیا تھا۔ جب یہ مدت پوری ہونے کو ہوئی تو اس وقت ہم مستوفی الممالک کے پاس نظر بند تھے۔ روپیہ کہیں سے لے کر ادا نہیں کر سکتے تھے۔ اور عدم ادائگی کا اثر ہمارے مستقبل پر برا ہوگا اسے ہم خوب سمجھتے تھے۔ ہم نے مجبوراً سردار امان اللہ خاں معین الدولہ کی خدمت میں اپنی ضروریات مفصل لکھ کر عرض کی کہ مکمل بارہ سو روپیہ ایک سال کے لیے ضرور دلوایا جائے۔ یہ دو سو روپیہ زائد ہم نے آغا سید علی بخاری کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے لکھا تھا۔ ایک عرصہ سے وہ بھی پشاور سے ہجرت کر کے آئے تھے۔ اور امیر شہید صاحب نے انھیں ہم سے علیٰحدہ نظر بند کر دیا تھا۔ جس وقت سید الاحرار مولانا محمد علی جوہر مغفور ہمیں رخصت کرنے کے لیے دہلی آغا صاحب موصوف کے پاس تھے اور ہم ان کے ساتھ تھے۔ اُس وقت ان سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

یعنی اتنی تھوڑی شناسائی کے لیے جو مولانا سندھی کو آغا صاحب موصوف سے تھی انھوں نے ان کی امداد کرنا اپنا فرض سمجھا۔

الغرض سردار امان اللہ خاں معین الدولہ نے تمام روپیہ شام کو مخفی طور پر مستوفی الممالک کے گھر پہنچا دیا۔ جب اعلیٰ حضرت حبیب اللہ خاں شکار گاہ میں قتل ہوئے اس وقت ہم مستوفی الممالک کے ساتھ جلال آباد میں نظربند تھے۔ اور مولانا سیف الرحمٰن کی زیرِ نگرانی رہتے تھے اور مولانا سیف الرحمٰن کے کاموں سے متجاہل بن کر ان سے معاملہ کرتے تھے۔ اس میں ہمیں بعض سخت تکلیفیں پہنچیں۔ مولانا نہیں چاہتے تھے کہ ہمیں واقعات کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوں۔ مگر خدا کی قدرت، اڑتی چڑیا ہمارے کانوں میں بہت کچھ کہہ جاتی تھی۔ بعض حصے ہم فوراً سمجھ لیتے تھے۔ بعض اوقات واقعہ گزرنے پر حقیقت منکشف ہو جاتی تھی۔

اس میں اشارہ ہے کہ امیر حبیب اللہ کے قتل کی خبر ہمیں مولانا سیف الرحمٰن نے نہیں دی۔ مگر سپہ سالار نادر خاں کے نوکروں میں سے ایک نے ہمیں فوراً اطلاع کر دی تھی اور ہم نے اسی وقت ایک طالب علم کو دوڑایا۔

نصر اللہ خاں شکار گاہ میں جب بادشاہ بنائے گئے تو ہم کو خبر پڑی کہ اس نے یہ بھی حکم نکالا کہ ہندوستانی لوگ ہماری سلطنت سے چلے جائیں۔ صبح کے وقت ہم کیمپ سے جلال آباد کی طرف چلے۔ جلال آباد میں ایک ہفتہ تک پریشان پھرتے رہے۔ جب اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کابل میں مستقل بادشاہ ہو گئے تو انھوں نے ہمیں جلال آباد سے طلب فرمایا۔ جب ہم دربار میں حاضر ہوئے تو امیر صاحب نے مسکرا کر فرمایا "من ہمو ہستم" اور خاص ملاقات کی طرف اشارہ فرمایا۔ اس کا تذکرہ ہم کر آئے ہیں۔

باب ششم

اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کی سلطنت میں چند روز ہم نے اپنی حکومت کی ذرا جھلک دیکھی۔ جس طرح وہ اپنے وزرار کی پہلی صف پر اعتماد کرتے تھے، ہمارے ساتھ بھی ان کا معاملہ تقریباً ویسا ہی تھا۔ ہم ان کی پرایوٹ مجالس میں شامل ہوتے جیسے وہ اپنے خاندان اور قومی بزرگوں کا احترام کرتے تھے ویسے ہی ہم سے پیش آتے تھے۔ ہم نے جو مشورہ دیا وہ قبول فرمایا۔ ہم نے کوئی سفارش نہیں کی جو رد کردی گئی ہو۔ ایسی حالت میں ہم سے جو کچھ ہوسکتا تھا ہم نے کیا۔ سلطنتِ افغانستان کو مستقل اور مستحکم بنانے میں کوئی دریغ نہیں کیا۔ یہ تمام سیاسی معاملات ابھی تک تاریخ کے درجہ تک نہیں پہنچے۔ اس لیے ہم تفصیلات نہیں لکھ سکتے۔

اس عبارت میں مولانا سندھی نے اپنے کام جو آپ نے استحکامِ سلطنتِ افغانستان کے لیے سرانجام دیے اشارةً بیان کیے ہیں۔ اب ہم ان کی تفصیل بیان کرتے ہیں کہ جب اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے استقلال کا دعویٰ کیا اور انگریزوں نے مبارک بادمیں ہز ہائینس (His Highness) لکھا تو وہ مبارک بادی کا پرچہ مجھے دکھایا۔ کہ اب استقلال کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ اور قوم بھی مجھ سے تقاضا کررہی ہے کہ انگریزوں سے لڑو۔ یہ مجلس پرائیوٹ تھی۔ اس میں سوائے میرے اور امیر کے اور کوئی موجود نہ تھا۔ میں نے عرض کیا بلا اعلان، جنگ شروع کردو اور اللہ پر توکل رکھو۔ انھوں نے یہ رائے منظور کرلی۔ افسرانِ فوج کو حکم دے دیا کہ جاکر فوراً لڑائی کرو۔ تو فوج جلال آباد گئی۔ اس کے ساتھ برکت کے طور پر مجھ کو روانہ کیا۔ اور نادر خاں سپہ سالار کو حکم دیا کہ ٹھل پر حملہ کرو۔ اور یونس خاں گورنر قندھار کو لکھا کہ تم چمن اور کوئٹہ پر حملہ کرو۔ تبرکاً مولوی عبدالرزاق خاں سرپرست میزان العدالت کو روانہ کیا۔ جب سپہ سالار نادر خاں ٹھل کو جانے لگے۔ اور ان کے ساتھ آگ لگانے والی توپ بھی تھی تو میں نے نادر خاں سے کہا کہ ایک ہمارا آدمی لیتے جاؤ۔ اُس نے قبول کرلیا۔ یہ حکم اعلیٰ حضرت نے صرف افسرانِ فوج کو دیا۔ عوام

فوج کو کوئی خبر نہ تھی۔ بہت تیزی سے ہر ایک افسر اپنے مقام کو فوج لے کر روانہ ہو گیا۔ مقررہ وقت پر حملہ ہو گیا۔ اور جنگ شروع ہوئی۔ گورنمنٹ ہند بالکل غافل تھی، ناگہاں اُس پر ہر محاذ پر توپیں برسنی شروع ہو گئیں۔

اب جلال آباد محاذ کی حالت بیان کرتے ہیں۔ صبح سے لڑائی شروع ہوئی۔ اُدھر سے بھی جواب آنے لگے۔ مگر سپہ سالار فوج کی غلطی یہ تھی کہ صبح سے دوپہر تک ایک ہی فوج لڑتی رہی۔ دوسری فوج جو باقی تھی اس کو محاذ پر روانہ کرتا۔ اس لیے وہ ناچار ہو کر پیچھے ہٹے۔ اگر پندرہ منٹ اور ٹھہرے رہتے تو انگریزی فوج پیچھے ہٹ جاتی۔

محاذِ ٹھل کی حقیقت :۔ ٹھل کے قلعہ پر آگ لگانے والی فوج نے دو گولے پھینکے لیکن وہ نہ معلوم کہاں گئے۔ اس توپ کے گولے صرف سات تھے۔ سپہ سالار حیران ہو کر رہ گیا۔ اس پر ایک ظفر حسین طالب علم آگے بڑھا اور توپ کی کتاب سپہ سالار سے لے لی اور دوربین کے ذریعہ میٹر توپ باندھا۔ اس کے بعد سپہ سالار سے کہا کہ اب فائر کرو اس پر جب فائر کیا گیا تو قلعہ کے عین وسط میں پڑا۔ اور قلعہ میں آگ لگ گئی۔ اس پر ظفر حسین نے دوربین سے دیکھا کہ انگریزی فوج نے قلعہ سے باہر نکل کر کیمپ ڈالا۔ پھر اس نے دوربین سے اندازہ لگا کر وہاں گولا پھنکوایا تو انگریزی فوج نے سفید جھنڈا کھڑا کر دیا۔ یہ آگے بڑھنے لگے کہ قلعہ پر قبضہ کریں۔ مگر انگریزی فوج سے ایک گولہ اِدھر آیا یہ گولہ انگریزی فوج نے اس لیے پھینکا تھا کہ معلوم کریں کہ ان کے پاس اور بھی گولے ہیں یا نہیں۔ پھر ظفر حسین نے دُوربین سے میٹر باندھا اور گولہ پھنکوایا۔ اس سے انگریزی فوج فرار ہو گئی۔ اور ٹھل کا قلعہ افغانیوں کے ہاتھ آ گیا۔ اور علاقہ ٹھل فتح ہو گیا۔

محاذ چمن و کوئٹہ :۔ جب سردار یونس خاں گورنر قندھار جانے لگا تو مولانا سندھی نے اپنے دو آدمی اس کے ہمراہ کر دیے۔ ان میں ایک محمد علی برادر مولوی احمد علی صاحب لاہوری کا تھا۔ وہاں چمن میں جنگ برابر رہی۔ نہ انگریز بڑھے اور نہ افغانی فوج بڑھی تین چار روز جنگ رہی۔ ہفتے کے بعد التوائی ہوئی۔ اور عارضی صلح ہو گئی۔

حقیقت :۔ تمام محاذوں پر ایک ہی وقتِ معینہ پر حملہ ہوا۔ اور توپیں فائر کی گئیں۔

افغانوں کی توپوں کا جواب انگریزی توپوں نے بھی دیا۔ عین اسی وقت وائرلیس کے ذریعے روس، ایران، برطانیہ، فرانس، اٹلی، جاپان وغیرہ کو خبر کر دی گئی کہ انگریزوں نے ہم پر خواہ مخواہ بلا اعلانِ جنگ حملہ کر دیا ہے۔ ہم کو ناچار ہو کر اس انگریزی حملہ کا جواب دینا پڑا ہے .... اسی وائسرائے ہند نے برطانیہ کو مطلع کیا کہ افغانستان نے ہندوستان پر حملہ کر دیا ہے۔ یہ دونوں پیغام ایک وقت پر لنڈن میں پہنچے۔ انگریزی سولجر اور برطانوی قوم حربِ عمومی میں حوصلہ اور ہمت ہار چکی تھی۔ اتحادی سیاہ برطانیہ سے ناراض ہو گئی کہ تم کو جنگ کی سوجھتی ہے۔ اور تم ملک گیری کی ہوس میں اندھے ہو۔ تمام ملکوں نے برطانیہ پر الزام رکھا کہ ملک گیری کی ہوس میں برطانیہ نے ملکِ افغانستان پر .... سلطنتِ ہند کے ذریعے حملہ کیا ہے۔ اب افغانستان بھی حق بجانب ہے۔ برطانیہ نے مجبور ہو کر التوائے جنگ اور صلح کی خواہش کی اور افغانستان نے اس کو قبول کر لیا۔ اور امان اللہ خاں کو اپنی طاقت کا اندازہ ہو گیا۔ اور جنگ بند ہو گئی۔

یہ جنگ (1st Great war) حربِ عمومی کے ختم ہونے کے بعد ہوئی تھی۔

ریشمی خطوط سنہ ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ برطانیہ ہند کو ملے۔ اس پر گورنمنٹ ہند نے برطانیہ کے ایک بڑے قانون داں کو بلایا تھا۔ اس کا نام رولٹ تھا۔ اس انگریز سے گورنمنٹ ہند نے کہا کہ وہ کوئی ایسا قانونی مسودہ تیار کرے کہ ہندوستان میں آئندہ کوئی انقلابی جماعت پیدا نہ ہو۔ اس نے ایک قانون بنایا۔ اور اس قانون کا نام "رولٹ ایکٹ" رکھا۔ اس میں بہت سخت دفعات تھیں۔ یعنی انقلابی سیاسی آدمیوں کے خلاف ان کی غیر حاضری میں مقدمات چلائے جائیں گے اور فیصلے کیے جائیں گے۔ ان فیصلوں کے خلاف کوئی اپیل نہیں سنی جائے گی۔ اس قانون کی رو سے چار سال کی مدت تک یا عمر قید تک کی سزا مقرر تھی۔ اور جرمانہ بھی تھا۔ اس میں یہ بھی درج کیا کہ بیرونی سیاسی انقلابی اشخاص سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی پر اسی طرح مقدمہ چلایا جائے گا جس طرح کہ اس نے خود سازش اور بغاوت گورنمنٹ کے خلاف کی ہو۔ یہ ایکٹ سنہ ۱۹۱۶ء میں پاس ہوا تھا۔ اور جو ہندوستانی منصوبہ باز گورنمنٹ ہند کے خلاف اپنی آزادی کی کوشش کریں گے

یا اس کی مدد کریں گے ان کے خلاف بھی مقدمات چلائے جائیں گے۔ حاصل کلام اس میں بہت سخت دفعات تھیں۔ اگرچہ اس میں لکھا گیا تھا کہ مولانا عبیداللہ سندھی کی سیاسی تحریکات روکنے کے لیے یہ رولٹ ایکٹ وجود میں آیا ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے گا کہ ہندی مسلمان جو اپنی انقلابی اور آزاد تحریکات بیرونی طور پر شروع کر بیٹھے ہیں ان کو روکنے کے لیے یہ قانون ہے۔

انگریزوں کو معلوم تھا کہ ان بیرونی تحریکات کے پیشوا اور مرشد مولانا مولوی محمود الحسن شیخ الہند دیوبندی ہیں۔ ان کی مسلمانوں میں بہت عزت ہے۔ ان کو دکھلانے کے لیے کہ وہ بڑی ہستی ہیں مولوی عبیداللہ کا نام رولٹ ایکٹ میں دکھلایا گیا۔

جنگِ عمومی ختم ہوتے ہی ہندوستان میں اس رولٹ ایکٹ کا اعلان کر دیا گیا۔ اور اس کو نافذ کر دیا گیا۔ اس ایکٹ کی زد زیادہ تر ہندوؤں پر پڑتی تھی۔ ہندوؤں کو احساس ہو گیا اور وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور مسلمان ترکی کی شکست کی وجہ سے خلافت کمیٹی بنانے لگے تھے۔ مسلمانوں میں ہل چل مچی ہوئی تھی اس لیے مسلمان ہندوؤں سے مل گئے۔

جنگ عمومی ۱۹۱۶ء میں گاندھی انگریزوں کی امداد کے لیے ہندوستانیوں کو بھرتی کراتا رہا۔ جب جنگ ختم ہوئی اور رولٹ ایکٹ کی شورش پیدا ہوئی تو گاندھی بیدار ہوا اور اس نے کہا کہ تم سب ہندو اور مسلمان میرے ساتھ ہو جاؤ۔ ہم مل کر ترکی کے استقلال کے لیے اور رولٹ ایکٹ منسوخ کرانے کے لیے جد وجہد کریں گے۔ اس وقت گاندھی نے افریقہ کے علاقہ نٹال میں ستیہ گرہ کیا تھا، اور کامیاب ہوا تھا۔ اس لیے اس نے کہا ہندوستان میں بھی ستیہ گرہ کرکے ہم رولٹ ایکٹ اور ترکی کے استقلال کے لیے کامیاب ہوں گے۔ اس پر ہندو مسلمان سارے اس کے ساتھ ہو گئے۔ اور ایک بڑا جلسہ لاہور میں ہونے والا تھا۔ اس میں شمولیت اور صدارت کے لیے اس کو گجرات سے بلایا گیا تھا جب وہ روانہ ہوا، تو انگریزوں نے روک لیا۔ اس پر احمد آباد، لاہور، وزیر آباد، امرتسر اور ملک کے مختلف حصوں میں بلوے اور فساد پھوٹ پڑے۔ عین اس وقت جبکہ یہ شورش ہندوستان میں رونما ہوئی جنگ افغانستان شروع کی گئی تھی۔ اور ایسے

وقت میں مولانا عبید اللہ سندھی نے اپنے رفیقوں میں سے اللہ نواز خاں طالب علم کو جو پنجاب سے بھاگا ہوا تھا، جنگ کے دوران گاندھی کے پاس بھیجا کہ اب وقت ہے تم شورش کرو۔ گاندھی جی نے تحریری اطلاع دی کہ ہم برابر امداد کریں گے۔ سارے ہندوستان کے بڑے بڑے امیر لوگوں کے نام خواہ وہ مسلمان تھے یا ہندو مولانا سندھی نے خطوط روانہ کیے کہ تم ہمارے ساتھ شریکِ جنگ ہو کر امداد کرو۔ وہ سب لوگ گورنمنٹ ہند کے خیر خواہ تھے وہ تمام خطوط انگریزوں کو دے دیے۔ خطوط میں یہ تھا کہ امیر امان اللہ خان ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ تم سب ہندو مسلمان خواہ بنگالی ہو یا ہندی یا پنجابی امداد کرو۔ ہندوستان سے یہ خط ہندو انقلابی نے ہندو ممبران کونسل اور ہندو امیروں کو اور مسلمان انقلابی نے مسلمانوں کو بھیجے۔ اور یہ خطوط بڑے بڑے شہروں اور صوبوں کے مرکزوں کے ہندوستانی ڈاکخانوں میں پوسٹ کے ذریعے بھیجے تھے۔ اس سے برطانوی گورنمنٹ ہند ڈر گئی کہ مولانا سندھی نے افغانستان کی امداد اور استحکام کے لیے کام کیا ہے۔

یہ تجویز و تدبیر جنگ افغانستان کے شروع ہونے سے پہلے کر چکے تھے کہ ادھر پہلی توپ چلے اور اُدھر خطوط تمام صاحبان کو ملیں۔ خطوط وقت کا اندازہ کر کے روانہ کیے گئے تھے ابھی جنگ ختم نہ ہوئی تھی کہ وہ سب صاحبان جو خطوط ڈالنے کے لیے ہندوستان گئے تھے واپس خیریت سے پہنچ گئے۔ ایک شخص پشاور اس غرض سے روانہ کیا گیا تھا کہ پشاور میں جو فوجی کمانڈر ان چیف رہتا ہے اس پر جا کر بم پھینکو۔ جب اس نے پھینکا تو وہ افسر میز کے نیچے چھپ گیا اور زندہ بچ گیا۔ یہ شخص بھی واپس خیریت سے آ گیا (یہ ایک طالب علم تھا) اور باقی اشخاص (طالب علم)، جو بم پارٹی میں گئے تھے جنگ ملتوی ہونے کی وجہ سے خیریت کے ساتھ واپس آ گئے۔ (یہ سب کے سب یاغستان کے طالب علم تھے۔ ان میں صرف ایک سندھی تھا جو ایک چال سے بچ گیا تھا)۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ ہندو جو اس وقت تک مسلمان بم پارٹی کو نہیں جانتے تھے، جان گئے کہ مسلمان بم پارٹی کسی حالت میں ہم سے پیچھے نہیں ہے۔

دہلی میں اب صلح کے لیے وفد تیار ہونے لگا۔ سپہ سالار نادر خاں کا خیال تھا کہ صلح کے وفد کا لیڈر میں ہوں۔ کیونکہ میں نے قلعہ ٹھل فتح کیا ہے۔ لیکن امان اللہ خاں امیر نے جناب محمود طرزی اڈیٹر اخبار السراج کو صلح پارٹی کا امیر بنا دیا۔ مجھ کو یہ خبر ملی تو بڑا افسوس ہوا۔ اور نادر خاں ناراض ہو گئے۔

(نوٹ) یہاں سے کابل کے انقلاب سنہ ۱۹۲۹ء کی ابتداء ہوتی ہے۔

اب حالت یہ تھی کہ جلال آباد انگریزوں کے ہاتھ میں تھا اور ٹھل کا قلعہ افغانستان کے ہاتھ میں تھا۔ اور چمن میں دونوں برابر تھے۔ جب سردار محمود خاں طرزی امیر امان اللہ خاں کی طرف سے صلح کے لیڈر مقرر ہو کر دہلی جانے لگے تو وہ میرے پاس آئے اور کہا کہ میں وفد کا سردار ہو کر دہلی جا رہا ہوں۔ آپ مہربانی فرما کر اپنے کسی خاص دوست مدبر کو خط لکھ دیں کہ انگریزوں کی چالوں سے جو بہت نازک ہوتی ہیں مجھ کو مشورہ دیتا رہے۔ میں نے سید الاحرار مولانا محمد علی صاحب جوہر کو خط لکھ دیا، کہ ان کی مدد کرتے رہنا۔ اب یہ خط محمود خاں طرزی نے وائسرائے ہند کو پہنچا دیا۔ اس وقت وائسرائے نے کچھ گاندھی کو تسلی دی تھی، کہ رولٹ ایکٹ پر نظر ثانی کی جائے گی۔ مگر اس کے برخلاف مولانا محمد علی جوہر کو رولٹ ایکٹ کے تحت چار سال کی جیل کا حکم سنا دیا۔ لیکن حسب وعدہ گاندھی نے اس سزا کو راز میں رکھا اور فوج کی تلاش میں رہے۔ جب کراچی میں مولانا نے ایک خلافت کمیٹی کے جلسہ میں تقریر کی تو اس تقریر کی آڑ لے کر اُن کو گرفتار کیا گیا۔ اور ان کے ہمراہی مولانا حسین احمد مدنی، مولانا شوکت علی اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ کو بھی گرفتار کیا۔ اور چار چار سال کے لیے قید کر دیا گیا۔ اگر اپیل ہوتی تو چھوٹ جاتے اور راز ظاہر ہو جاتا۔ مگر یہ لوگ ستیہ گرہ کے پابند تھے۔ اپیل نہ کی۔

جشن آزادی افغانستان کے بعد مجھ کو خبر ملی۔ پھر مولانا جب قسطنطنیہ میں آئے تو اپنا پروگرام شایع کیا۔ اس میں لکھ دیا کہ مولانا محمد علی کو کراچی کے مقدمے میں چار سال جیل نہیں ہوئی بلکہ کسی اور معاملہ میں ان پر خفیہ مقدمہ چلا کر چار سال قید کی سزا دی گئی تھی۔ یہ مقدمہ فقط — ڈھونگ ..... تھا۔ میں نے جب قسطنطنیہ سے اپنا پروگرام شایع کیا تو

اس میں میں نے لکھا تھا کہ مولانا محمد علی صاحب جوہر کو چار سال قید کی سزا رولٹ ایکٹ کے ماتحت دی گئی تھی نہ کہ کراچی کے مقدمہ پر۔ یہ کاپی انگریزی میں شایع ہوئی اور انگریزی کاپی یورپ اور ہندوستان میں شایع ہوئی۔ مگر کسی یوروپین اخبار نے اس پر تنقید نہیں کی۔

انگریزوں نے امیر امان اللہ خاں سے کہا کہ تمھارا وفد شرائط صلح پیش کرے۔ اس وفد کی تیاری میں ایک ماہ لگ گیا۔ اس وقت راجہ مہندر پرتاب بھی بخارا سے ہوکر واپس کابل آگئے تھے۔ اب امیر امان اللہ خاں نے ہم کو بلایا کہ صلح کی شرطوں میں ہمیں نیچا دکھایا جائے گا۔ ہم نے مشورہ دیا کہ روس سے امداد طلب کی جائے۔ اس وقت روس سلطنت اپنے پورے اقتدار پر تھی اور ٹراسکی روس کا صلاح کار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کمیونزم کو بین الاقوامی کیا جائے اور دوسرے ملکوں کو بھی اس کی دعوت دی جائے۔ اور ہندوستان میں بھی اس کا پروپیگنڈا کرنا چاہیے۔ ہندوستان میں پروپیگنڈے کے کام کرنے کا مرکز تاشقند بنایا گیا تھا۔ اور اس کا پریسیڈنٹ جوبندر ناتھ رائے تھا اس کے وسیلے سے ہندوستان میں پیسے تقسیم ہوئے تھے۔ اب ہم نے اپنے ساتھیوں کو گورنمنٹ موقتۂ ہند کا عریضہ جوبندر ناتھ رائے کے ذریعہ بھیجا اور چیچرن کی (جو روس کا وزیر خارجہ تھا) دلی خواہش تھی کہ ہندوستان میں کمیونزم کا پروپیگنڈا ہو۔ ہمارا وفد اس کی طرف روانہ ہوا۔ اور راجہ مہندر پرتاب بھی ساتھ گئے۔ جوبندر ناتھ رائے کی معرفت وزیر خارجہ سے گفت وشنید ہوئی اور ٹرسکی نے بھی امداد کی۔

امان اللہ خاں کی چٹھی راجہ مہندر پرتاب کے ہاتھ بھیجی تاکہ جس طرح ہوسکے روس سے ایک لاکھ فوجی امداد کا انتظام ہوسکے۔ کیونکہ جب ہم ان کی شرائط قبول نہیں کریں گے تو انگریز ضرور حملہ کریں گے۔ اس طرح جنگ دوبارہ شروع ہوجائے گی۔ آپ کی امداد سے ہم شمال مغربی ہند کو فتح کرائیں گے۔ آپ جتنی ضمانتیں چاہیں ہم دینے کے لیے تیار ہیں۔ تو چیچرن وزیر خارجہ نے پوچھا کہ کیا رعایتیں دو گے۔ یہ خط وکتابت ہوتی رہی۔ وزیر خارجہ نے اپنا مطالبہ پیش کیا کہ شمال مغربی علاقہ میں ہم کو ایک فوجی اڈا ملنا چاہیے۔ وہ اڈا ایسی جگہ پر ہو کہ جہاں سے ہمارا پروپیگنڈا ایران اور

سمندر کے راستے سے اور ملکوں میں بھی ہو۔ میں نے اس کو اڈا دینا منظور کر لیا۔ ان کے ساتھ یہ بھی تھا کہ افغانستان امیر امان اللہ خاں کی جائداد ہو گی۔ اور شمال مغربی ہندوستان پر امان اللہ خاں قانونی بادشاہ ہوں گے۔ اور فوجی اڈے کا مقام "وڈھ" مقرر ہوا۔ اس میں شرط تھی کہ بارہ ہزار شمال مغربی ہند کی فوج ہو گی اور ترتیب روسی افسران دیں گے۔ اور چار ہزار برّی فوج ہو گی جو سب تعلیم یافتہ ہو گی۔ جس میں ہر ایک کم از کم میٹرک ہو گا۔ اور چار ہزار ہوائی فوج ریاضی والی ہم آپ کو دیں گے۔ اسی طرح چار ہزار ریاضی والی بحری فوج ہو گی جس کو روسی ترتیب دیتے رہیں گے۔ پانچ سال کے بعد یہ فوج ترتیب یافتہ واپس شمالی ہند میں آ جائے گی اس کے عوض میں کئی اور فوج تیار کر کے دیں گے جس کو تربیت روسی فوج دیتی ہو گی۔ اگر آپ اس سے زیادہ فوج رکھ سکیں تو وہ بھی مہیا کر دی جائے گی۔ مگر خرچ اس فوج کا روس کے ذمہ ہو گا۔ تربیت تمام روس کی طرف سے دی جائے گی۔ اس فوج میں روسی علاقے کے آدمی بھرتی نہیں ہوں گے، سوائے افسران کے جو تربیت دیں گے۔ اس شرط سے وزیر خارجہ سمجھ گیا کہ یہ بڑی عمدہ تجویز ہے اور ہمارے پروپیگنڈے میں بڑی سہولت ہو گی۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ تمام شمالی ہند کی فوج کمیونسٹ ہو گی۔ اس لیے ٹراسکی نے اس کو منظور کر کے ایک لاکھ فوج دینا منظور کیا۔ اس میں مسٹر جوہندر ناتھ رائے نے بڑی ہمت، استقلال اور ایمانداری سے کام کیا اور راجہ مہندر پرتاب کے دل میں اس سے بڑا ڈر پیدا ہو گیا۔ اور ہم نے اس کی اطلاع مہاتما گاندھی اور مسٹر جواہر لال نہرو کو دی۔ یہ لوگ بھی اس وقت آزادی کے خواہاں تھے انھوں نے بھی منظور کر لیا۔

آج کل پاکستان امریکہ سے جو فوجی امداد لے رہا ہے تو جواہر لال نہرو کے اخباری بیانوں میں آتا ہے کہ ایک دن سارا پاکستان امریکہ کا ہو جائے گا روس کی پرانی بات اس کو یاد آتی ہے۔

"وڈھ" ایک مقام لسبیلہ سے اوپر مکران کے سر پر ہے اور روسی علاقے کی

ایک طرف کی سرحد افغانستان سے ملتی ہے اور ان کے بندر چہبار اور گوادھر، پسنی وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ جب یہ خفیہ خبریں سلطنت برطانیہ کو ملیں تو وہ بہت گھبرائی۔ دوسری طرف احمد آباد کے کانگرسی جلسہ میں آزادی کا جھنڈا لہرانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ قبل اس کے کہ افغان وفد سے وائسرائے ہند شرائطِ صلح طلب کرے اس نے گاندھی جی اور مالوی جی کو طلب کیا۔ گاندھی اس وقت احمد آباد کے صلح کانگرس کے اجلاس کی تیاری میں مصروف تھے۔ وائسرائے ہند نے دونوں کو بلاکر مولانا سندھی کا خط جو محمود خاں طرزی نے وائسرائے کو دیا تھا دکھلایا۔ اس میں اشارے تھے کہ ہم نے روس سے مدد حاصل کی ہے۔ یہ خط گاندھی جی اور مالوی جی کو دکھلا کر کہا کہ تم برطانیہ کی غلامی سے نجات حاصل کر کے مسلمانوں کے غلام ہو گے۔ یہ آزادی کا جھنڈا بلند کرنا تمھارے لیے کوئی فائدہ بخش کام نہیں۔ اس خط کو دیکھ کر گاندھی جی بدل گئے اور آزادی کا جھنڈا نہ لہرایا۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمان جتنا بھی آزادی کا خیرخواہ ہو ہندو اس کو کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ افغانستان کے امیر محمود خاں طرزی شرائط پیش کرنے میں ڈھیل کر رہے تھے۔ اور مطلب یہ تھا کہ احمد آباد میں ادھر ہندوستانی آزادی کا جھنڈا لہرادیں گے ادھر ہم اپنا وفد واپس بلالیں گے۔ کانگرس کا وہ جلسہ جو احمد آباد میں ہونے والا تھا، اس میں صرف بارہ دن باقی تھے۔ اور ایک سال کے اندر صلح ہونے کا وقت ختم ہونے والا تھا۔ وائسرائے نے محمود خاں طرزی کو بلاکر کہا کہ اپنی جو بھی شرائط ہیں وہ فوراً پیش کردو۔ ورنہ واپس چلے جاؤ اور ہم اعلانِ جنگ کردیں گے۔ اس وقت گورنمنٹ ہند نے اپنی پوری تیاری احمد آباد اور افغانی سرحد کے لیے کی تھی۔ اور سرحد افغانستان میں فوج جمع ہونے لگی، تو افغانستان کی طرف سے شرائط پیش کردی گئیں۔ اس میں دو دفعات اہم تھیں۔ (۱) آزادیِ افغانستان تسلیم کریں۔ (۲) دس سال کے بعد ہندوستان کو سیلف گورنمنٹ دیں۔ برطانیہ نے یہ دونوں شرائط قبول کرلیں۔ اپنی طرف سے انگریزی شرائط پیش کیں کہ ہم آزادی افغانستان تسلیم کرتے ہیں۔ مگر افغانستان بیرونی سلطنت سے

جو معاہدہ کرے اس کی کاپی ہمیں ملنی چاہیے۔ ہم نے مصلحتہً امیر صاحب کو مشورہ دیا کہ اس شرط کو قبول کر لو کیونکہ جب تک روسی فوج آئے گی اس وقت تک اگر انگریزی فوج نے حملہ کر دیا تو کابل پر ان کا قبضہ ہو جائے گا۔

اس کام میں ہمارے ساتھ وہی ہندوستانی ہمارے رفیق تھے جنھوں نے روسی امداد کے لیے بڑا کام کیا تھا۔ اور اقوام عالم پر یہ ثابت کر دیا کہ ہندوستانی مسلم نوجوان بڑے جفاکش اور ایماندار ہیں۔ ہماری ہندوستانی قوم کو چاہیے کہ ان نوجوانوں اور میرے رفیقوں کی عزت کرتے رہیں۔

احمد آباد میں آزادی کا جھنڈا لہرانے کا دن مقرر ہوا تو کانگرسی جانتے تھے کہ جھنڈا لہرایا جائے گا۔ لیکن مدن موہن مالوی اور اس کے سرمایہ دار ساتھی گاندھی پر زور دے رہے تھے کہ آزادی کا جھنڈا نہ لہرایا جائے۔ اس سے مسلمانوں کا فائدہ ہے۔ اور یہ اس وقت ٹھیک تھا۔ اگر مولانا محمد علی اور شوکت علی جیل میں نہ ہوتے تو شاید یہ زور ڈال کر جھنڈا لہرا دیتے۔ لیکن وہ اس سے پہلے کراچی کیس میں قید ہو چکے تھے۔ جب افغانستان اور انگریزوں میں صلح ہو گئی تو مالوی کا پلہ بھاری ہو گیا۔ جھنڈا لہرانے کی رسم بند کر دی گئی۔ کانگرس کمیٹی احمد آباد کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر حکیم اجمل خاں تھے۔ انھوں نے اپنے خطبہ میں کہا۔ کاش افغانستان دو چار روز اور صلح نہ کرتا۔

جب تاشقند سے راجہ مہندر پرتاب واپس آیا تو مولانا سندھی سے عرض کیا کہ اگر میرے پاس تیس ہزار روپیہ ہوتا تو میں جا کر نیپال کو انگریزوں کے برخلاف کر دیتا۔ مولانا سندھی نے یہ خواہش راجہ مہندر پرتاب کی امیر امان اللہ خان کے روبرو پیش کر دی۔ اور کہا کہ اگر اس ہندو نوجوان کی آرزو پوری کر دی جائے تو ہندوستان کے ہندو لوگ خوش ہو جائیں گے۔ میں نے راجہ مہندر پرتاب کو سمجھایا کہ نیپال اور بھوٹان کے بہت سے نوجوان انگریزی فوج میں بھرتی ہیں شاید نیپال اور بھوٹان اس آزادی کی تحریک کو قبول نہ کریں۔ اس نے اصرار کیا کہ میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ جیسے آپ افغانستان میں کامیاب ہوئے ہیں۔ آخر میں نے امیر امان اللہ خاں کو کہا کہ اس کی

آرزو پوری کردی جائے۔ اس پر امان اللہ خاں نے تیس ہزار روپیہ راجہ مہندر پرتاب کو دے دیا۔ راجہ مہندر پرتاب تیاری کرکے روس کے راستے سے نیپال پہنچا۔ وہاں سے وزیر اعظم نیپال کو اطلاع دی کہ میں نیپال آنا چاہتا ہوں۔ اس (وزیر اعظم) نے لکھ بھیجا کہ تم انگریزوں کے برخلاف سازش کرنے والے ہو۔ اگر تم نے نیپال کی حد میں قدم رکھا تو تم کو گرفتار کرکے انگریزوں کے حوالے کردیا جائے گا۔ دو ماہ کے بعد راجہ صاحب واپس کابل آگئے اور کہا ہندو لوگ بے غیرت ہیں۔

التوائے جنگ ہوتے ہوئے میں نے امیر امان اللہ خاں سے کہا کہ افغانستان میں اعلان کردو کہ گاؤکشی افغانستان میں منع ہے۔ اس پر امیر امان اللہ خاں نے بذریعہ اعلانِ عام ملک میں احکام جاری کردیے کہ افغانستان میں گاؤکشی منع ہے۔ اس کے بعد گاندھی جی نے ایک تقریر میں کہا کہ مسلمانوں میں اگر امیر امان اللہ خاں جیسا قانونی بادشاہ ہو جائے تو ہماری گائیں بچ جائیں گی (اگرچہ افغانستان میں اس حکم ممانعتِ گاؤکشی کا کوئی اثر نہیں۔ یہ ایک پولیٹکل چال تھی)۔

جب کانگرس کمیٹی کا اجلاس امرت سر میں ہوا (یہ واقعہ جلیان والا باغ کے بعد ہوا)۔ تو اس میں مولانا محمد علی نے اپنی تقریر میں کہا کہ اگر انگریز ترکی خلافت کو ملیامیٹ کریں گے تو ہم چیلنج کرتے ہیں کہ ہم تمام مسلمان ہندوستان سے ہجرت کرجائیں گے۔ ہماری مسجدیں اور ہماری خانقاہیں ہندو بھائیوں کے ہاتھ میں چھوڑ دی جائیں گی۔ اس تقریر کے جواب میں گاندھی جی نے کہا کہ ہم آپ کو ہجرت کرنے نہیں دیں گے۔ اِدھر بیٹھ کر خلافت کا فیصلہ کرائیں گے۔

میں نے اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں سے کہا کہ اپنی حکومت کی طرف سے اعلان کردو کہ جو ہندوستانی مسلمان ہجرت کرکے آئیں گے ہم ان کو پوری طرح آباد کریں گے مکانات اور زمین دیں گے۔ امیر امان اللہ خاں نے اعلان کردیا۔ اس اعلان کا اثر یہ ہوا کہ اول سب سے سندھ کے مہاجرین اسپیشلیں اور پھر پنجاب کی اسپیشلیں پشاور کو جانے لگیں ان میں ہندو، مسلمان، سکھ سب ہی شامل تھے۔ پشاور سے کابل تک آدمی ہی آدمی نظر

آتا تھا۔ بڑے بڑے کاری گر اور تعلیم یافتہ لوگ بلکہ یوں کہو کہ ہندوستان اپنے جگر پاروں کو کابل کی طرف پھینک رہا تھا۔ یہاں تک ہوا کہ سات لاکھ آدمی ہندوستانی کابل میں جمع ہو گئے اور ابھی آمد و رفت جاری تھی۔ اس ہجرت پر تمام ملکوں کے اخباروں نے انگریزوں کو لعنتیں دیں اور یہاں تک کہ بعض یوروپین حکومتوں اور خاص کر جاپان نے احتجاج کیا کہ انگریزوں نے یہ کیا ظلم کر رکھا ہے کہ ساری آبادی ہندوستان کو چھوڑے جا رہی ہے۔ برطانیہ نے ناچار ہو کر امیر امان اللہ خاں سے کہا کہ ہم آپ کی آزادی اور باقی تمام شرائط قبول کرتے ہیں۔ براہِ مہربانی ان مہاجرین کو ہندوستان واپس کر دیں۔ اس وقت کابل کی کل آبادی ساٹھ ہزار تھی۔ مہاجرین سمیت سات لاکھ ہو گئی تھی۔ اور مہاجرین آ رہے تھے۔ جو روٹی کابل میں دو پیسے میں بکتی تھی اب ایک روپیہ سے زیادہ میں بکنے لگی۔ اور قحط سالی کے آثار نمودار ہو گئے۔ امان اللہ خاں نے اس پر تمام مہاجرین کو واپسی کا حکم دے دیا۔

امان اللہ خاں نے فوج کو حکم دیا کہ ان کو واپس باہر نکالو۔ رات کو ان ہندوستانی مہاجرین کو نکالا اور ڈھکیلا۔ صبح کو جب مجھے پتہ چلا تو میں سیدھا امیر امان اللہ کے پاس گیا اور کہا کہ ان کو اس طرح مت نکالو ـــ واپس بلاؤ۔ اس تجویز سے ہندوستان کے مسلمان آپ سے ناراض ہو جائیں گے۔

اس کے بعد سب مہاجرین کو واپس بلا کر کہا کہ ہمارے پاس کابل میں جگہ نہیں ہم اپنے علاقہ ترکستان میں آپ صاحبان کو آباد کرنا چاہتے ہیں۔ اس پر مہاجرین خود بخود واپس ہونا شروع ہو گئے۔ صرف پچاس گھر سندھی اس طرف جانے کو تیار ہوئے۔ باقی لوگوں نے انکار کر دیا، تو کہا کہ بابا واپس چلے جاؤ اس کے علاوہ ہم اور کچھ نہیں کر سکتے۔

پشاور سے لے کر ڈھاکہ تک آمد و رفت کے دوران مہاجرین کی خدمت ڈاکٹر خان اور عبد الغفار خاں کی فدائی جماعت نے کی۔ اور تمام خورد و نوش تیار ملتا تھا۔ اور رات کے آرام کا سامان بھی مہیا تھا۔ اس میں ڈاکٹر خان اور عبد الغفار خان سرحدی گاندھی کا ہاتھ تھا۔ وہ ہر پڑاؤ کی خود حفاظت کرتے تھے۔

وہ پچاس سندھی خاندان جو ترکستان گئے تھے بہت حیران وپریشان ہوئے۔ تھوڑے جو بچے وہ واپس سندھ میں آگئے۔ (یہ التوائے جنگ کا زمانہ ہے اور افغانی وفد دہلی میں ہے۔)

جب افغانستان وفد صلح دہلی میں تھا اس وقت لوزان کانفرنس ۱۹۲۴ء منعقد تھی۔ اس میں یہ تجویزیں ہو رہی تھیں کہ ترکی کو حکم برداری میں لایا جائے۔ اس پر تمام یوروپین چھوٹی بڑی سلطنتیں متحد ہوگئیں۔ دراصل یہ تجویز برطانیہ کی تھی۔ خیر رات کو امیر امان اللہ خان نے مجھ کو بلایا۔ میں گیا تو وہاں دیکھا کہ بہت مغموم بیٹھے ہیں۔ مجھ سے کہا کہ روسی ذریعہ سے خبر پہنچی ہے کہ لوزان کانفرنس میں یہ تجویز پیش ہے کہ ترکوں کی آزادی سلب کرلی جائے اب کیا تجویز کرنی چاہیے۔ میں نے کہا کہ تین خط لکھو۔ ایک جاپان کے بادشاہ، ایک اٹلی کے پریسیڈنٹ اور تیسرا فرانس کے پریسیڈنٹ کے نام، کہ اگر آپ لوگوں نے ترکی سلطنت کو جس کا پریسیڈنٹ مصطفےٰ کمال پاشا ہے، حکم برداری میں لاکر اس کی آزادی سلب کی اور اس سے کوئی بڑی جنگ ہوگئی تو تم اس کے ذمہ دار ہو۔ ان تینوں خطوط کو امیر امان اللہ خاں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا۔ اور لفافہ پر بھی اپنا نام لکھا۔ اس وقت ہندوستان اور افغانستان کی ڈاک بند تھی۔ صرف انگریزی کونسل افغانستان کی ڈاک آتی تھی۔ یہ تینوں خط کونسل کو دیے گئے تھے کہ ان تینوں خطوط کو روانہ کردو۔ کونسل انگریزی کی ڈاک سیدھی وائسرائے ہند کو جاتی تھی۔ جب وائسرائے نے یہ تینوں خطوط سنسر (Censor) کیے تو ایک دم وزیر اعظم وزیر اعظم انگلستان کو خبر دی اور خطوط کی نقلیں بھی روانہ کیں (مسٹر لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان کو بذریعہ ہوائی جہاز روانہ کیں)۔ جس سے وہ بہت ڈر گئے اور اس وقت روس نے افغانستان کو ایک لاکھ فوج منظور کی تھی۔ یہ خبر بھی اگرچہ خفیہ تھی مگر انگریزوں کو مل چکی تھی۔ وہ بذریعہ ہوائی جہاز فوراً لوزان پہنچا۔ اس نے کہا کہ ترکی کو فوراً آزاد کرو۔ اور وزیر ترکی سے کہا کہ کسی یوروپین سلطنت کا قانون لے لو، ہم ترکی کو آزاد کردیں گے۔ ترک سوئٹزرلینڈ کا قانون لے کر آزاد ہوگئے۔

لطیفہ :- جب اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے حسبِ تجویز مولانا سندھی خطوط روانہ کیے تھے اُس وقت عبد اللہ یوسف علی مترجم قرآن شریف انگریزی انگلینڈ میں وزیر اعظم برطانیہ کے سکریٹری تھے۔ جب وہ حج پر آئے تو مکہ مکرمہ میں وائس کونسل جدہ و مکہ کے مکان پر اُترے۔ وہ مکان جس میں مولانا سندھی رہتے تھے بالکل قریب تھا۔ تو یوسف علی خاں نے وائس کونسل خان بہادر کو کہا کہ ہم نے قرآن شریف کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔ کچھ شکوک ہیں میں مولانا سندھی سے ان کے متعلق اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ وائس کونسل احسان اللہ خان بہادر نے کہا کہ مولوی صاحب تو سادے آدمی ہیں، میں آپ کے پاس ان کو بلاتا ہوں۔ مولانا سندھی اس مکان میں گئے اور علیٰحدہ کوٹھری میں بیٹھے تو اس نے دو چار آیتوں کا مطلب پوچھا۔ مولانا سندھی نے فرمایا "یار اِن بحثوں کو چھوڑو۔ ہاں، تو بتاؤ کہ وزیر اعظم انگلینڈ کیوں ہوائی جہاز پر چڑھ کر لوزان پہنچا؟" وہ کہنے لگے کہ جناب یہ کارروائی کیا آپ کی تھی۔ پھر کچھ دیر تک دوستانہ باتیں ہونے کے بعد مولانا واپس چلے گئے۔ جب کونسل نے دریافت کیا تو کہا کہ مولانا صاحب بہت بڑا عالم ہے۔

الحاصل ترکوں کی آزادی بھی مسلمانانِ ہند کی جد و جہد سے ہوئی۔

جب میں قسطنطنیہ اور انقرہ (انگورہ) پہنچا اور اتاترک کمال پاشا سے ملاقات کی تو اس جلسہ میں صرف عصمت انونو تھا۔ مصطفےٰ کا پہلا لفظ جو تھا وہ یہ تھا کہ "ہم آپ کے ممنون ہیں" اور دوسری بات یہ تھی کہ مسلمانانِ ہندوستان پورے پورے مسلمان ہیں۔ جب میں ملاقات سے فارغ ہو کر باہر آیا تو مصطفےٰ اتاترک نے عصمت انونو سے کہا کہ مسلمانانِ ہند کتنے باہمت ایماندار مسلمان ہیں مگر اقلیت میں ہیں۔ عصمت پاشا سے میری گفتگو ہو چکی تھی اور مفصل باتیں سن چکا تھا۔ عصمت پاشا نے مصطفےٰ کمال پاشا سے کہا کہ مسلمانوں کا یہ لیڈر (مولانا سندھی) تو کہتا ہے کہ ہم اکثریت میں ہیں اور اقلیت میں نہیں۔ اور کہتا ہے کہ صوبائی مسلمانانِ ہند طاقت ور ہیں۔ ہندوستان کی قسمت مسلمانوں سے وابستہ ہے۔ یہ عصر کا وقت تھا۔ اتاترک نے چونک کر حکم دیا کہ

نقشے لاؤ۔ پھر نقشے پیش ہوئے۔ ساری رات صبح آٹھ بجے تک چائے پی کر نقشہ دیکھتا رہا آٹھ بجے دن حکم دیا کہ نقشے اٹھا لے جاؤ۔ اور خود سو گیا۔ پورے دن سو کر دوسرے دن اُٹھا۔ پھر صبح جب عصمت پاشا نے سلام کہا تو اتاترک نے کہا کہ بیشک مسلمان اکثریت میں ہیں اور جائے وقوعہ یہ بتلاتی ہے کہ مسلمانوں سے ہندوستان کی قسمت وابستہ ہے۔ ہندو اور یوروپین پروپیگنڈے نے ہم کو غلطی میں ڈالا تھا۔ اب ہم سمجھ گئے کہ تقدیر کا فیصلہ یہی ہے کہ مسلمانانِ ہند آزاد ہوں۔ جب عصمت پاشا قسطنطنیہ میں مجھ سے ملے تو یہ ساری باتیں مجھ سے ہوئیں۔

لطیفہ :۔ ابراہیم عبداللہ ترک جس نے سارے روئے زمین کی سیاحت کی ہے اور اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا کا بڑا رازداں اور ہم نشین تھا۔ ایک بڑی مجلس میں تھا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ تم ترکوں نے علمائے اسلام کو بے کار کر دیا۔ اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا نے سب علماء کو جمع کر کے پوچھا کہ بتاؤ سورۃ والتین کا کیا مطلب ہے اور ہم کو کیا پیغام دیتا ہے؟ تو سب علماء خاموش ہو گئے۔ میں نے کہا میں تقریر کرنا چاہتا ہوں اور تم لکھو۔ پھر میں نے تقریر شروع کر دی اور انھوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ ابراہیم ترک نے مولانا صاحب کی بیان کردہ تفسیر مصطفےٰ کمال پاشا کو جا دکھلائی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ہندوستان کے مولوی قرآن جانتے ہیں ہمارے ملک کے مولوی نہیں جانتے۔

اب جب افغانستان کے جشنِ آزادی کی تیاری ہوئی تو اس جشنِ آزادی میں انگریزی نمائندہ بھی شامل ہوا۔ اُس نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ آزادی افغانستان کی نہیں بلکہ مولوی عبیداللہ سندھی کی فتح ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں ہندوستان کی فتح ہے۔ جب مولانا محمود الحسن شیخ الهند فوت ہوئے تو افغانستان میں ایک جلسہ تعزیت منعقد ہوا۔ اس میں امان اللہ خاں نے خود تقریر کی اس میں یہ فقرہ تھا "کارے کہ مولانا محمود الحسن شیخ الهند شروع کردہ بود من ادرا اتمام می کنم"۔

لوزان کانفرنس میں اتحادی ظاہر میں تو متفق تھے۔ مگر اندرونی طور سے جب جاپان ناراض تھا۔ اس کو غنیمت میں حصہ پورا نہیں ملا۔ فارموسا فتح کر کے خاموش ہو گیا تھا۔

اٹلی بھی ناراض تھا کہ الجیریا اور مراکش کے کچھ حصے اس کو نہیں ملے تھے۔ فرانس بھی ناراض تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ جس طرح دمشق پر اس کا قبضہ ہوا تھا اسی طرح فلسطین بھی اس کو ملتا۔ لیکن انگریزوں نے فلسطین اس کو نہیں دیا بلکہ اسرائیل کو دے دیا۔ اور ترکی کے بارے میں ان تینوں کی رائے تھی کہ اگر قسطنطنیہ پر حکم برداری ہو گئی تو اس کے نگراں انگریز ہوں گے اور ان حکومتوں کا توازن قائم نہیں رہے گا۔ یہ اندرونی خیالات تھے۔ مگر ظاہر سب کے سب متفق تھے۔ مگر جب برطانیہ کو ان چٹھیوں سے خوف پیدا ہوا کہ اگر ہندوستان کی سرحد پر جنگ شروع ہو گئی تو کوئی ہماری امداد نہیں کرے گا۔ اکیلے ہمیں لڑنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے ہندوستان ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے اس خوف سے انھوں نے ترکستان کو آزاد کر دیا۔ اور ترکوں سے وعدہ تھا کہ خلافت کو ترک کر دو۔ فوجی سلطنت بناؤ۔

خلافت کے الفاظ کی خبر جب ہندوستان میں پہنچی تو خلافت تحریک ختم ہو گئی۔ یہی انگریزوں کا مقصد تھا۔ جب ہندوستان میں خلافت کا زور شور کم ہو گیا تو مسلمان کانگرس سے نکلنا شروع ہو گئے۔

جب مولانا محمود الحسن مالٹا سے آزاد ہو کر ہندوستان میں آئے تو دہلی میں جمعیت العلماء قائم کی۔ جس کا پریسیڈنٹ مولانا محمد علی جوہر کو بنایا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ جن لوگوں کو ہم مدرسوں اور خانقاہوں میں تلاش کرتے تھے وہ ہم کو اسکولوں اور کالجوں سے ملے۔

جب جمعیت العلماء کے پریسیڈنٹ مولانا محمد علی ہوئے تو کالج پارٹی اور مولوی پارٹی متحد ہو گئی۔ یہ بات انگریزوں کو ناگوار گزری۔ جب مولانا محمود الحسن شیخ الہند فوت ہوئے جو مدرسہ دیوبند کے مہتمم تھے اور یہ جگہ خالی ہوئی، تو مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کو دیوبند کا سرپرست بنایا گیا۔ مولانا اشرف علی کالج پارٹی کو نیچری اور بے دین کہتے تھے۔ اور ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے بھی سخت مخالف تھے۔ مولانا شیخ الہند کی وفات کے ایک سال بعد دہلی میں جمعیت العلماء کا اجلاس ہوا اس میں

مولانا اشرف علی تھانوی کی کوشش سے یہ رائے پاس ہوئی کہ جمعیت العلماء کا پریسیڈنٹ مولوی ہونا چاہیے تو مولانا محمد علی کو موقوف کر کے مولانا حسین احمد مدنی کو جمعیت العلماء کا پریسیڈنٹ بنایا گیا۔ اس طرح تعلیم یافتہ جماعت مولوی پارٹی سے الگ ہو گئی۔ اس میں انگریزوں کا ہاتھ تھا۔

اب مولانا محمد علی جمعیت سے نکلے تو مسلم لیگ کو زندہ کیا اور عام مسلمان تعلیم یافتہ جس کو ہم کالج پارٹی کہتے ہیں کانگرس سے جدا ہو کر مسلم لیگ میں شامل ہو گئی اور جمعیت کھو کھلی رہ گئی۔ اور بے اعتماد ہو گئی۔ مسلم لیگ تو جدوجہد کرتی رہی اور جمعیت العلماء کانگرس سے وابستہ رہی۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق منوانے کے لیے کانگرس سے لڑتی رہی۔ اس زمانے میں محمد علی جناح کانگرس میں تھے جب مولانا محمد علی جوہر فوت ہوئے اور مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ کی جگہ خالی ہوئی تو محمد علی جناح موقع پا کر اس کے پریسیڈنٹ ہو گئے۔ مسلم لیگ نے اپنی جدوجہد سے پاکستان بنایا۔ اور جمعیت العلماء ایسے ہی کانگرس کا دم چھلا بنی رہی اور بے کار ہو گئی۔ جب مولانا سندھی مکہ مکرمہ میں آئے تو مولانا حسین احمد مدنی بھی حج پر آئے تو ان کو بہت ڈانٹا اور کہا کہ آپ کو کیا حق حاصل تھا کہ جو کام مولانا شیخ الہند محمود الحسن صاحب نے کیا تھا اور مولانا محمد علی جوہر کو پریسیڈنٹ بنایا تھا اُن کو علیحدہ کیا اور آپ خود پریسیڈنٹ بن گئے۔ آپ مولوی لوگ سیاست سے بے بہرہ ہیں۔ جب مولانا سندھی نے بہت ڈانٹا تو مولانا حسین احمد مدنی رونے لگے۔

جب ترکی کو شکست ہوئی تو جو اراکین جرمنی اتحادیوں کے ساتھ جنگ کے حامی تھے وہاں سے بھاگ نکلے۔ مصطفےٰ کمال پاشا جنگ حربی ۱۹۱۴ء میں شرکت کے خلاف تھے۔ مگر کام برابر کرتے رہے۔ انھوں نے درۂ دانیال میں انگریزوں کو شکست دی تھی۔ جرمنوں نے ترکوں کو کہہ دیا تھا کہ قسطنطنیہ کو چھوڑ کر دوسرا مرکز تلاش کر لو۔ کیونکہ انگریز قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے والے ہیں۔ جو افسر جنگ میں شریک تھے اور جن کی مرضی سے جنگ شروع ہوئی تھی سب بھاگ گئے۔ بہت مر گئے اور بہت یہاں

ہوا کہ دو افسر روس پہنچ گئے۔ ایک صدر ترکی انور پاشا دوسرا فیلڈ مارشل جمال پاشا جو شام کا کمانڈر اِن چیف تھا، روس پہنچ گئے۔ التوائے جنگ کے دوران جمال پاشا کابل پہنچے تو مولانا سندھی کی کوشش سے امیر امان اللہ خاں نے اس کو سرحدات افغانستان کی دیکھ بھال کا افسر مقرر کیا اس کو امیر کابل دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ دیتے تھے، لیکن عزت ادب وقار بہت تھا۔ مولانا سندھی اس کی مالی امداد فرماتے رہتے تھے (اس کا ذکر پہلے آچکا ہے)۔

انور پاشا روسیوں کے پاس رہے۔ روسیوں نے ان کی بڑی عزت کی۔ انھوں نے ان کو کمیونزم پیش کیا۔ اور کہا کہ اگر آپ اس کمیونزم کو قبول کرلیں تو ہم آپ کو بڑی عزت دیں گے۔ انور پاشا نے وعدہ کیا کہ ہم اس کی خوب اشاعت کریں گے۔ جب روسیوں کو یقین ہوگیا تو انور پاشا کو سمرقند کے علاقہ کا حاکم بنادیا گیا۔ اور وہ اب سمرقند میں کام کر رہے ہیں۔

جب آزادی افغانستان تسلیم ہوگئی اور جنگ ختم ہوئی تو امیر امان اللہ خاں نے انگریزوں سے کہا کہ انگریزی گورنمنٹ نے امیر حبیب اللہ خاں سے وعدہ کیا تھا کہ اس جنگ میں تم غیر جانبدار رہو تو ہم تین کروڑ پاؤنڈ افغانستان کو دیں گے۔ انگریزوں نے کہا کہ تم نے ہم سے جنگ کی اور ہم نے تمھاری آزادی تسلیم کرلی۔ ہم کچھ نہ دیں گے۔ اس پر امیر امان اللہ خاں نے کہا کہ جب تک جنگ عظیم شروع رہی افغانستان غیر جانبدار رہا۔ اس طرح یہ جھگڑا چلتا رہا۔ ایک سال یہ جھگڑا رہا۔ آخر انگریزوں نے ایک شرط پر یہ تاوان دینا قبول کرلیا کہ مولانا سندھی کو سیاسی تحریک سے علیحدہ کردو اور اپنے ملک سے نکال دو اور اگر ہمارے اعتراض دوسری حکومتوں سے ہوں ان میں ہماری مدد کرتے رہو۔

اس معاہدے میں یہ ایک خفیہ دفعہ تھی۔ اس کی پہلی دفعہ یوں ظہور میں آئی کہ مولانا سندھی صاحب کو بلا کر امان اللہ خاں نے کہا کہ کوئی تحریک

انگریزوں کے خلاف آپ شروع نہ فرمائیں۔ اور دوسرے یہ کہا کہ آپ نے جو کابل میں کانگرس کمیٹی بنائی ہے جس کا الحاق انڈین کانگرس کے ساتھ ہے اور الحاق کانفرنس میں منظور ہو گیا ہے یہ کام نہ کریں۔ کانگرس کمیٹی کابل کے صدر مولانا سندھی خود تھے۔ مولانا ایک شرط پر راضی ہو گئے کہ ہم کو کابل میں یونیورسٹی بنانے دو۔ اس میں دینیات اور انگریزی تعلیم ہو گی۔ اس میں ہندوستانی طالب بلا امتیاز شامل و داخل ہوں گے۔ اس شرط کے پہلے حصے پر تو امیر امان اللہ خاں راضی ہو گئے۔ مگر ہندوستانی طلبار کے داخلے پر راضی نہ ہوئے۔ علیا حضرت والدہ امیر امان اللہ خاں نے اپنا باغ دینے کی پیش کش کی۔ میرا خیال تھا کہ یونیورسٹی قائم ہونے سے میرے ساتھ جو ہندوستانی طالب علم تھے وہ کام پر لگ جائیں گے۔ میں خوش ہو گیا۔ مگر پھر وہ تعطل کرنے لگے۔ یعنی ایسی شرائط پیش کرنے لگے کہ میرے ہندوستانی ساتھی بے کار ہو جائیں گے جو میری بہت عزت کرتے تھے اور امیر کی دلی خواہش تھی کہ میں ان کے پاس رہوں۔ مگر شاہی مہمانداری اور اعزاز سے میرے رفقار کی ساری عمر برباد ہوتی تھی۔ اس لیے میں نے انکار کر دیا۔ مجھ کو بے کار کرنے کی اس وقت تک خبر نہ تھی جب امان اللہ خاں انگریزوں سے غیر جانبداری کی رقم کے سلسلے میں گفتگو کر رہے تھے۔ آخر وہ رقم مل گئی۔ میں اپنی پہلی حالت پر خوش و خرم تھا اور سنا تھا کہ انور پاشا کو سمرقند کا خود مختار حاکم بنا دیا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ قرآنِ حکیم کا پروگرام سرمایہ شکنی ہے۔ اور انور پاشا بھی پکا مسلمان ہے۔ ضرور دین کو قائم رکھے گا۔ سرمایہ شکنی میں مشغول ہو جائے گا۔ اس سے اگر وہ اپنے تجربہ میں کامیاب ہو گیا تو روسی کمیونسٹ قرآنی پروگرام قبول کرنے کی طرف راغب ہو جائیں گے۔ مگر اس اثنا میں جمال پاشا میرے پاس آئے اور کہا کہ آج میرے پاس خبر آئی ہے کہ انور پاشا نے روسیوں سے بغاوت شروع کر دی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کی کون مدد کرے گا؟ تو جمال پاشا نے کہا کہ اور تو خبر نہیں۔ مگر امان اللہ کے واسطے سے انگریزوں نے تین چار کروڑ پونڈ دینے کا وعدہ کر لیا ہے۔ اور تین ہزار پونڈ بھیج دیے ہیں۔ مجھ کو سخت غصہ آیا کہ انگریز اس سے زیادہ رقم بھیج ہی نہیں سکتے۔ اور انور پاشا شکست کھائے گا۔ اور امیر

امان اللہ کی پالیسی پر مجھے غصہ آیا اور نفرت ہوئی۔ پھر مجھ کو معلوم ہوا کہ انگریزوں نے امیر صاحب کے ذریعہ کہا ہے کہ ہماری فوج چین کے راستے پہنچے گی۔ ہم انور پاشا کو فوجی امداد دیں گے۔ لیکن نہ انگریزوں نے فوجی امداد دی اور نہ روپیہ بھیجا۔ اور انور پاشا یوں ہی لڑتا ہوا مارا گیا۔ جس سے روس مسلمانوں سے بدظن ہو گیا اور آخری کوشش کہ روسی قرآن کے پروگرام کو قبول کریں گے ناکام ہو گئی۔

مولانا خوش تھے کہ ترکی حکومت کا مرکز سمرقند ہے وہ انور پاشا کے نہیں بلکہ مسلمانوں کے ہاتھ آ گیا ہے۔ مگر غلط پالیسی کی وجہ سے بنا بنایا کام بگڑ گیا۔

لطیفہ :۔ جب میں ماسکو گیا تو وزیر خارجہ روس میرے پاس آیا اور کہا کہ ہم نے انگریزوں سے اور انگریزوں نے ہم سے معاہدہ کر رکھا ہے کہ اگر انگریزوں کے کسی ملک میں ہم روسی اپنے خرچ پر پروپیگنڈا کریں تو اپنے کل خرچ کا تخمینہ انگریزوں کو بتا دیں گے۔ اس وقت برطانوی وزیر خارجہ لارڈ کرزن تھا۔ اس وزیر خارجہ برطانیہ نے وزیر خارجہ روس سے معلوم کیا ــــ کہ آپ نے ہمارے ملک میں پروپیگنڈے پر کتنا روپیہ خرچ کیا ہے۔ روس کے وزیر خارجہ نے مولانا سندھی سے دریافت کیا کہ میں اس کا انگریزوں کو کیا جواب دوں۔ مجھ کو اصل جواب بن نہیں پڑتا۔ مولانا سندھی نے روسی وزیر خارجہ کو تجویز بتائی کہ آپ وزیر خارجہ برطانیہ سے پوچھیں کہ برطانیہ نے روسی ممالک میں برطانوی پروپیگنڈے پر کتنا خرچ کیا ہے۔ اس کے بعد میں بھی جواب دوں گا۔ روسی وزیر خارجہ نے متحیر ہو کر مولانا سے کہا کہ میں یہ لکھ دوں۔ اگر برطانیہ نے جواب دیا تو اس کا جواب آپ دیں گے۔ مولانا نے اس کو یقین دلایا کہ میں روسی ہی ہوں، اس کا جواب دوں گا۔ لیکن .... چونکہ افغانستان کی عزت میرے دل میں تھی اس لیے راز انور پاشا والا ظاہر نہیں کیا۔

اس وزیر خارجہ نے جب یہ جواب برطانوی وزیرِ خارجہ کو لکھ دیا تو برطانوی وزیر خارجہ مسٹر لارڈ کرزن نے کوئی جواب نہیں دیا۔ روسی وزیر خارجہ مولانا سندھی کے پاس خوش خوش پہنچا اور کہا کہ برطانوی وزیر خارجہ کوئی جواب نہیں دیتا ضرور کوئی بات ہے۔

لطیفہ :- جب میں ماسکو پہنچا اور میرے خیالات انھوں نے معلوم کیے تو مجھ پر ان کا بڑا اعتماد ہوگیا۔ کہنے لگے کہ ہم تم کو سمرقند کا علاقہ دیتے ہیں۔ جیساکہ آپ کا خیال ہے کہ اسلام سرمایہ شکنی سکھلاتا ہے۔ اور ہم بھی جانتے ہیں کہ قرآن حکیم کا پروگرام سرمایہ شکن ہے۔ آپ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی سرمایہ شکن تھے۔ اور خلیفہ اول ابوبکر (رضی اللہ عنہ) بھی سوشلسٹ تھے۔ اگر آپ نے یہ پروگرام کامیاب کر دکھایا تو ہم مسلمان ہوجائیں گے۔ یہ الفاظ وزیر خارجہ اور وزیر اعظم روس کے تھے۔ میں نے کہا کہ ایک شرط پر قبول کرتا ہوں، کہ آپ کا پریسیڈنٹ مجھ پر مسلط نہ ہو۔ انھوں نے کہا ایک بار ہم غلطی کر چکے ہیں کہ انور پاشا پر بھروسہ کیا۔ دوسری بار وہی غلطی کیسے ہوسکتی ہے۔ پریسیڈنٹ ہمارا ضروری ہوگا۔ میں نے جواب میں کہا "سواری کہ زمامش در دست دیگرے باشد سواری را نہ شاید"۔ یہ نادر شاہ کا مقولہ میں نے پیش کیا۔

میرا دل انور پاشاہ اور امان اللہ خاں کی رفاقت سے بیزار ہوگیا۔ مؤخر الذکر پھر ہم پر شرطیں عائد کرنے لگے کہ ہندوستانی پروفیسر افغان یونیورسٹی میں نہ ہوں گے۔ حاصل کلام انگریزوں سے رقم کی لالچ میں امیر امان اللہ خاں پھر غلامی کرنے لگے۔ اور نازیبا حرکتیں کرنے لگے جو ایک خود مختار بادشاہ کے شایانِ شان نہیں ہوتیں۔ ایسی حرکتوں کو دیکھ کر سردار نادر خاں جو اس وقت وزیر مال تھے وہ بھی برگشتہ خاطر ہوگئے میرا نادر خاں کے ساتھ محبت اور خلوص تھا۔ آخر سردار نادر خاں کی دل جوئی، یا اُن کو اپنے ملک سے نکالنے کے لیے، اٹلی کا سفیر بنا کر افغانستان کی طرف سے بھیج دیا گیا۔

جب سردار نادر خاں اٹلی کے سفیر ہوئے تو میں (مولانا) روس میں تھا۔ یہ راز ہیں جو ڈائری میں مندرج نہیں۔

حضرت مولانا شیخ الہند کی وفات پر حسب شانِ بے نظیر سے مجلس فاتحہ خوانی امیر امان اللہ خاں نے منعقد کی وہ ایک یادگار ہے۔ اس میں جو تقریر ہوئی اس کا ایک فقرہ نقل کرتا ہوں "مولانا محمود الحسن شیخ الہند یک کار را شروع کردند من اورا اتمام می کنم"۔

فاتحہ خوانی کا جلسہ آزادیٔ افغانستان کے تسلیم کیے جانے سے پہلے منعقد ہوا تھا۔

اس التوائے جنگ کے ایک دو ہفتہ بعد راجہ مہندر پرتاب اٹلی سے روس آئے۔ اور روس سے افغانستان پہنچے۔ جب اعلیٰ حضرت سے خاص ملاقات کر چکے تو اعلیٰ حضرت کو آئیڈیل کنگ (Ideal King) لکھا کرتے تھے ہم نے آخر میں اعلیٰ حضرت سے ہندوستانی تعلیم گاہ کھولنے کی اجازت مانگی تھی لیکن برٹش وزیر خارجہ نے افغان وزیرِ خارجہ کو اپنا ہم خیال بنا لیا۔ کہ ہمیں ہندوستانی یونیورسٹی کے لیے موقع نہ دیا جائے۔ لیکن اسے اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

وزیر خارجہ افغان نے امیر امان اللہ خاں کو لکھ دیا کہ یہ بات انگریزوں کی شرائط کے خلاف ہے۔ نصر اللہ خاں نے اپنی والدہ علیا حضرت سے یہ بات کہی تو علیا حضرت نے اپنا خاص باغ یونیورسٹی کو دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ اور وزیر خارجہ افغان کو وزارتِ خارجہ سے موقوف کرا دیا۔ مگر اس کا اثر امان اللہ خاں کے دماغ پر بہت برا پڑا۔ وہ یونیورسٹی کھولنے میں بہت زیادہ تعطل کرنے لگا۔ ایسی ایسی شرائط لگانے لگا کہ جس سے میرے سارے رفقاء بے کار ہو جائیں۔ میری ساری کامیابی کا راز میرے رفقا ہی ہیں۔ ان کو کیسے بے کار کر سکتا تھا۔

اگر ہمارے نوجوان رفقاء کا مستقبل ہمارے سامنے نہ ہوتا اور حکومت موقتہ کی بعض کارروائیوں میں ہمیں شکست نہ ہوتی تو ہم اعلیٰ حضرت کی سلطنت سے باہر جانے پر راضی نہ ہوتے۔ اس وقت سے کابل میں ہم نے شیخ محمد ابراہیم کی جگہ پر مرزا محمد علی عرف احمد حسن کو شریکِ عمل بنایا۔ اس وقت احمد حسن کا مددگار ظفر حسن تجویز کر لیا تھا۔ جب احمد حسن یا محمد علی اشترا کی جماعت میں شامل ہو گیا تو ہمارا معتمد اس زمانہ میں ظفر حسن رہا یہ افغانی انگریزی محاربہ میں ظفر حسن سردار سپہ سالار کے ساتھ تھل کے محاذ پر تھا وہاں اس کے کارنامے بہت زیادہ تحسین کے قابل سمجھے گئے۔ اور سلطنت افغانیہ کی خدمت کرنے پر

مقررہ تنخواہ ملتی رہی جس سے ہمارے کئی ہندوستانی بھائی گزارہ کرتے رہے۔ ظفرحسن کے مددگار اللہ نواز خاں مقرر ہوئے جو گورنمنٹ کالج لاہور میں ظفرحسن کے ہم جماعت تھے۔

احمد حسن، ظفر حسن اور اللہ نواز خاں وہی طالب علم ہیں جو جہاد کے ارادے سے لاہور سے کالج چھوڑ کر کابل میں داخل ہوئے تھے۔ یہ پندرہ آدمی تھے۔ پہلے کابل میں گرفتار کر لیے گئے۔ لیکن جب مولانا صاحب سندھی کابل پہنچے تو ان کو آزاد کرایا اور اُن سے مؤقتہ ہند کا کام لیا۔ اور ان طالب علموں میں نومسلم شیخ عبدالحق بھی تھا جس پر مولانا سندھی نے اعتماد کیا تھا۔ اور ریشمی خطوط اس کے ذریعے روانہ کیے تھے۔ مگر یہ شیخ عبدالحق خان بہادر حق نواز خاں کا پروردہ تھا اور یہی خان بہادر حق نواز اللہ نواز خاں کا والد تھا۔ خان بہادر حق نواز خاں نے ریشمی خطوط کے ساتھ عبدالحق کو گرفتار کرا دیا۔ اور وعدہ معافِ سلطانی گواہ بنا کر اس سے بیان لیا۔ (مگر اللہ نواز خاں ایک طالب علم امیر نادر خاں کی حکومت میں معتمد علیہ ہے۔ جس وقت بچہ سقہ کابل پر قابض ہوا تھا اور نادر خاں نے کابل پر حملہ کیا تو اللہ نواز طالب علم نے نادر خاں کی بڑی امداد کی)۔

کابل سے رخصت ہونے پر ہم نے اپنے تمام دستاویزات اللہ نواز خاں کی تحویل میں دے دیے تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ بچہ سقہ کے فتنے میں وہ تمام کاغذات ضایع ہو گئے۔ مگر ہمیں بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام کاغذات برطانوی حکومت کے ہاتھ آ گئے۔ اللہ نواز خاں نے بچہ سقہ کے مقابلہ میں خوب کام کیا۔ اس لیے افغانستان کے موجودہ حکمران نادر خاں نے اس کو ایک معزز کارکن کی حیثیت عطا کی ہوئی ہے۔

برطانیہ کے ان اخبارات کو جو سلطنت سے تعلق رکھتے ہیں مجھے ماسکو میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں بعض اشارات ایسے تھے کہ ان کی وجہ سے مجھے گمانِ غالب ہے کہ وہ تمام دستاویزات برٹش حکومت کو مل گئے۔

ہمارے بعض عزیز ہم سے ملے اور بعد میں ہمارے بعض فرزند بھی ہم سے ملے مولوی احمد علی لاہوری کو جو میرا عزیز ہے ہم نے ہندوستان واپس بھیجنا ہی مناسب خیال کیا۔ ہم نے اس کو بمنت واپسی پر راضی کیا۔

مولانا احمد علی صاحب مولانا سندھی کے بھتیجے ہیں۔ مولانا احمد علی صاحب کے والد کا نام حبیب اللہ تھا۔ یہ حبیب اللہ نومسلم مولانا سندھی کے عزیزوں میں سے تھا۔ مولانا سے جب شیخ حبیب اللہ ملے تو انھوں نے کہا کہ احمد علی خاں پیٹ میں تھا کہ میں نے اور میری گھر والی نے اللہ تعالیٰ کے دربار میں قسم اٹھائی کہ اگر لڑکا پیدا ہوا تو اس کو اللہ واسطے کے کاموں میں لگا دیں گے۔ اس وقت یہ چوتھی اردو میں پڑھتا تھا۔ امیر مولوی صاحب اس کو امروٹ میں، جو شکارپور کے قریب ہے، لے آئے۔ یہ وہاں پڑھتا رہا۔ اس کے بعد مدرسہ دار الارشاد میں جو پیر جھنڈا والا میں قائم ہوا تھا، اس نے تحصیل علم کیا۔ پھر مولانا سندھی نے اپنی بیٹی سے اس کا نکاح کیا۔ جب مولوی احمد علی کا باپ حبیب اللہ فوت ہو گیا تو مولوی احمد علی کی والدہ سے مولانا سندھی نے نکاح کر لیا۔ اور ان کے سب بچوں کو ادھر پیر جی گوٹھ میں لے آئے۔ مولانا احمد علی کے تین بھائی اور تھے۔ پہلا محمد علی دوسرا عزیز احمد اور تیسرا رشید احمد۔ وہ لاہور میں رہے۔ اور محمد علی کابل میں مولانا کے ساتھ تھے۔ جب مولانا کابل سے ماسکو جانے لگے تو یہ محمد علی یاغستان میں آ گیا۔ اب تک وہیں مقیم ہے۔ جب افغانستان اور انگریزوں کی جنگ ہوئی تو محمد علی برادر احمد علی کو مولانا سندھی نے قندھار کے محاذ پر بھیجا۔ وہاں اس نے بڑی ایمانداری سے کام کیا۔ جشن آزادی میں نائب الحکومت قندھار محمد یونس خاں، محمد علی کو اپنے ساتھ قندھار لے آیا اور اپنی بڑی خلعت اس کو پہنائی اور کہا کہ محاذ قندھار پر افغانی لشکر بے ایمان ہو گیا تھا۔ مگر اس کی اور لاہوری طلباء کی ثابت قدمی کی وجہ سے انگریزی فوج آگے نہ بڑھ سکی۔ اور قسم کھا کر کہا کہ اگر یہ نہ ہوتا تو انگریزی فوج قندھار پر قابض ہو جاتی اور ہم کو مفتوحانہ صلح کرنی پڑتی۔

جب ہجرت کا سلسلہ شروع ہوا سارا پنجاب اور دوسرے ہندوستانی علاقوں کے

لوگ ایک سیلاب کی طرح اُمڈ آئے تو اس سیلابِ ہجرت میں مولانا احمد علی بھی تھے۔ مولانا سندھی نے فرمایا کہ میرے ایک نمائندے ہندوستان میں تھے۔ وہ بھی ہجرت کرکے یہاں آگئے۔ بڑی منت اور سماجت سے اُن کو واپسی پر راضی کیا تو یہ سب مہاجروں سے پہلے ہندوستان واپس آگئے۔ مولانا احمد علی صاحب لاہور میں رہے بہت سے طلباء کو قرآن، حکمت، نیز تعلیم یافتہ حضرات کو قرآنِ پاک کی حکمت سے مانوس و آگاہ کر دیا تھا۔ مولانا سندھی نہیں چاہتے تھے کہ درسِ قرآن کا سلسلہ بند ہو اس لیے ان کو واپس لاہور بھیج دیا۔

ڈاکٹر نور محمد سندھی حیدر آباد سندھ سے اس سلسلۂ ہجرت میں کابل پہنچ گئے تھے اور ہمارے ساتھ رہے۔ جشنِ آزادی کے بعد جب اعلیٰ حضرت امیر افغانستان نے حکومتِ مؤقتۂ ہند کا کام روک دیا تو ہم نے کابل کانگرس کمیٹی بنائی جس کا روح رواں ڈاکٹر نور محمد تھا۔ اس کا الحاق ڈاکٹر انصاری نے گیا کانگرس کانفرنس میں منظور کرا لیا تھا۔ ڈاکٹر نور محمد ہماری کانگرس کمیٹی کابل کے افسر تھے۔ مہاتما گاندھی اور کانگرس کے نوجوان ممبران اسے جانتے تھے اور ہمارے مکرم دوست ڈاکٹر انصاری کانگرس کے سکریٹری تھے۔ الحاق کا مسئلہ آسانی سے طے ہو گیا۔ ہماری کانگرس کمیٹی سب سے پہلی کمیٹی ہے جو برٹش امپائر (British Empire) سے باہر قائم ہوئی تھی۔

اس پر مولانا سندھی ہمیشہ فخر کرتے تھے۔

تیسرے نوجوان جن کا ذکر ہم ضروری سمجھتے ہیں وہ شیخ محمد اقبال شیدائی ہیں۔ میرا مولد سیالکوٹ ہے اور شیدائی بھی سیالکوٹی ہیں۔ ہم وطن کی محبت میں ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہوئے۔ شیدائی صاحب سے ہمارا پرانا کوئی رشتہ نہ تھا۔ اس لیے ہم خیالات میں گو زیادہ متفق نہ ہوئے ہوں، لیکن عملاً دونوں ایک ہو گئے تھے۔ آگے چل کر خیالی افتراق بھی کم ہو گیا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ شیخ محمد ابراہیم کے ساتھ میرا بھتیجا عزیز احمد پہلے کابل پہنچ چکا تھا۔ میرے ساتھ

جو آدمی (مولوی عبداللہ لغاری اور شیخ فتح محمد) آئے تھے ان میں.... ایک میرا بھتیجا محمد علی بن حبیب اللہ شیخ بھی تھا۔ راجہ مہندر پرتاب کے گھر پر میں نے محمد علی کو بھیجا تھا۔

جب ہندوستان میں ریشمی خطوط شیخ عبدالرحیم حیدر آبادی کی معرفت شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کو بھیجے جو مکہ مکرمہ میں ملے تو اسی زمانہ میں محمد علی (اپنے بھتیجے) کو راجہ مہندر پرتاب کے خطوط دے کر راجہ صاحب کے بھائی کے پاس بندر ابن بھیجا۔ محمد علی نے نہایت چالاکی سے وہ خطوط راجہ صاحب کے بھائی کو پہنچائے۔ اس کے بھائی نے دس سے بیس ہزار کے نوٹ جوتے کے تلے میں رکھوا دیے اور محمد علی کو وہ جوتا پہنا کر واپس روانہ کیا۔ محمد علی دو ماہ کے بعد بہ سلامت واپس آئے مگر راجہ صاحب اس وقت مزار شریف بمقام بلخ گئے ہوئے تھے۔ مولانا سندھی نے وہ رقم اور خطوط جو اُن کے بھائی نے بھیجے تھے راجہ صاحب کے پاس روانہ کر دیے۔ اس خدمت کو دیکھ کر راجہ مہندر پرتاب مولانا کے بہت معتقد ہو گئے۔ راجہ صاحب کا تو خیال تھا کہ میرے خطوط بھی شیخ عبدالحق کو دینے چاہئیں۔ میں نے اس کی بہت مخالفت کی۔ اور میں نے اپنے بھتیجے محمد علی کو اس پر روانہ کر دیا۔ اگر یہ خطوط راجہ صاحب شیخ عبدالحق کو دے دیتے تو بہت سے بڑے بڑے ہندو گرفتار ہو جاتے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور کہا کہ ہندو تو بچ گئے۔ اگر میرے ساتھی ہندوستان میں گرفتار ہو گئے تو اللہ پاک ان کی حفاظت کرے گا۔

قندھار کے محاذ پر سردار اعتماد الدولہ کے بھتیجے یونس خان کی خدمت میں محمد علی کو معین کیا تھا۔ سردار یونس نے اُس (محمد علی) کی خدمات کے صلے میں خاص خلعت سے سرفراز فرمایا تھا۔

سردار یونس خاں محاذِ چمن پر تھے۔ مولانا سندھی سے انھوں نے آکر عرض کیا کہ اگر آپ کا بھتیجا محمد علی نہ ہوتا تو ہم محاذِ چمن پر شکست کھا جاتے۔ مگر اس نے اور اس کے ہمراہیوں نے جو ہندوستانی تھے دلیری اور ہمت سے کام لیا۔ اور ہندوستانی

جماعت نے جو اس کے ساتھ تھی بڑی ثابت قدمی دکھلائی جس کی وجہ سے ہم اور انگریز برابر رہے۔ نہ وہ آگے بڑھ سکے اور نہ ہم بڑھ سکے

یہ دونوں عزیز یعنی محمد علی اور عزیز احمد میری خاص ضروریات کے متکفل رہے۔ کھانا، کپڑا اور دوا کے متعلق مجھے کسی دوسرے کی امداد کی ضرورت نہ ہوئی۔

جب مولانا سندھی کابل سے رخصت ہو گئے۔ تو محمد علی برادر مولوی احمد علی لاہوری یاغستان چلا گیا۔ اس نے وہاں بود و باش اختیار کر لی۔ اور مسٹر عزیز احمد مولانا کے ساتھ روس، قسطنطنیہ، اٹلی، سوئزرلینڈ اور مکۂ مکرمہ میں ساتھ ہی رہے جب مولانا واپس ہندوستان تشریف لائے تو یہ بھی آپ کے ہمراہ واپس ہندوستان آیا۔ اب عزیز احمد صاحب کراچی میں مقیم ہیں۔ عزیز احمد نے کابل میں میٹرک پاس کیا تھا۔ عربی میں مولوی فاضل ہے۔ اور ماسکو میں مولانا سندھی نے اس کو روسی زبان سیکھنے اور جنگی مہارت کے لیے حربیہ کالج ماسکو میں داخل کیا روسی زبان اچھی لکھنی اور پڑھنی جانتے ہیں۔ اور فارسی زبان تو مولویوں کے لیے لازم ہے۔ جب مولانا صاحب قسطنطنیہ میں تشریف لائے تو مسٹر عزیز احمد کو قسطنطنیہ کے حربیہ کالج میں داخل کیا۔ آپ نے ترکی زبان میں امتحانِ حربیہ پاس کیا۔ آپ بارہ سال مکہ معظمہ میں رہے عربی زبان میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ مولانا سندھی صاحب اپنی ڈائری میں فرماتے ہیں کہ آج عزیز احمد کے روسی ہم جماعت کونسلر، نائب وزیر جنرل اور ممبر بن گئے ہیں۔ اور عزیز احمد باوجودے کہ علمی اور عملی لیاقت میں ان سے کسی طرح کم نہیں اسی طرح جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔ اسی طرح ہم نے اپنی حکومت ضائع کر دی اور اپنی نسلیں برباد کر رہے ہیں۔

افسوس، اگرچہ اب پاکستان اور ہندوستان میں اپنی اپنی حکومت ہے۔ مگر ایسی لیاقت والے آدمی کو صاحبِ اقتدار طبقہ کسی بڑے کام میں نہیں لگاتا۔ آپ اب بھی کراچی میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ اور مولوی عبداللہ لغاری صاحب بھی

جو ان کے ہمراہی تھے وہ بھی فاقے میں مبتلا رہتے ہیں۔ مگر — یہاں عبدالباری جو مولانا سندھی کا سکریٹری تھا وہ اپنی لیاقت سے قانون ساز جماعتِ پاکستان میں داخل ہے۔ چونکہ پاکستان اور ہندوستان میں ایسے بہادروں کی کوئی قدر نہیں تو آئندہ نسل اِن برسرِ اقتدار لوگوں پر بہت ملامت کرے گی! البتہ ہندوستان نے راجہ مہندر پرتاب کو اس کی جاگیر واپس دے دی اور اس کے علاوہ بڑی تنخواہ ہفت پشت تک جاری کر دی۔

ہماری کابل کی زندگی کے آخری ایام میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور مولوی حسین احمد جیل میں تھے۔ ہمارے رفیقوں کو ہم سے علیٰحدہ کرنے کی تجویز ہو رہی تھی۔ اِن حالات میں آرام سے بیٹھ کر میں شاہی مہمانی کا لطف اُٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے لیے یہ مناسب نہیں تھا۔

جب ریشمی خطوط پکڑے گئے تو بہت لوگ گرفتار ہوئے۔ مولوی ثناء اللہ خادم حضرت محمود الحسن شیخ الہند گرفتار ہوا۔ اور شیخ عبدالرحیم حیدر آبادی سندھی فرار ہو گئے اور گرفتاری سے محفوظ رہے۔ لیکن ایامِ غربت میں فوت ہو گئے۔ مولانا سندھی کے مرشد ابو سراج غلام محمد دین پوری بھاولپوری اور مولوی احمد علی صاحبان وغیرہ گرفتار ہوئے۔ مگر بعد اختتام جنگِ عظیم سنہ ۱۹۱۴ء چھوٹ گئے۔ مولانا محمد علی شوکت علی اور حسین احمد کراچی کے مقدمہ میں گرفتار ہوئے۔ اس سے مولانا سندھی کو بہت صدمہ ہوا۔ مگر چونکہ افغانستان میں اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں امیرِ کابل نے مجھے اپنے خاص صلح وغیرہ کے کاموں میں لگا دیا تھا۔ اور ہم راز بنا لیا تھا، اس لیے تسلی تھی۔ مگر جب جشنِ صلح کے بعد امیر امان اللہ خاں انگریزوں سے غیر جانبدار رہنے کا وظیفہ مانگنے لگے تو اس وقت سے امیر صاحب کے خیالات بدلنے لگے۔ انھوں نے حکومتِ موقتۂ ہند کا کام بند کرا دیا اور کابل کانگرس کمیٹی کے کام پر نگرانی کرنے لگے۔

جب ہم نے یہ آثار دیکھے تو رہنے کی ایک صورت سوچی کہ ہمیں کابل میں

یونیورسٹی شروع کرنے کی اجازت ملے۔ امیر نے پہلے تو مان لیا، مگر بعد میں ٹال مٹول کرنے لگا۔ اگرچہ میں نے کہا تھا کہ اس یونیورسٹی کے تمام ملازمین امیر صاحب کی مرضی سے ہوں گے۔
سردار نادر خاں کی زبانی معلوم ہوا کہ تم سے تمھارے رفیقوں کو جدا کرنے کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ ہم نے امیر صاحب سے عرض کیا کہ ہم سے اگر ہمارے ساتھی جدا ہو گئے تو ان کی زندگی بھی برباد ہو جائے گی اور ہم بھی ان ہمراہیوں کے بغیر خوش نہ رہیں گے۔ اس لیے ہمیں مع ساتھیوں کے روس جانے کی اجازت دے دیں۔ جنگِ آزادیِ افغانستان میں سارا خزانہ خالی ہو گیا تھا۔

اب ہمیں اجازت دینے کے لیے امیر امان اللہ خاں نے ایک شرط لگائی کہ روس سے اگر ہمیں ایک کروڑ پاؤنڈ مل جائے تو ہماری حالت سدھر جائے گی۔ آپ وہاں جا کر یہ کوشش کریں۔ کیونکہ ہم نے انگریزوں سے بہت کوشش کی کہ جو روپیہ انھوں نے جنگ میں غیر جانبدار رہنے کے صلے میں دینے کا وعدہ کیا تھا وہ دے دیں لیکن ابھی تک رقم نہیں ملی۔ آپ اگر روس جا کر کوشش کریں کہ وہ ہم کو ایک کروڑ پاؤنڈ دے دیں تو ہم ہمیشہ کے لیے روس کے خیر خواہ رہیں گے۔

اس شرط پر اجازت ملی تو ہم اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاشقند کے بعد بخارا پہنچے اور گیا کانگرس کمیٹی نے اجلاس میں اعلان کیا کہ کابل کانگرس کمیٹی کو ہم نے اپنے ساتھ ملحق کر لیا ہے۔ اور اس کابل کانگرس کمیٹی کا پریسیڈنٹ میں تھا اس لیے روس میں ہمیں شاہی مہمان قرار دیا گیا۔ اور بڑی عزت و آبرو سے بخارا سے ہوتے ہوئے ہم ماسکو پہنچے۔ اس وقت ٹراسٹکی سویٹ روس کا سپہ سالار تھا اور چیچرن وزیر خارجہ۔ ہماری اس سے بڑی ملاقاتیں ہوئیں۔ آخر جب ہم نے ماسکو سے قسطنطنیہ کا ارادہ کیا تو اپنے آنے کی غرض و غایت بھی چیچرن کو بتادی کہ آپ لوگ اگر افغانستان کو ایک کروڑ پاؤنڈ بھیج دیں تو افغانستان آپ کا ممنون رہے گا۔ اور معاہدہ کر لے گا۔ اور شاید آگے چل کر کمیونزم میں داخل ہو جائے۔ اس پر اس نے کہا ہم غور کریں گے۔ ایک ہفتہ کے بعد مجھے بلایا اور کہا کہ ہم افغانستان کی مدد کو تیار ہیں۔ آپ افغانستان کو لکھیں کہ ہم سے خط و کتابت کرے

میں نے کہا کہ افغانستان آپ سے خط وکتابت نہیں کرے گا۔ ہندوستانی کانگرس آپ سے معاہدہ کرے گی۔ ہندوستانی کانگرس کی وساطت سے آپ افغانستان کو مقررہ رقم بھیج دیں تو چیچرن نے یہ رائے بہت پسند کی اور بہت خوش ہوا کہ اس سے ہندوستان پر ہمارا اثر پڑے گا۔

یہ رائے پختہ ہو گئی کہ افغانستان کو بوساطت ہندوستانی کانگرس مدد دی جائے۔ مگر چیچرن نے یہ شرط بھی ساتھ لگائی کہ چھ ماہ کے اندر یہ فیصلہ ہو جائے اس کے بعد ہم اس معاہدہ سے بری ہو جائیں گے۔ اگر اس عرصہ کے اندر کانگرس ہند نے افغانستان کی مدد طلب کی تو ہم رقم پہنچا دیں گے ورنہ نہیں۔

اس کے بعد انھوں نے راستہ تجویز کیا۔ ہم قسطنطنیہ پہنچے۔ وہ راستہ مخفی تھا تاکہ انگریزوں کو خبر نہ ہو جائے۔ ہماری جماعت جس میں ہندو مسلم دونوں فرقوں کے لوگ تھے اس طرح سے قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ اب ہم اس جستجو میں تھے کہ کانگرس ہند کو کس طرح اطلاع دیں وہاں ایک تعلیم یافتہ ہندوستانی تھا جس کا نام صدیق تھا۔ دو ہفتہ کے بعد ہم سے اس کی ملاقات ہوئی۔ ہم نے اسے تیار کیا کہ جا کر ڈاکٹر انصاری سے جو اس وقت کانگرس کمیٹی کے پریسیڈنٹ تھے، کہو کہ کانگرس ہند روس سے استدعا کرے کہ ایک کروڑ پاؤنڈ بطور امداد سوویٹ روس افغانستان کو بھیج دے۔ محمد صدیق نے کہا کہ میرے پاس خرچ نہیں تاہم میں ضرور جا کر ڈاکٹر مذکور کو کہوں گا۔ اور پختہ وعدہ کیا اور کہا خرچ ملے تو ابھی چلا جاؤں۔ پھر ہم نے کوشش کر کے پاسپورٹ بھی لے لیا۔ قسطنطنیہ میں سوویٹ روس کا نائب کونسل رہتا تھا۔ اس سے ہم ملاقات کرتے تھے۔ ہم نے کہا اگر سات سو روپیہ مل جائے تو ہم ہندوستان کو آدمی روانہ کر سکتے ہیں۔ اس نے ایک ہفتہ میں رقم دینے کا وعدہ کیا۔ اور ہفتہ کے بعد نائب کونسل روس نے آ کر رقم ہمیں دے دی۔

کمیٹی نے اس محمد صدیق کو بلا کر پاسپورٹ اور رقم دے کر تاکید کر کے روانہ کر دیا کہ جلد سے جلد ہمارا یہ پیغام ڈاکٹر انصاری کو پہنچا دے کہ کانگرس سے منظور کرا کے روس کو اطلاع دی جائے۔ ہم مطمئن ہو گئے کہ یہ کام بالا بالا سرانجام ہو جائے گا۔ مگر اس نے

ہم سے دغا کی کہ ڈاکٹر انصاری کو کوئی پیغام نہ دیا۔ خدا جانے کہاں چلا گیا۔ تمام تعلیم یافتہ اشخاص میں صرف اس شخص نے دغا کی۔ ہمارا خیال تھا تعلیم یافتہ لوگ بڑے دیانت دار ہیں مگر اس بے دیانتی پر مجھ کو بڑا افسوس ہوا

اس کے بعد اعلان ہوا کہ ڈاکٹر انصاری سیاحت کے لیے قسطنطنیہ جائیں گے۔ ہم بہت خوش ہوئے کہ ہماری تجویز پاس ہوئی ہے اور اب وہ خود آتے ہیں۔ یہاں آکر کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ چھ ماہ کے بعد ڈاکٹر انصاری قسطنطنیہ تشریف لائے۔ ہم نے پوچھا کہ محمد صدیق نے آپ کو پیغام دیا؟ انھوں نے کہا کہ اس سے کوئی بات معلوم نہیں ہوئی۔ ہم اپنے خیال سے آ گئے ہیں۔ مگر چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اب زیادہ گفتگو سوویٹ روس سے ہو نہیں سکتی تھی۔ اس لیے یہ منصوبہ خاک میں مل گیا۔ ہمیں بڑا افسوس ہوا۔ ہم چاہتے تھے کہ ہم اپنا آدمی بھیجیں مگر اس نے کہا تھا کہ میں ضرور پیغام دے دوں گا۔ ہمارے ساتھ جو ہندو مسلمان طالب علم تھے بہت صادق الوعد تھے۔ جو کام انھیں بتایا جاتا، اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر بھی کام پورا کرتے۔ ہم دھوکے میں آ گئے کہ اس کے پاس بڑی ڈگریاں ہیں، سمجھ دار آدمی ہے۔ ہم نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا کہ ہم نے ایک اجنبی پر اعتماد کیا تو یہ ہوا۔

چیچرن وزیر خارجہ نے مجھ سے کہا کہ آپ کو ہم سمرقند کا حاکم بنا دیتے ہیں۔ جس طرح شاہ ولی اللہ کا سوشل ازم بیان کرتے ہو اُن کے فلسفہ کے مطابق سمرقند جا کر حکومت قائم کرو۔ اگر وہاں ہمارے نظریہ کے قریب ہو گئے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے۔ مسلمان ہونے سے ہمارے بہت سے بگڑے ہوئے کام، خصوصاً کسان مزارعین کا مسئلہ جو حل نہیں ہوتا حل ہو جائے گا۔ میں نے کہا میں قبول کرتا ہوں مگر ہمارے اوپر آپ کا پریسیڈنٹ نہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہمارا پریسیڈنٹ ضرور رہے گا۔ ہم نے پہلے انور پاشا کو اس شرط پر سمرقند دیا تھا۔ مگر اس نے بغاوت کر دی۔ اس لیے ہمارا پریسیڈنٹ ضرور ہو گا۔

مولانا نے نادر شاہ کا مقولہ جو اس نے دہلی میں ہاتھی پر سوار ہونے کے متعلق کہا تھا سنایا کہ جب نادر شاہ فیل پر سوار ہوا تو فیلبان سے کہا "زمامش بدستِ من بدہ!" اُس نے کہا "فیل زمام نہ دارد"۔ نادر شاہ نے کہا "سواری کہ زمامش بدستِ دیگرے باشد یا

زمام ندارد سواری را نہ شاید"۔ فوراً ہاتھی سے اتر پڑا۔

مسلمانوں میں یہ مرض ہے کہ جب اُن کو کوئی اقتدار ملتا ہے تو اقتدار کے نشہ میں سب معاہدے بھول جاتے ہیں۔ پھر چیچرن نے قسطنطنیہ میں ہمیں پیغام بھیجا کہ اپنا پروگرام شایع کردو تاکہ لوگ سمجھیں۔ اور دوسرے بادشاہ بھی سمجھ لیں کہ ان کا پروگرام یہ تھا۔ اور جب ناکام ہوا تو شایع کر دیا ہے۔ اور ہم نے جو ایک لاکھ فوج دینے کا وعدہ کیا تھا اس سے بھی ہم آزاد ہو جائیں گے۔ اس لیے ہم نے اپنا پروگرام شایع کر دیا، جو اردو اور انگریزی میں چھپا تھا۔ قسطنطنیہ سرکار نے مسودہ کا ترجمہ حرف بحرف دیکھا۔ پورے غور سے پڑھا اور سمجھ لیا کہ اس کے شایع کرنے سے گورنمنٹ ترکی کو کوئی نقصان نہیں ہوگا تو شایع کرنے کی اجازت دے دی۔

ہم نے امیر صاحب سے استدعا کی کہ ہم کو روس جانے کی اجازت دی جائے۔ اور میرے تمام ساتھی میرے ساتھ جائیں گے۔ اول تو امیر صاحب نے اس سے انکار کیا۔ لیکن بعد میں انگریزی خیال کے مطابق روس جانے کی اجازت اس شرط پر دے دی کہ آیندہ تم افغانستان سے کوئی تعلق نہ رکھو گے۔ ہم نے جانے کے لیے راستہ پوچھا کہ ہم کس راستہ سے روس جائیں۔ سیدھا راستہ مزار بلخ جاتا تھا۔ اِن ایام میں سردار نادر خاں مالیہ وصول کرنے کے لیے مزار تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ امیر صاحب نے کہا کہ اس راستے سے روس میں مت داخل ہو بلکہ ایک مشکل اور ٹیڑھا راستہ بتلایا۔ کیونکہ امیر صاحب کو خوف تھا کہ سردار نادر خاں اور مولوی مل کر اور کوئی گل نہ کھلائیں۔ جب ٹیڑھا اور دیر پا راستہ مقرر ہوا تو امیر امان اللہ خاں کا ایک خاص رازدار آدمی میرے پاس آیا اور اس نے بتلایا کہ یہ راستہ آپ کے لیے امیر صاحب نے اس لیے مقرر کیا ہے کہ آپ راستے میں قتل ہو جائیں۔ اس پر مجھ کو نہایت غصہ آیا اور اس سے کہا کہ اگر ہم راستے میں قتل ہو گئے تو ہندوستانی نوجوان ہندو اور مسلمان ہماری ہڈیاں نکال کر ضرور ہندوستان لے جائیں گے۔ یہ ایک واقعہ ہی صرف ایسا ہوگا کہ سلطنتِ افغانستان اپنا وجود ختم کرے گی۔

جب یہ خبر امان اللہ کو ملی تو وہ بہت گھبرایا اور اس کے دو تین دن بعد اس رازدار نے

پھر مولانا صاحب سے عرض کیا کہ آپ تسلی رکھیں خیریت سے روس پہنچ جائیں گے. ہم سے روس کا سفر یہ دیکھ کر اختیار کیا کہ ہمارے ساتھیوں کی زندگیاں برباد ہو جائیں گی۔

سوویٹ ایشیا سے تعلقات کی ابتدا ر اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں کی اجازت اور مصلحت سے بروے کار لائی گئی جس میں راجہ مہندر پرتاب نے کافی حصہ لیا۔ انھیں کی تجویز پر ہمارے نوجوان آتے جاتے رہے۔ جب ماسکو میں ہندوستانی اشتراکی جماعت قائم ہوئی اور اس کا مرکز تاشقند قرار دیا گیا تو اس کے لیڈر جوبندر ناتھ رائے مقرر ہوئے جو اُسے کئی سال تک چلاتے رہے۔ اس لیے ہمارے دوست بن گئے۔ اس واقعہ کو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہ واقعہ اگرچہ مولانا نے ڈائری میں اشارۃً لکھا تھا۔ مگر جب وفد صلح بھیجنے کی تجویز ہو رہی تھی اس وقت کا ہے۔

حکومتِ مؤقتۂ ہند کے وسیلے سے روس سے ایک لاکھ امدادی فوج طلب کی گئی تھی یہ زمانہ التوائے جنگ کا تھا۔ اور امیر امان اللہ خاں کی اجازت سے یہ کام ہوا تھا۔ اور اس کام کے لیے راجہ مہندر پرتاب اور دوسرے رفیقوں کو بھیجا گیا تھا۔ امیر امان اللہ خاں کا خود نوشتہ خط جوبندر ناتھ کو بھیجا گیا تھا کہ آپ کوشش کریں کہ ہم کو ایک لاکھ فوج سے روس امداد کرے۔ ہم روس کے ممنونِ احسان رہیں گے۔ اور جو روسی اشتراکی جائیں گے ہم افغان امداد دیتے رہیں گے۔ جوبندر ناتھ رائے اس وقت مشرقی اشتراکی پروپیگنڈے کا لیڈر تھا۔ وہ بذاتِ خود ماسکو چلا گیا اور ٹراٹسکی کو اس پر راضی کر لیا۔ اور شمال مشرقی ہندوستان میں کچھ روسی فوج طلب کی۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ حکومتِ مؤقتۂ ہند کو روسی حکومت نے تسلیم کر لیا، جس کے پریسیڈنٹ مولانا عبید اللہ سندھی تھے۔ اس اسباب کی بنا پر روسی سلطنت سے بواسطۂ جوبندر ناتھ رائے بہت مالی امداد ملی۔ بلکہ بہت سے رازوں سے ہم نے اس کو واقف کر دیا، جوبندر ناتھ رائے نہ جانتے تھے کہ اندرونِ ہند کمیونزم کا کس طرح پروپیگنڈا کیا جائے۔ اس سے روسی اشتراکی ہم پر بہت بھروسہ کرنے لگے۔ یہ باتیں اس سے قبل ہو چکی تھیں اور روس سے ہمارا تعلق قائم ہو چکا تھا۔ نیز بہت سے ہندو مسلمان رفیق اشتراکی بن گئے تھے۔

اس سے بھی روسی اشتراکی جماعت سے ہمارا گہرا تعلق ہوگیا تھا۔ اب روس میں جانے کے لیے میرا ذاتی خیال یہی تھا کہ وہاں جاکر بذاتِ خود معلوم کریں کہ انقلاب کیسے ہوا اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

اب ہم نومبر ۱۹۲۲ء میں دریائے جیحون عبور کرکے ترمذ میں سوویٹ کارندوں کے مہمان ہوئے اور دنیا کی انٹرنیشنل سیاست کا نیا مشاہدہ شروع کردیا۔

جب ہم افغانستان سے چلے تو اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں نے کہا کہ اب آپ افغانستان سے اپنا کوئی تعلق قائم نہ رکھیں اور نہ افغانستان کے معاملات میں کوئی دخل دیں۔ اس وقت سے ہم نیشنل بن گئے۔ یعنی ہم نے اپنے ملک ہندوستان کی ترقی کے لیے غور و فکر کرنا شروع کردیا۔ میں پہلی مرتبہ اپنے ملک کی ترقی کے راستے سوچنے لگا۔ اور تمام ملکوں سے خواہ وہ ملک مسلم ہوں یا غیر مسلم ان سے قطع تعلق کرلیا۔ اور کسی ملک میں بیٹھ کر اس ملک کی ترقی اور بھلائی کا خیال چھوڑ دیا۔ فقط اپنے ملک کا خیال قائم رکھا۔ اور ملکوں سے اس قدر تعلق رکھنا مناسب جان کر کہ اس سے ہمارے ملک ہندوستان کو فائدہ پہنچتا رہے ہم نے کوشش جاری رکھی۔ چونکہ انگریزوں نے ہمارے ہندوستان کی خدمت کی ہے اس لیے اُن کی عزت میرے دل میں پیدا ہوئی۔ اور آیندہ بھی انگریزوں سے مل کر سیلف گورمنٹ (Self Government) حاصل کرنے پر اکتفا کیا جائے، تاکہ ہم اپنے ہندو مسلم جھگڑوں کو حل کرلیں۔

ہم جب ترمذ سے تاشقند ہوتے ہوئے بخارا پہنچے اس وقت بخارا پر اشتراکیوں کا قبضہ تھا۔ دریائے جیحون پر پہنچے تھے کہ روس نے عمل داروں کو حکم دیا کہ ان کا معزز سرکاری مہمانوں کی طرح خیال رکھا جائے۔ ہم نے دریائے جیحون کو روسی افسر کی معیت میں جو افغانستان میں رہتا تھا عبور کیا۔ جب جہاز روسی ساحل پر لنگر انداز ہوا تو خشکی سے صرف تین چار فٹ تھا کہ میرے رفیقوں نے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اور خشکی پر لے گئے۔ دوسری مرتبہ میرے رفقاء روسی افسر کو اٹھانے آئے تو اس نے میرے رفیقوں کو جواب دیا کہ ہم آدمیوں پر سواری نہیں کرتے بلکہ ہم آدمیوں کی

خدمت کرتے ہیں۔ وہ روسی افسر کچھ لنگڑا تھا وہ جہاز سے کپڑوں سمیت دریا میں اتر گیا اور کنارے پر چلا گیا۔ جب میرے رفیقوں نے کہا کہ آپ کپڑے اتار دیں تاکہ خشک ہو جائیں۔ اس کا جواب یہ تھا "ہم کو اتنی فرصت کہاں کہ کپڑے خشک کریں۔ چلو کپڑے خود ہی خشک ہو جائیں گے۔" یہ افسر فارسی جانتا تھا۔ یہ سب جواب فارسی میں دیے تھے اس نے دوسرا جواب یہ دیا کہ ہم انسانوں کی خدمت کرتے وقت کپڑوں کا خیال نہیں کرتے۔ اور نہ ہم پکے (Capitalist) سرمایہ دار ہیں کہ ہم اپنے معمولی کاموں کے لیے نوکر رکھیں۔ اس پر مجھے بڑی شرم محسوس ہوئی۔ اس کے بعد ہم سب کو خیریت اور عزت سے بخارا پہنچا دیا۔ بخارا پر اس وقت اشتراکی قبضہ تھا۔

اشتراکی قبضہ کے بعد بخارا کے نوجوان کافی تعداد میں اشتراکیت سیکھنے کے واسطے ماسکو چلے گئے۔ وہاں سے اشتراکیت سیکھ کر اس کا پروپیگنڈا شروع کیا۔ بخارا کی زمین ساری امیروں کے ہاتھ میں تھی۔ اُن کو سمجھایا کہ اپنے خرچ کے لائق اپنے قبضہ میں رکھ کر باقی سب ہم کو دو تاکہ غریب کاشتکاروں میں تقسیم کی جائے۔ امیروں کو بہت ڈرایا۔ اس پر امیروں نے جان لیا کہ اب تو یہ لوگ ہم کو اتنی زمین دیتے ہیں کہ ہم اپنی ضروریات پوری کرلیں۔ لیکن اگر ان کو روسی امداد مل گئی تو ہم اس سے بھی محروم کر دیے جائیں گے کچھ مدت تک اس طرح کام چلتا رہا۔ جب انور پاشا نے سمرقند میں روسیوں سے بغاوت کر کے جنگ شروع کر دی تو ان امیروں کی ہمت بڑھ گئی۔ انھوں نے تمام اشتراکیوں کو مار بھگایا۔ اور اپنی سب زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ روسیوں کی تمام توجہ انور پاشا کی طرف تھی۔ اس وقت تک بخارا کی ریاست بچی رہی۔ ان کو امید تھی کہ جس طرح انگریزوں نے انور پاشا کو مدد دی ہے ہم کو بھی مدد دیں گے۔ وہ بڑی بڑی امیدیں باندھے بیٹھے رہے۔ روسی لشکر سمرقند کو فتح کر کے بخارا پر ٹوٹ پڑا۔ پہلے ہی حملے میں امیر بخارا بھاگ کر افغانستان چلا گیا۔ اور روسیوں نے اپنا کام کیا۔ اور پورا اشتراکی قانون جاری کر دیا میں نے اس قانون کا پورا مطالعہ کیا۔ اور نتیجے کے طور پر سمجھا کہ اشترکی تحریک کے تو ہم امام ہیں۔ مگر ان کو تعمیل بالکل نہیں آتی۔ کیونکہ جس طرح پہلے کاشتکار لوگ امیروں کے

ماتحت تھے، اب حکومت کے ماتحت ہیں۔ پہلے مزدوروں کو مزدوری کے مطابق مزدوری ملتی تھی، اب سب کو ایک طرح پر ملتی ہے۔ مزدوری کی مناسبت کا خیال نہیں۔ وہ بھی غلاموں کی طرح کام کرتے تھے یہ بھی غلاموں کی طرح کام کرتے ہیں۔

بخارا میں بڑی بڑی مسجدیں ہیں وہ پارک کا کام دیتی رہی تھیں۔ انفرادی طور سے کوئی آیا اذان دی اور نماز پڑھی اور چلا گیا۔ اسی طرح گرجوں کی حالت تھی۔ اجتماعی حالت قوم کی فنا ہوگئی تھی۔ انفرادیت کا مظاہرہ عام تھا۔ مسجدیں یا تعلیم گاہیں جو طالب علموں سے بھری پڑی تھیں وہ ساری کی ساری بچوں کے کھیل کی جگہیں بن چکی تھیں۔ اس وقت چاروں طرف سوائے تخریب کے اور کوئی مظاہرہ نہ تھا۔ عورتوں اور لونڈیوں کو بعض نوجوان شرارتی مرد عام پھراتے تھے اور شریف لوگ گھر میں دبے ہوئے تھے۔ شہر قبرستانوں کی طرح سنسان ویران تھے۔ سونا چاندی اور سونے چاندی کے زیورات سے لدی ہوئی ایک مال گاڑی ہر ہفتہ ماسکو روانہ ہوتی تھی، جس میں ریاست بخارا کے تمام قیمتی جواہرات بھرے ہوتے تھے لوگوں سے معلوم ہوا کہ جب سے بخارا فتح ہوا ہے اسی طرح سنہری لوازمات ماسکو جا رہے ہیں۔ ایک روسی افسر نے مجھے دورانِ گفتگو یہ بتایا کہ اگر ہم بخارا فتح نہ کرتے تو ماسکو والے بھوکوں مرجاتے۔ یہی سونا چاندی ہے کہ اس کو دکھا کر ہم فرانس اور برطانیہ سے اناج اور ضروریاتِ زندگی حاصل کر رہے ہیں۔ اس نے دورانِ گفتگو یہ بھی بتایا کہ جب ماسکو میں ہم اشتراکیوں نے انقلاب برپا کیا اور زارِ روس کو قتل کر دیا اور زار گورنمنٹ کا جو خزانہ تھا اس کے افسران کو کہا کہ ہم کو خزانوں کی چابیاں دو۔ انھوں نے چابیاں دینے سے انکار کر دیا اور اس انکار پر ہم نے ان تمام افسرانِ خزانہ کو قتل کر دیا اور اس خزانہ کی عمارت کو بارود سے اڑا دیا۔ ہمارا گمان تھا کہ اس میں بڑا خزانہ ہوگا۔ لیکن توقع سے کہیں کم نکلا۔ زار گورنمنٹ کے خزانہ سے حاصل شدہ خزانہ (یعنی گنیاں جو اصلی تھیں، اور بہت گنیوں کو جو ہم نے مصنوعی بنائی تھیں اصل میں شامل کر کے) سفیر برطانیہ کو دکھلایا کہ ہمارے پاس

اتنا خزانہ ہے ہمیں اناج دو۔ اس پر ماسکو میں برطانوی سفیر خوش ہو گیا اور ہمیں پنجاب اور سندھ کی جوار اور باجری دیدی۔ خیر جو ہوا سو ہوا۔ ہماری زندگیاں بچ گئیں۔ بخارا کی دولت ہاتھ آنے سے ہم واقعی خوش حال ہو گئے ہیں۔

اس گفتگو سے مجھے دو باتیں معلوم ہو گئیں۔ ایک تو یہ کہ انگریزی کونسل نے خزانہ وغیرہ دیکھ کر روس کو امداد نہیں دی بلکہ انسانیت کے جذبے کے تحت یہ امداد دی تھی۔ وہاں لاکھوں آدمی بھوکوں مر رہے تھے۔ اناج بطور قرض دیا تھا۔ میں نے یہ نتیجہ اس لیے نکالا کہ روسیوں نے برطانیہ کا وہ قرضہ جو زارِ روس پر تھا ادا کرنے سے بالکل انکار کر دیا تھا۔ جب میں ماسکو گیا تو وہاں جا کر میرا یہ گمان اور ماخوذ نتیجہ بالکل درست اور صحیح نکلا۔ دوسری بات سے مجھے سخت صدمہ پہنچا وہ یہ کہ باوجود اتنی دولت اور خزانے کے بخارا نے اپنی قوم کو تعلیم نہیں دی۔ اگر بخارا والے اپنی رعیت کو تعلیم دیتے تو یہ تمام ترکستان پر مسلط ہو جاتے۔

یہ لوگ ترک ہیں جس وقت روس میں انقلاب ہوا اور روسی اپنی مشکلات میں تھے اور ترکستان کے علاقے سمرقند وغیرہ خالی پڑے تھے، اگر بخارا کے نوجوان تعلیم یافتہ ہوتے تو اپنی آزاد اور بڑی اسلامی سلطنت جو روس سے دوچند ہوتی بنا لیتے اور اس غلامی سے بچ جاتے۔ یہ سرمایہ دار خود بھی ڈوبے اور قوم کو ڈبو یا۔ اور قوم کو ذلیل و خوار بھی کیا۔ اگر ان نوجوان ترکوں کو لیڈر اور سرمایہ مل جاتا تو روسی کبھی غالب نہیں ہو سکتے تھے۔ اور اگر انور پاشا کو جب کہ اس نے سمرقند میں جنگ کی سرمایہ سے امداد دیتے تو بھی کچھ بن جاتا۔ لیکن اِن عقل کے اندھوں نے سرمایہ کی محبت کی وجہ سے خاموشی اختیار کی جس کے نتیجے میں یہ غلام بن گئے۔ میں اس پر تین دن روتا رہا۔ آخر میں نے جل کر یہ کہا کہ ایسے سرمایہ داروں پر یہ دَورِ غلامی آنا لازم ہے۔ اچھا ہوا یہ تباہ ہوئے۔ اب تمام ہندوستان کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ ہندوستان میں بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں ان کو چاہیے کہ تمام سرمایہ حکومت کو دے دیں۔

نصیحت :۔ سرمایہ دارانِ پاکستان کو اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے۔ وہ نوجوان

جن کے ہاتھ میں پاکستان کی باگ ڈور ہے، کوشش کر رہے ہیں مگر سرمایہ داروں کا ہاتھ نہیں بٹاتے اور امداد نہیں کرتے۔ اگر دل و جان سے امداد کریں تو اغیار سے مدد لینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

بخارا میں، میں کونسل جاپان سے جو بہت مدت تک ایران میں رہا تھا اور فارسی اچھی جانتا تھا، اور ماسکو جانے والا تھا، اپنے خالی وقتوں میں ملاقات کرتا رہا۔ یہ ماسکو، روس اور جاپان کا معاہدہ کرنے جا رہا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ روس اور جاپان کے معاہدے کے بعد جنگی معاہدہ جرمنی سے کیا جائے گا۔ اور مجھ سے بھی مدد طلب کی۔ میں نے اس کو یقین دلایا کہ ماسکو میں جو مدد میں دے سکا تم کو ضرور دوں گا۔ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ میں جو انگریزوں نے جاپان سے ناانصافیاں کی تھیں اس کا بہت طویل قصہ بیان کیا۔ اور مفصل بتایا کہ انگریزوں نے یہ بے انصافیاں ہمارے ساتھ کی ہیں اور مالِ غنیمت میں سے کوئی حصہ جاپان کو نہیں دیا۔ وہ بنگالی انقلابیوں کی بڑی تعریف کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ آیندہ جنگ میں وہ (بنگالی) ہمیں بہت مدد دیں گے۔ میں نے مختصر الفاظ میں اس کو بتایا کہ شاید ہندو اپنے ملک میں جنگ کے اثرات کو نہ آنے دیں۔ پھر پندرہ دن کے بعد بخارا سے جو گاڑی ماسکو جانے والی تھی، ہم لوگ اس پر سوار ہوئے۔ راستے میں بھی اس موضوع پر باتیں ہوتی رہیں۔ جاپانی سفیر کو یقین تھا کہ اگر روس سے ہمارا معاہدہ ہو گیا تو جرمنی روسی مل کر ایشیا سے انگریزوں کو نکال دیں گے۔

خیر، ماسکو میں جتنی مدد اُس نے مجھ سے طلب کی میں نے اس کو دی۔ اور ایک جدوجہد کے بعد یہ روسی جاپانی معاہدہ ہو گیا۔ یہ ایسا معاہدہ تھا کہ برطانیہ کا اقتدار ایشیا میں ختم ہو جائے گا۔ اگر ہر ہٹلر اپنی غلطی سے روس پر حملہ آور نہ ہوتا تو تھوڑے دنوں کے بعد روس بھی اس جنگ میں شریک ہو جاتا۔

ہمارے ساتھ بخارا میں ایک انگریز سیاح بھی تھا۔ وہ اور ہم ریل کے ایک ہی ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ بخارا سے جب ریل چھوٹی تو آبادی ہی آبادی تھی۔ جوں جوں وہ آگے بڑھتی رہی آبادی زیادہ سے زیادہ ہو رہی تھی۔ اس پر انگریز سیاح نے افسوس کر کے

کہا کہ اگر یہ آبادی اسی طرح بڑھتی رہی تو برطانیہ ختم ہو جائے گا۔ اور ہمیں جو تنخواہیں بڑی بڑی ملتی ہیں رک جائیں گی۔ اناج سستا ہو جائے گا۔ ہمیں یہ نظارہ اشتراکی روس کا اعجاز معلوم ہوا۔ کیونکہ جہاں نظر جاتی تھی آبادی ہی آبادی تھی (یعنی زراعت)۔ سائبیریا کا علاقہ جو پہلے مویشیوں کی چراگاہ تھا اب سب زیر کاشت ہے اور آباد ہے۔ اور وہاں میں نے دیکھا کہ بڑے بڑے شہر آباد ہیں۔ شہروں کے ساتھ کھیل کود کی جگہ اور مویشیوں کے چرنے کی جگہ بھی موجود ہے۔

ایک اسٹیشن پر جب گاڑی ٹھہری، وہاں گاڑی زیادہ عرصہ ٹھہرتی تھی۔ میں اسٹیشن پر اترا۔ اور روٹی وغیرہ کے لیے ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا، ہمارے ساتھ وہ انگریز سیاح بھی تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ایک غریب سے غریب مکان تین کمروں کا ہے۔ یعنی ایک مویشیوں کے لیے ایک لکھنے پڑھنے کے لیے، تیسرا گھریلو زندگی کا۔ ہم نے اسکول کو دیکھا کہ ان میں کثرت سے ایسے بچے تھے جو ابھی دودھ پیتے تھے۔ ہمارے ساتھ روسی ترجمان بھی تھا۔ اور ہمارے رفیق انگریزی داں بھی۔ ہم نے جب معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ان کی مائیں کام پر ہیں اور یہ بچے اسکول ماسٹر عورتوں کی نگرانی میں ہیں۔ ہم نے وہاں ماسٹروں کو دیکھا کہ بڑی ہمدردی سے بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام ان کے اپنے بچے ہیں۔ غرض کہ مزدوروں کو ہر آرام پانی، بجلی اور خوراک وغیرہ کے سامان ہر جگہ مکمل ملتے تھے کاشتکار گھنٹوں کے حساب سے کام کرتے تھے۔ جب وہ گھر آتے تھے اس وقت اُن کو چائے تیار ملتی تھی۔ گھر میں جتنے مرد اور عورتیں ہوتی تھیں ہر ایک کو پاؤ بھر دودھ یومیہ مل جاتا تھا۔ مزدوروں کے پاس تو پیسہ تھا کہ وہ اپنی ضرورت کی چیزیں لاکر رکھتے تھے مگر کاشتکاروں کے پاس بالکل نہیں تھا۔ البتہ کاشتکاروں کے لباس مردانہ اور زنانہ یہ بتلا رہے تھے کہ ان کو یہ اشیار مل جاتی ہیں۔ اتنی بات مزدوروں اور کاشتکاروں میں عام پائی جاتی تھی کہ وہ خوش وخرم اور مطمئن نہ تھے۔ میں نے خیال کیا کہ یہ صرف اس بات کا سبب ہے کہ ایک غلامی سے دوسری غلامی میں پھنس گئے ہیں۔ دوکاندار بھی تھے مگر کوآپریٹیو سوسائٹی (Co-operative Society.) کے نمونہ پر۔ میں نے دیکھا ہر شخص خواہ وہ

مزدور تھا یا دوکاندار یا کاشتکار اپنے کام میں بڑی دل چسپی لے رہا تھا۔ تفریح اور کھیل کود کے وقت ساری بستی کے لوگ جمع ہو جاتے تھے۔ اور سارا بازار بند ہو جاتا تھا۔ ایک گھنٹہ یومیہ پریڈ ہوتی تھی جس میں عورت اور مرد سب ہی شریک ہوتے تھے۔ خواہ ان کی عمریں کتنی ہی ہوں۔ ہم ریل اور اسٹیشنوں پر دیکھتے گئے۔ پندرہ دن کے بعد ہم ماسکو پہنچ گئے۔ میرے رفیق بہت تعجب کرتے تھے۔ اور وہ انگریز سیاح بھی جو ہمارا ہم سفر تھا حیران تھا۔ لیکن میرے دل پر اس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ کیونکہ میں اس میں نقص کے جراثیم دیکھتا تھا۔ بہت سے روسی مذہب کی طرف لگاؤ رکھتے تھے۔ مگر وہ مذہب کی پابندی فراغت کے اوقات میں کرتے تھے۔ لیکن جو اشتراکی تھے وہ بڑے پرجوش تھے جو کلام اللہ پڑھے ہوئے تھے اپنی ڈیوٹی بڑی اچھی طرح دیتے تھے۔

یہ کلیہ قاعدہ ہے کہ فکر و نظر آدمی کے دل میں بیٹھ جائے اور گھر کرلے تو اس کے لیے آدمی اپنی جان و مال کی بازی لگا دیتا ہے۔ اشتراکی نوجوانوں کی کارکردگی کو دیکھ کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی کارکردگیاں یاد آتی تھیں کہ انھوں نے اپنی بے سرو سامانی کے دوران کیسے کیسے کام کر دکھائے۔

جب ہم ماسکو پہنچے تو لینن زندہ تھا اور بیمار تھا۔ یہاں تک کہ کسی کو پہچانتا تک نہ تھا۔ اس لیے ہم اس سے نہ ملے۔ وزیر خارجہ روس ہمارے استقبال کے لیے آیا، تمام گفتگو انگریزی زبان میں ہوئی۔ میرا رفیق ظفر حسن ہمارا ترجمان تھا۔ اس سے میں نے استدعا کی کہ اشتراکیت کا مطالعہ کرنے کے واسطے مجھے ثبوت بہم پہنچاؤ۔ انھوں نے وعدہ کیا اور اشتراکیت پر جو عمدہ عمدہ انگریزی میں کتابیں تھیں مہیا کر دیں۔ اور کارل مارکس اور انجیل کی کتابیں بھی بہم پہنچائیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم ان کتابوں کے ترجمے بھی کرنے والے ہیں، آپ کو دیں گے۔ مگر مولانا نے منع کر دیا۔ اور کہا کہ میرے رفیق خود ترجمہ کر لیں گے۔ چونکہ میرا تعارف اور تصدیق سرکاری طور پر ہو گئی تھی کہ یہی گورنمنٹ ہند (Government of India) اور کابل کانگرس کمیٹی کے پریسیڈنٹ ہیں، اس لئے عزت افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ایک بڑے مکان میں ہم کو جگہ دی۔

جو ایک بڑے امیر کا تھا۔ اس میں فرنیچر (Furniture) بہت تھا۔ ماسکو میں رات بڑی ہوتی ہے۔ رات کا کچھ وقت ہم سیر و سیاحت کی نذر کر دیتے اور بہت دیر کے بعد واپس آتے تھے۔

اس مکان کی مالکہ ایک بوڑھی عورت تھی۔ اس کے چار بچے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ انقلاب میں ان کا مرد مارا گیا۔ یہ دروازے کے قریب ایک کوٹھری میں رہتی تھی۔ ہم دیر سے آتے تھے اس لیے بیچاری اُٹھ کر دروازہ بند کرتی تھی اور جاگتی رہتی تھی۔ ایک دن اس بڑھیا نے، جب دیر سے رات کو آئے تو مجھے (مولانا کو) بلا کر کہا کہ "تم ہندوستانی ہو، عورتوں پر رحم کرتے ہو۔ رات کو جلدی آیا کرو۔ مجھ پر رحم کرو۔ میں آپ کے واپس آنے تک بیٹھی رہتی ہوں"۔ اس کے بعد ہم جلدی واپس آنے لگے۔ اس سے وہ بہت دعائیں دیتی تھی۔ ایک دن کہا کہ یہاں عورتوں پر رحم نہیں ہے۔ پھر جب ہم آتے تو کہتی "بچہ تم آگئے ہو" اور خوش خوش دروازہ بند کر دیتی۔ ماسکو کی رات بہت بڑی ہوتی تھی۔ جب رات کو آنکھ کھل جاتی تھی تو ہمارے من چلے رفیق فرنیچر کو توڑ پھوڑ کر آگ روشن کرتے اور تاپتے اور باتیں کرتے تھے میرے دوست کتابیں ترجمہ کرتے جاتے اور میں پڑھتا جاتا تھا۔ ایک روسی پروفیسر گاہے گاہے میرے پاس آتا تھا کہ مجھے اِن کتابوں کے متعلق سمجھائے۔ ایک بار وہ ایک مضمون پر تقریر کر رہا تھا۔ اور میں اس مضمون کو پڑھ چکا تھا۔ جب اس نے اپنی تقریر ختم کی تو میں نے اس سے کہا کہ پروفیسر صاحب اس بات کا جو آپ نے بتائی ہے مطلب یہ ہے۔ اسی طرح کئی بار ہوا۔ اُس نے وزیر خارجہ کو جا کر بتایا کہ وہ ہم سے زیادہ سمجھتا ہے۔ وہ بڑا تیز فہم ہے۔ ہماری ملاقاتیں وزیر اعظم روس ٹراٹسکی سے اکثر ہوئیں۔ وہ چاہتا تھا کہ جتنی جلدی ہو سکے تمام دنیا کے ملکوں کو اشتراکی بنا دیا جائے۔ بڑا عالی ظرف آدمی تھا۔ مگر اس کا مخالف اسٹالن تھا۔

ٹراٹسکی یہودی تھا اور اسٹالن روسی مسلمان۔ مگر وہ اشتراکی نظریہ پر ایمان لایا تھا اور ایمان سے کام کرتا تھا۔ ہمارے ماسکو کے قیام کے دوران تھوڑی تھوڑی

مخالفت ہوتی رہی اور آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔

ایک دن کاشتکاروں پر جو بڑے افسروں کا بڑا افسر تھا ہم سے ملنے آیا۔ دوران گفتگو اس نے کہا کہ کاشتکار دل سے کام نہیں کرتے ہم کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ان کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیل کرتے ہیں، لیکن پھر بھی وہی حال رہتا ہے۔ اس کا علاج بتاؤ۔ میں نے جواب دیا کہ میری نظر میں تو اس کا علاج صرف یہ ہے کہ تھوڑی سی اراضی ایک کاشتکار کو دس سال تک اس کی ملکیت قرار دے دو۔ پھر دل لگاکر کام کرے گا۔ اس کے ایک ماہ بعد وہی افسر دوبارہ ملنے آیا اور بڑی خوشی ظاہر کی کہ ہم نے آپ کی بتائی ہوئی تجویز پر عمل کیا۔ اب وہ خوب کام کر رہے ہیں۔ کوئی شکایت نہیں۔ اس نے کہا کہ یہ تدبیر تو بہت اچھی ہے۔ مگر ہمارے اشتراکی نظریہ کے خلاف ہے۔ اس کے بعد نہ معلوم کیا ہوا۔ روس میں عیسائی زیادہ ہیں مسلمان کم۔

ایک دن وزیر خارجۂ روس ملنے کو آیا۔ اُس نے آکر بتایا کہ برطانیہ اور روس کا ایک معاہدہ ہوا ہے کہ جو پروپیگنڈا ایک دوسرے کے ملکوں میں کریں گے اس کا خرچ ایک دوسرے کو بتا دیں گے۔ اس معاہدے کے ماتحت لارڈ کرزن وزیر خارجہ برطانیہ نے روس سے دریافت کیا ہے کہ روس نے اپنے پروپیگنڈے پر کتنا خرچ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ آپ برطانیہ سے یہی سوال کریں۔ اُس نے حیران ہوکر پوچھا کہ لکھ دوں۔ آپ جواب دیں گے؟ میں نے کہا لکھ دو۔ میں ضرور جواب دوں گا۔ اُس نے یہی جواب وزیر خارجہ برطانیہ کو لکھ دیا۔ اس کے بعد ملاقات ہوئی تو خوش ہو کر بتایا کہ وزیر خارجہ برطانیہ جواب نہیں دیتا۔ اور میری واقفیت کی داد دی۔

ایک دفعہ وہی وزیر خارجہ میرے پاس آیا اور کہا کہ اگر ہماری طاقت کا آپ اندازہ لگانا چاہیں تو میں آپ کو تمام سیر کرا سکتا ہوں۔ میں نے جواب دیا کہ زیادہ نہیں صرف ایک مقام دکھلاؤ میں اندازہ لگا لوں گا۔ اس کے بعد وہ مجھے ایک سو میل دُور لے گیا اور ایک پہاڑ کے سلسلے میں ایک کارخانہ دکھلایا اس میں ہر قسم کے جنگی آلات تیار ہو رہے تھے۔ اس کی سیر کرانے کے بعد اُس نے کہا کہ ایسے کارخانے

ہمارے پاس کئی سو ہیں۔ اور کہا کہ ہم اپنی خاص طاقت کو خاص حفاظت میں رکھتے ہیں وہ اور جگہ ہے۔

امام موسیٰ جار اللہ ہمارے پاس ماسکو ملنے کو آئے۔ یہ امام موسیٰ جار اللہ ایک بڑے عالم تھے۔ ان کا قیام لینن گراڈ میں تھا۔ ملاقات کے بعد وہ ہمیں رمضان شریف میں اپنے ہاں لے گئے۔ ان کی بیوی نے ہماری بڑی خدمت کی۔ ہر چیز وقت پر ہمارے لیے تیار ملتی تھی۔ یعنی کھانے، پینے، نہانے کا سامان بالکل تیار ملتا تھا۔ ایک ہفتہ بعد ہم ماسکو واپس آگئے۔ آخری ملاقات کے وقت اُن کی بیوی نے کہا کہ اتنے بڑے آدمی اور ایسے سادے اور مذہب کے پابند ہم نے کبھی نہیں دیکھے۔ بڑے بڑے آدمی بھی آپ کے معتقد اور عزت کرنے والے تھے۔ اور کہتے تھے اتنا بڑا سوشلسٹ اور مذہب کا پابند۔ کاش ایسی جماعت ہوتی تو ہم بھی مذہب اسلام قبول کر لیتے۔ سوویٹ کانگرس کی طرف سے روس میں مذہبی رسوم ادا کرنے کی اجازت کسی کو نہ تھی۔ مگر مجھ (مولانا) کو تھی۔ ایک دن کانگرس نے اعتراض کیا کہ یہ اپنی مذہبی رسومات ادا کر رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ باوجود اتنا بڑا انقلابی ہونے کے ایسا ہے۔ اگر تم بھی ایسے ہوتے تو سب کو اجازت دے دی گئی ہوتی ـــــ تم ظاہر میں سوشلسٹ ہو مگر باطن میں سرمایہ دار۔ ہم ظاہر میں سوشلسٹ ہیں، یہ باطن میں ہیں۔ اگر تمام ایسے ہوں تو ہم سب یہی مذہب اختیار کر لیں۔

ایک بار ایک موقع پر جہاں بڑے بڑے مدبر، پروفیسر اور ادیب جمع تھے، کارل مارکس کی تعریف کرنے لگے۔ میں مارکس کی تمام کتابیں دیکھ چکا تھا۔ مجھ سے پوچھا۔ ایسا نظریہ اس سے پہلے تم نے کہیں دیکھا ہے؟ میں نے کہا کہ شاہ ولی اللہ دہلوی مفکر ہندوستان، فلاسفر کارل مارکس سے ایک سو سال پہلے ہوئے ہیں جن کے ہم پیرو ہیں۔ انھوں نے کارل مارکس کی پیدائش سے ایک سو سال پہلے اپنی کتابوں میں لکھ دیا ہے۔ روسیوں نے کہا کہ وہ کتابیں کہاں اور کون کون سی ہیں میں نے ان تمام کے نام بتائے۔ جب انھوں نے دیکھا تو سب نے متفقہ طور پر

کہا کہ ہم تو یہی سمجھتے تھے کہ کارل مارکس اس نظریہ کا موجد ہے۔ مگر یہ تو سب کچھ اس سے پہلے موجود تھا۔ شاہ صاحب کی وہ تمام کتابیں دیوبند میں پڑھائی جاتی ہیں۔ لیکن ان میں دین اسلام شامل ہے۔ بہت کے ساتھ عوام کا ربط عقلی نہیں۔ یعنی لازم وملزوم نہیں۔ یعنی جب بھی کوئی جماعت یا اجتماع ایسا ہو جو غریب بار کی خدمت کرے اور کاشتکاروں کو بیدار کرے۔ اس لیے اجتماع لازم نہیں کہ فلاسفی بھی ہو۔ پھر انھوں نے شاہ ولی اللہ صاحب کی کتابیں پڑھیں۔ ایک پروفیسر جو عربی جانتا تھا میرے پاس آیا۔ کہنے لگا کہ مجھ کو تو یقین ہو گیا کہ کارل مارکس نے یہ نظریہ شاہ ولی اللہ دہلوی سے حاصل کیا ہے۔ کیونکہ یہ کارل مارکس شاہ صاحب کی وفات کے سو سال بعد پیدا ہوا ہے۔ اس پروفیسر کے ساتھ وزیر خارجہ بھی تھا وزیر خارجہ نے کہا کہ کیا کوئی چھوٹی سی مسلمانی ریاست ہے جو اس نظریہ پر چل رہی ہو۔ تو میں نے کہا کہ ہمارے استاد نے بنانی چاہی مگر ناکامی ہوئی۔ اب کوئی نہیں۔ وزیر خارجہ نے کہا کاش کوئی اسلامی ریاست ایسی ہوتی تو ہم سب مسلمان ہو جاتے۔ اور تمام جھگڑے ختم ہو جاتے۔ اب بھی ہم آپ کو سمرقند دیتے ہیں اس میں دس سال کام کریں۔ اگر کامیاب ہو گئے تو ہم اس نظام کو دیکھ کر مسلمان ہو جائیں گے۔ مگر مولوی صاحب نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ وہ وہاں اپنا ریزیڈنٹ رکھنا چاہتے تھے۔ اس وزیر خارجہ کی یہ بات برطانیہ پہنچ گئی۔ اس پر سارے یورپ میں تہلکہ مچ گیا۔ کہ روس مسلمان ہونے لگا ہے۔ اس پر وزیر خارجہ نے ایک جگہ تقریر میں کہا کہ ایک شخص کا نظریہ ایسا ہے۔ اس کے ساتھ جماعت نہیں اور نہ وہ اجتماعی ہے ہم ایک آدمی کو دیکھ کر اپنے کام کو کیسے بگاڑ سکتے ہیں۔ مسیح ناصری کے تمام شاگرد سوشلسٹ تھے۔ مگر عمرؓ کے زمانے میں گو عمرؓ خود سوشلسٹ رہے مگر ان میں سرمایہ داری آگئی ابوبکرؓ بھی سوشلسٹ تھے۔ عمرؓ بذاتِ خود سوشلسٹ ہیں مگر اپنی حکومت کی بنیاد سرمایہ داری پر رکھی جس سے تمام مسلمان بگڑ گئے اور آئندہ چل کر (Capitalist) سرمایہ دار بن گئے۔ اس لیے ہم اپنا نظریہ کبھی نہ بدلیں گے۔

میں نے ایک صلاح دی جو انھوں نے قبول کر لی۔ وہ یہ کہ جو کوئی آپ کے حکم کے ماتحت رہ کر مذہبی رسوم ادا کرے اور مخالفت نہ کرے تو اُسے مذہبی رسومات ادا کرنے کی اجازت دے دی جائے۔ عیسائیوں نے اس کو قبول کر لیا۔ مگر مسلمانوں نے کہا کہ عیسائی اکیلے اکیلے گرجاؤں میں جاکر اپنی مذہبی رسم ادا کرتے ہیں لیکن مسلمانوں میں امام کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا۔ اور اشتراکی بھی اس مجمع کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

آٹھ دس ماہ کے بعد میں نے وزیر خارجہ سے کہا کہ میں اشتراکی نظریے کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ اب چاہتا ہوں کہ ترکستان جاؤں۔ میرے لیے راستہ تیار کرو تاکہ میں برطانوی جہازوں سے جو بحیرۂ اسود میں پھرتے ہیں محفوظ رہ سکوں۔ پھر اس نے اور سفیر ترکی نے مل کر راستہ تجویز کیا۔ اور آخری ملاقات میں میں نے ان کو بتایا کہ میں آیندہ نیشنلسٹ نظریہ پر رہوں گا۔ اپنے ملک ہندوستان کے علاوہ میرا تعلق دوسرے ملک سے کوئی نہ رہے گا۔ پھر ایک اور جگہ سے جہاں سے ایک روسی جہاز ترکی کو جاتا تھا مجھے سوار کرا دیا۔ میں اور میرے ہمراہی امن و امان سے قسطنطنیہ پہنچ گئے۔ میں نے وہاں ترکی قوم کا مطالعہ کرنا شروع کیا، کہ وہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟ انھوں نے اپنا قانون نہیں بلکہ سوئزرلینڈ کا قانون اپنایا ہوا تھا۔ کچھ باتیں اشتراکیوں کی تھیں۔ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو مجبور کر کے چھوٹی چھوٹی اراضی گوٹوں پر تقسیم کر دیں اور اس وقت انھوں نے روسی حروف اختیار کر لیے تھے۔ قوم میں کوشش سے تعلیم عام کی جا رہی تھی۔ اور اس وقت وہاں ڈکٹیٹر شپ تھی۔ تعلیم پر بڑا زور تھا۔ کسی آدمی کو جاہل چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی طرح دس سال میں انھوں نے اپنی ساری قوم کو تعلیم یافتہ بنا دیا۔ اس کے بعد جمہوری سلطنت کی بنیاد رکھی۔ میں انقرہ میں مصطفےٰ کمال پاشا سے ملا، جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔ قسطنطنیہ میں ڈاکٹر انصاری دہلوی اور نہرو سے ملاقات ہوئی جو وہاں آگئے تھے۔ میں نے ہندوستان کے متعلق اپنا نظریہ دونوں کو سمجھایا۔ نہرو نے کہا

کہ نظریہ بہت اچھا ہے۔ مگر ہندوستان میں نہیں چل سکتا۔ ہماری قوم اس کے لیے تیار نہیں۔ ڈاکٹر انصاری نے میرا نظریہ قبول کیا اور اس سے بہتر کوئی دوسرا نظریہ پیش نہ کیا۔

کچھ عرصہ کے بعد وزیر خارجہ روس آیا اور مجھ سے خاص ملاقات کی۔ اور کہا کہ میں تو اس لیے آیا ہوں کہ آپ تو نیشلسٹ ہو گئے اور ہم نے آپ سے جو وعدے کیے تھے ہم آج تک اس پر قائم ہیں۔ مگر ہندوستان میں گاندھی پیدا ہو گیا ہے۔ اور ہندوستانی قوم اس کے پیچھے لگ گئی ہے۔ ان کی پالیسی کی بنیاد سرمایہ داری پر ہے۔ ایسی حالت میں ہندوستان پر حملہ نہیں ہو سکتا۔ تم مہربانی کر کے اپنا پروگرام شایع کر دو۔ تاکہ ہم اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں۔ جب آپ کے پروگرام کا کوئی آدمی پیدا ہو جائے گا تب دیکھا جائے گا۔ اس نے پروگرام شایع کرنے کے لیے بہت زور دیا۔

میں نے بہت غور کیا کہ اگر میں اپنا پروگرام شایع کر دوں تو انگریز مسلمانوں کو ہندوستان میں تباہ و برباد کر دیں گے۔ کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ انقلابی اشخاص اپنا پورا پروگرام کبھی بیان نہیں کرتے۔ تھوڑا تھوڑا بیان کرتے ہیں۔ اور ان کی جماعت اس پر عمل کرتی جاتی ہے۔ جب کام ختم ہو جاتا ہے تو وہ اپنا سارا پروگرام شایع کر دیتے ہیں۔ قرآن حکیم چونکہ انقلابی پروگرام ہے بوقت ضرورت تھوڑا تھوڑا بتایا جاتا تھا۔ جب مکہ فتح ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم حج وداع کے موقع پر جبل عرفات پر تھے تو آخری آیت نازل ہوئی کہ یہی پروگرام تھا۔ (اگر اس وقت پورا پروگرام شایع کر دیا جائے تو اول یہ خیال ہو گا کہ ناکامی ہوئی ہے اور مسلمان اپنا پروگرام مکمل نہیں کر سکے۔ اور دوسرے مخالف پارٹی اس کے خلاف جوڑ توڑ کر کے اس پروگرام کو ناکام بنانے کی انتہائی کوشش کرے گی۔ ہماری اور تمام انقلابی لوگوں کی یہ رائے ہے کہ مسیح موعود کی انجیل میں سارا پروگرام نہیں بیان کیا گیا۔ اس بڑے پروگرام کے یہ سب ٹکڑے ہیں۔ اس پروگرام کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل کر دیا۔ توریت میں مکمل پروگرام تھا۔ مگر بنی اسرائیل نے اس میں ایسے پیچ ڈالے کہ ناممکن العمل بنا دیا)۔

وزیر خارجہ روس کے جانے کے بعد میں سوچ میں پڑ گیا، کہ سارا پروگرام شایع

کرنا ہے۔ کس طرح شایع کیا جائے۔ یہ خیال میرا پکا ہو گیا کہ اس پروگرام کو حکومت مسلمانوں کے سر تھوپے گی اور ہندو بچ جائیں گے۔ اس لیے ہندؤں کو اس پروگرام میں شامل کر لینا چاہیے۔ اس لیے میں نے ایک خاص تجویز کے مطابق تین خط لکھے۔ ایک گاندھی کو دوسرا مالوی جی کو تیسرا لالہ لاجپت رائے کو کہ مجھے قسطنطینہ میں آکر ضرور مل جائیں۔ اور یہ خطوط ہندوستان کے پوسٹ آفس بمبئی میں ڈالے گئے۔ ہندوستان کے سب ہندو اخبار آتے تھے۔ میں دیکھتا رہا کہ ان میں کیا ہوتا ہے۔ ایک اخبار میں درج تھا کہ مالوی جی اور لالہ لاجپت رائے گاندھی آشرم احمد آباد میں گاندھی جی کو ملنے آئے ہیں۔

پھر اخبارات میں شایع ہوا کہ لالہ لاجپت رائے یورپ کی سیاحت کے لیے جا رہے ہیں۔ اٹلی، فرانس، مصر، جرمنی، روس پھر قسطنطینہ جائیں گے۔ میں نے سمجھ لیا کہ میری ملاقات کے لیے آ رہا ہے۔ جب لالہ لاجپت رائے روس کی سیاحت کر کے قسطنطینہ کے جہاز پر آیا تو ہم قسطنطینہ کی بندرگاہ پر ہندوستانی لباس میں لالہ جی کے استقبال کے لیے گئے۔ انھوں نے اترتے ہی پوچھا کہ عبیداللہ سندھی کون ہے۔ میں نے بڑھ کر کہا۔ میں ہوں۔ پھر لالہ جی کو لے جا کر ایک بڑے ترکی ہوٹل میں ٹھہرایا۔ اور خوب خاطر تواضع کی۔

ایک دن میں نے تخلیہ میں بیٹھ کر اپنا پروگرام اُس کو بتایا۔ اور ہندوستان پر حملہ کرنے کی تدبیریں اور روسی امداد کے متعلق بتایا۔ اور یہ بھی کہا کہ جاپان بھی ہمارے ساتھ ہے۔ اخلاقی امداد اٹلی بھی کرے گا۔ اور یہ کہ کہاں سے حملہ ہوگا۔ افغانستان سے دہلی تک کا علاقہ آزاد ہو جائے گا۔

میں نے خوشی خوشی سب باتیں بتائیں۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ یہ علاقہ اشتراکی ہوگا۔ لالہ جی کو اس سے پہلے راجہ مہندر پرتاب کی زبانی کچھ معلومات تھیں۔ اب اس کو پورا حال معلوم ہوا۔ اس سے پہلے اتنا کسی نے بھی خیال نہ کیا تھا۔ اور اس کو لالہ جی نے اتنا خوفناک تصور نہیں کیا تھا۔ اب وہ ڈر کی وجہ سے کانپنے لگا کہ ہندوستان میں سرمایہ دار صرف ہندو ہیں اور سوشلزم سے وہ اسی طرح ڈرتے ہیں جیسے کوا کمان سے ڈرتا ہے۔

میں نے اس کو ساری حقیقت بتا دی۔ لالہ لاجپت رائے نے سمجھا کہ مولانا سندھی ہندوستان کو کمیونسٹ بنانا چاہتے ہیں۔ اس نے دَوران ہیم دُرجا یہ کہا کہ خدا کے واسطے پرمیشور کے واسطے ہندوستان کو آگ نہ لگاؤ۔ میں نے کہا کیا میں ہندو کا بیٹا نہیں کیا میرا گھر ہندوستان میں نہیں۔ میں اپنے گھر کو آگ لگاتا ہوں! کون ہے جو میرا ہاتھ پکڑے۔ لالہ جی نے دوبارہ سہ بارہ یہی کہا کہ خدا کے واسطے ہندوستان کو آگ مت لگاؤ۔ میں نے کہا کہ ہم نے جو سوچا ہے کر کے رہیں گے۔ ہمارے ساتھ سارے انقلابی ہندو شامل ہیں۔ دو چار سرمایہ پرست ہندوؤں سے ہم نہیں ڈر سکتے۔ جب لالہ جی جہاز سے بندرگاہ پر اترے تھے تو وہ دیکھ چکے تھے کہ..... استقبال پارٹی نے نعرہ لگایا تھا تو کہا تھا کہ مولانا عبیداللہ سندھی کی جے۔ لالہ لاجپت رائے کی جے۔ گاندھی کی جے۔ یہ ساری ہماری تربیت تھی۔

میں نے کہا کہ جو ہونے والا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اس کو چھوڑ دو کوئی اور باتیں کریں۔ میں نے گاندھی جی اور مالوی جی کا پروگرام دریافت کیا۔ پھر اور بہت سی باتیں ہونے لگیں۔ اور بڑی ہنسی کی باتیں شروع کیں۔ عجیب عجیب باتیں ہوئیں۔ میں آپ کو وہ سناتا ہوں۔ میری والدہ سکھ سناتن دھرمی تھیں۔ ایک بار جو گھر میں آیا تو وہ رو رہی تھیں۔ میں نے دریافت کیا کہ کیوں روتی ہیں؟ کہا کہ اگر میں مر جاؤں تو تم لوگ مجھے مٹی میں دفن کر دو گے۔ نہ کوئی میرے اوپر پانی ڈالنے والا ہوگا اور نہ کوئی میری گائے دان کرے گا۔ ہم اس وقت گوٹھ پیر جھنڈے ضلع حیدرآباد سندھ میں تھے۔ میں نے کہا کہ میں آپ کو گائے دیتا ہوں اپنے جیتے جی دان کر دو۔ دیکھو وہ پاس ہی گوردوارہ ہے اس میں جا کر گائے سنکلپ (دان) کرو اور اگر مر گئیں تو میں گوردوارے سے آدمی بلالوں گا اور آپ کی طرف سے بہت کچھ ان کو دے دوں گا۔ وہ آپ لے جائیں گے میں بھی ساتھ رہوں گا۔ سب پوجا پاٹ اپنے ہاتھ سے کراؤں گا۔ تو میری والدہ اس پر بہت خوش ہوئیں۔ میں نے ایک بچے والی گائے دلوا دی اور خود ساتھ جا کر اپنے روبرو سنکلپ (دان) کرا دی۔ پھر والدہ نے کہا کہ جب مجھے چتا میں جلائیں تم وہاں کھڑے

رہنا۔ میں نے کہا میں ضرور کھڑا رہوں گا۔ لالہ جی نے کہا کہ میری ماں نے بھی یہی کہا تھا۔ اس کو گائے دلوادی تھی لیکن کریا پر حاضر رہنے سے ٹال رہا تھا۔ کیونکہ میں آریہ سماجی ہوں۔ آپ مجھ سے بڑھ گئے۔ اس طرح سونے تک بہت باتیں ہوئیں۔ اور سب طرح کی باتیں ہوئیں۔ صبح کو پھر میں اس کی ملاقات کو گیا۔ دیکھا تو وہ تیار تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ اٹلی کو جانے والا ہے۔ قسطنطنیہ سے جہاز میں اٹلی کے واسطے روانہ ہوا۔ مگر وہ جہاز انگلستان کو جانے والا تھا۔ میں ہمیشہ یورپ کے اخبارات کو اس غرض سے دیکھتا رہا کہ لالہ لاجپت رائے کہاں گیا ہے۔ یورپ اور انگلینڈ کے اخبارات کے ذریعہ معلوم ہوا کہ لالہ لاجپت رائے نے وزیر اعظم ہند سے کافی دیر تک ملاقات کی۔ یہ بھی اخبارات میں تھا کہ بعد ملاقات وزیر اعظم جب لالہ جی واپس آئے تھے تو خوش نہ تھے۔ ہمارے انقلابی رفیق جو انگلستان میں رہتے تھے انھوں نے مجھ کو بتایا کہ ہم کو ایسا گمان ہے کہ وزیر اعظم ہند کو لالہ لاجپت رائے نے آپ کے انقلابی پروگرام کے متعلق اطلاع کی ہے۔ اور وزیر اعظم نے آخر میں اس کو جواب دیا تھا کہ ہم سب سمجھ گئے۔ میں نے اس سے نتیجہ نکالا کہ وزیر اعظم ہند سمجھ گیا ہے کہ یہ سارے انقلابی پروگرام ہندؤں کے تھے جب یہ ناکام ہوئے تو ان سب پروگراموں کو مسلمانوں کے سر تھوپتے ہیں۔ میں دیکھتا رہا کہ لالہ لاجپت رائے کا حشر کیا ہوتا ہے۔ اگر اس کی انڈیا میں عزت ہوئی تو مسلمان معتوب ہو جائیں گے۔ ورنہ ہندو۔ اگر اس کی بے عزتی ہوئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وزیر اعظم نے اس انقلابی پروگرام کو ہندؤں کے سر تھوپا ہے اور مان لیا ہے کہ ہندوستان میں یہ ہندؤں کا بڑا لیڈر ہے۔ اخبارات میں آیا کہ لالہ لاجپت رائے کو پولیس نے اتنا مارا کہ وہ ہسپتال میں جا کر مر گیا۔

میں اس خبر پر سمجھ گیا کہ اب اگر میں اپنا پروگرام شایع کروں گا تو مسلمانوں کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ میں نے اپنا پروگرام مرتب کیا اور اُسے شایع کرنے کی گورمنٹ ترکی سے اجازت مانگی۔ گورمنٹ ترکی نے کئی زبانوں میں ترجمہ کرایا اور اس پر غور کیا اور پھر شایع کرنے کی اجازت دے دی۔ میں نے اپنا پروگرام

اپنے رفیقوں سے انگریزی میں لکھوایا تھا۔ بعض ہمارے دوست جو قسطنطنیہ، روس یا اور دوسری جگہ میں تھے، جو انگریزی نہیں جانتے تھے ان کے لیے اُردو میں شایع کیا۔ اس سے پہلے جو ہم نے کام کیے ان کا اشارۃً ذکر کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے صاف لکھ دیا کہ آئندہ ہمارا تعلق صرف ہندوستان سے ہوگا اور میں نیشلسٹ رہوں گا۔ اور میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ایک ممبر رہوں گا۔ اس کمیٹی کے قانون کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ عدم تشدد کے ذریعہ ہمیں ڈومینین اسٹیٹس (Dominion Status) حاصل کرنا ہے۔ اور سیلف گورنمنٹ میں زیر نگرانی برطانیہ کے رہیں گے۔ اور صوبوں کی تقسیم ہندوستان میں زبان اور رسم و رواج کے اعتبار سے ہوگی۔ اور صوبے آزاد ہوں گے۔ ہندوستان بر اعظم یورپ کی طرح ہے۔ جیسے وہاں مختلف قومیں بستی ہیں اور ان کے اپنے اپنے رسم و رواج ہیں۔ اور ہر علاقہ آزاد ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں رکھا جائے گا۔ اور مرکزی حکومت فیڈریشن (Federation) قسم کی ہوگی۔ اس کے ذریعہ سب صوبوں کا اتصال ہوگا۔ اور ہندوستانی کانگرس میں اتحاد کرنے کے لیے فلسفہ ویدانت اور وحدت الوجود کا ہوگا۔ ہر مذہب کو اپنے رواج و رسوم کا پروپیگنڈا کرنے کی مکمل آزادی ہوگی۔ لیکن یہ نہیں ہوگا کہ دوسرے مذہب پر نکتہ چینی کرے۔ بلکہ اپنے مذہب کے محاسن بیان کرے۔ ساری سلطنت ہند کا مذہب ویدانت اور وحدت الوجود ہوگا۔ یعنی لادینیت نہ ہوگی۔ وحدت الوجود اور ویدانت کا مسئلہ جیسے..... نوافلاطونی مانتے ہیں اسی طرح ہندو اور مسلمان مانتے ہیں۔ اور ہماری کوشش ہندوستان میں یہی ہوگی کہ مزدور اور کاشتکار طبقہ یورپ کے کاشتکار اور مزدور طبقہ کے برابر ہو جائے گا۔ اس لیے ہماری دوسری زبان انگریزی ہوگی۔ اسی طرح اور بھی اختلافی مسئلے تھے۔

کتاب چھپ کر شایع ہوگئی جس سے پہلا مسئلہ لوگوں پر ظاہر ہوگیا کہ روس اور افغانستان سے میرا تعلق نہیں رہے گا۔ اور نہ کسی اور ملک سے خواہ وہ اسلامی

سلطنت ہو یا غیر اسلامی، ایشیائی ہو یا یورپ کی۔

اسی طرح سے میں نے اپنا پروگرام انگریزی اور اُردو میں چھاپ کر شایع کرا دیا۔ میں نے اس میں یہ بھی صاف لکھا تھا کہ مولانا .... محمد علی جوہر، مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر کچلو وغیرہ کو کراچی میں جو سزا ہوئی ہے وہ ایک ڈھکوسلا ہے۔ اس سے قبل محمد علی جوہر کو رولٹ ایکٹ کی کسی دفعہ کے ماتحت جو چار سال جیل کی سزا تھی اس کو کراچی میں عملی جامہ پہنایا گیا۔ کیونکہ رولٹ ایکٹ پر عام شورش ہو گئی تھی۔ اور وائسرائے نے گاندھی جی سے وعدہ کیا تھا کہ رولٹ ایکٹ کو ختم کرا دیا جائے گا۔ اس لیے وہ سزا جو مولانا محمد علی جوہر کو مقام بمبئی مقدمہ چلا کر ان کی غیر حاضری میں دی گئی تھی اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کراچی کا مقدمہ تھا۔ اور آپ کے ہمراہی مولانا حسین احمد مدنی اور ڈاکٹر کچلو وغیرہ بے گناہ مولانا جوہر کے ساتھ سزایاب ہو گئے۔ حالانکہ وہ انقلابی نہ تھے۔ صرف خون لگا کر شہیدوں میں داخل ہو گئے تھے۔ اگر یہ سب لوگ ستیہ گرہ قانون کے پابند نہ ہوتے تو اپیل کرنے پر سب بری ہو جاتے۔

میرا پروگرام شایع ہوا مگر کسی اغیار نے رائے زنی نہ کی۔ اصل میں مقدمہ اس بات پر تھا کہ ہم نے جو خط محمود طرزی کو دیا اس نے بے احتیاطی سے وائسرائے کو دے دیا۔ اور اسی زمانے میں ایک کانگرس ایسوسی ایشن کو آزادی کا جھنڈا بلند کرنا تھا۔ وائسرائے نے گاندھی جی اور مالوی جی کو بلا کر وہ خط دکھایا اور کہا کہ ہماری غلامی سے تو آزاد ہونا چاہتے ہو اور مسلمانوں کی غلامی میں آنا چاہتے ہو۔ تو گاندھی اور باقی ارکانِ کانگرس پیچھے ہٹ گئے۔ اور آزادی کا جھنڈا بلند نہ کیا کہ مبادا العیاذ ہو کہ ہم مسلمانوں کے ہاتھوں آزاد ہوں اور ان کی پولٹیکل طاقت بڑھ جائے۔ اور گاندھی اور مالوی جی کو اس خط کی خبر ہوتے ہوئے بھی انھوں نے مولانا محمد علی کو اطلاع نہ دی۔ اگر ایسا کرتے تو وہ چھوٹ جاتے اور آزادی کا جھنڈا بلند کر دیتے وہ ایک مسلمان آدمی تھا۔ یہ ہمت فقط مسلمانوں کی ہے۔ ہندو اگر مسلمان ہو جاتے تو پہلے سے زیادہ بہادر ہو جاتے۔ اگر مولانا محمد علی اُدھر آزادی کا جھنڈا بلند کرتے تو

ہم اِدھر سے ایک لاکھ روسی فوج اور چار لاکھ افغانی فوج لے کر حملہ کرتے اور ہندوستان اسی وقت آزاد ہو جاتا۔ آخر بہت دنوں کے بعد آزاد ہوا۔ اور ایک کروڑ ہندو اور مسلمان تباہ ہو گئے۔ اور ان کی ملکیت تباہ ہو گئی۔ پھر بھی اچھی حکومت نہ بنا سکے مجھ کو اس بات کا تجربہ تھا کہ ترکی کو جب یورپ نے آزادی دی تو ان کی شرط تھی کہ جو مسلمان یورپ میں ہیں انھیں ہم عیسائی بنا لیں گے۔ یوروپی مسلمان قسطنطنیہ میں آ گئے۔ اور ترکی عیسائیوں نے اعلان کر دیا کہ ہم ترک ہیں۔ اس پر کروڑوں مسلمان تباہ ہو گئے۔ اگر فیڈریشن قسم کی حکومت ہندوستان میں ہوتی تو یہ تباہی نہ آتی۔ اب پاکستان جدا ہوا۔ اس میں مختلف زبانیں ہیں اور یہی ہندوستان کی حالت ہے۔ نہ پاکستان میں متحدہ حکومت قائم ہو سکتی ہے نہ بھارت میں۔ اب بھی ہندو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ میرے پروگرام پر عمل کریں تو ان بکھیڑوں سے آزاد ہو جائیں اور ہندو مسلم شیر و شکر ہو جائیں۔ اب ہندوستان میں لیڈر رہے مہاتمے نہرو وہ کمیونزم اور سوشلزم کی طرف مائل ہے اور مذہب اور دھرم کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ سارا زور نہرو کا مادیت پر ہے۔ تھوڑا بہت پاکستان میں مذہب کی طرف خیال ہے۔ مگر اس کی نظر امریکہ اور برطانیہ کی طرف ہے۔ اور عرب ریاستوں کی توجہ بھی روس کی طرف ہے۔ گویا لادینیت کا دَور دورہ ہے اس طرح کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی ہے۔

ہفتہ کے بعد وزیر اعظم برطانیہ مسٹر لائڈ جارج نے ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں میں اب تک مدبر موجود ہیں۔ اور اس کے بعد کہا کہ ہم ہندوستان کو سیلف گورنمنٹ (Self Government) اس نمونے کی دینی چاہتے ہیں۔ اور میرے پروگرام کو اپنے سپیچ میں دُہرایا۔ شہر کے معزز حضرات کی طرف سے ایڈریس دینے کی تجویز پر مولانا سندھی صاحب نے جب وہ ۱۹۳۹ء میں کراچی میں آئے تو فرمایا کہ اول گورنر سے ملنا ہے۔ پھر ایڈریس لوں گا۔ گورنر کو دوران گفتگو بتایا کہ میں نے جو پروگرام قسطنطنیہ میں رہتے

ہوئے شایع کیا تھا اور اس میں جس طرح سے گورنمنٹ پروگرام دیا تھا عین اسی طرح وزیر اعظم برطانیہ نے اپنی تقریر میں فرمایا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وزیر اعظم برطانیہ نے میری تقریر کو دُہرایا ہے۔ اس پر گورنر نے کہا ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

چونکہ ۱۳۴۲ھ میں مکہ معظمہ میں موتمر عالم اسلامی ہونے والی تھی جس میں مولانا محمد علی اور دیگر دوست شریک ہونے والے تھے اس لیے میں ترکی اور قسطنطنیہ کو چھوڑ کر اٹلی میں آگیا تاکہ شریک موتمر ہو کر ان سے ملوں۔ اٹلی میں مہینہ بھر رہا پھر سوئزرلینڈ چلا آیا۔

ہم سوئزرلینڈ میں ایک ہوٹل میں رہتے تھے۔ وہاں کا دستور ہے کہ ہوٹل والے ایک ہفتہ کے بعد بل دیتے ہیں۔ جب ہم نیچے اُترے اور ناشتہ کیا تو اس نے بل دے دیا ہمارے پاس پیسے نہ تھے تو ہم وہاں بیٹھ گئے۔ ایک ہندوستانی طالب علم بھی وہاں آتا تھا۔ وہ مجھ سے ملا اور پھر روٹی کھائی۔ باہر آیا تو کہا چلو سیر کریں۔ ہم نے بل دکھلا دیا۔ اس نے اتنے پیسے دیے کہ ہم پندرہ دن تک وہاں اور ٹھہر سکتے تھے۔ پیسے لے کر میں اٹلی چلا گیا۔ اور اپنے انقلابی دوستوں کو بلایا کہ میں مکہ معظمہ جانے والا ہوں میرے لیے راستہ تیار کر دو۔ انھوں نے سفر خرچ اور راستہ تیار کر دیا۔ ایک جہاز ابی سینیا جا رہا تھا۔ اس میں مجھے سوار کرا دیا۔ اور کپتان جہاز کو بتلایا کہ یہ ایک انقلابی شخص ہے۔ اس کو نیچے زمین پر نہ اُترنے دینا۔ کہیں گرفتار نہ ہو جائے (مولوی کی داڑھی بڑی تھی۔ انگریزی لباس تھا) جب دوران سفر پورٹ سعید آئے تو میں نے دیکھا کہ ایک ہندو سندھی زبان میں دوسرے کو بلا رہا تھا۔ یہ لوگ پنکھے اور تسبیح بیچنے والے تھے۔ میں نے سندھی زبان میں ان دونوں کو بلایا کہ "دوا ادا ھیڈی اچو" وہ آ گئے۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ یہ حیدرآباد سندھ کے رہنے والے ہیں اور سندھ والی کے جو ایک ہندو قوم ہے ملازم ہیں۔ میں نے انقلابی حیدرآبادیوں کا نام لیا جیسے جے رام داس وغیرہ۔ اُنھوں نے وہاں لکھ کر مولانا صاحب کا نام پوچھا۔ جب میں نے کہا کہ میرا نام عبیداللہ سندھی ہے تو اُنھوں نے اپنے گلے میں کپڑے ڈال کر مجھ سے وعدہ کیا

اور بہت جلد سفر کی ضروریات پوری کر دیں۔ اور چلے گئے۔ اسی اثناء میں ایک پادری تسبیح بیچنے والا آیا۔ میرے گلے میں تسبیح ڈالنے لگا۔ لیکن جہاز والوں نے اس کو رد کا اور کہا کہ یہ مسلمان ہے۔ جب وہ دونوں سندھی چلے گئے تو جہاز کا کپتان میرے پاس آیا اور پوچھا کہ یہ کون ہیں؟ میں نے بتلایا کہ یہ ہندوستانی مجھے اپنا گرو خیال کرتے ہیں۔ اس سے کپتان پر اثر ہوا۔ اور تمام راستے وہ بڑی عزت کرتا رہا۔ کیونکہ اس نے جان لیا کہ یہ کوئی بڑا لیڈر ہے۔

جب نہر سوئز میں ہمارا جہاز داخل ہوا تو ہمارے جہاز میں آگ لگ گئی۔ میں نے خداوند کریم سے بہت دعا کی۔ اللہ پاک کی مہربانی سے بہت جلد آگ پر قابو پایا اور آگ فرو ہو گئی۔ دارالسلام بندرگاہ حبشہ میں جو اٹلی کے ماتحت تھی جہاز بہت دیر تک ٹھہرا۔ ماہ صفر کے شروع میں ہم جدہ بندرگاہ پر پہنچے۔ اس عرصہ میں میرے تمام دوست واپس چلے گئے تھے۔ میں جب جہاز سے اترنے لگا تو کپتان نے منع کیا اور کہا کہ ہمارا بوٹ (Boat) جب آئے گا تب چلیں گے۔ اٹلی کا کونسل جب اپنا بوٹ لے کر آیا، ہم تینوں اس بوٹ میں سوار ہو کر بندر پر پہنچے۔ اور وہاں سے موٹر میں سوار ہو کر سیدھے اٹلی کونسل خانہ چلے گئے۔ اس کے بعد موٹر میں سوار کر کے مجھے بندر جدہ میں چھوڑا۔ اور کہا کہ اب امن ہے۔

.... میرے قیام کے آخری ایام قسطنطنیہ میں ہاشم برادر سردار نادر خاں روس سے ہوتا ہوا مجھ سے ملنے آیا۔ اس وقت سردار نادر خاں اور اس کے بھائی اٹلی میں رہتے تھے۔ اور سلطنتِ افغانیہ سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ جب ہاشم میرے پاس آیا اور کہا کہ ہم افغانستان میں انقلاب لانا چاہتے ہیں مہربانی کر کے آپ اس میں دست اندازی نہ کریں۔ میں نے جواب دیا کہ میں نے افغانستان سے قطع تعلق کر لیا ہے۔ اب میرا افغانستان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کے بعد ہاشم برادر خاں واپس چلا گیا۔ اور اپنی تجویز کے مطابق جب سردار نادر خاں کو........ میرا یہ خیال معلوم ہوا تو بہت خوش ہوا۔ ملا شور بازار جو امیر حبیب اللہ خاں مرحوم

(والد امیر امان اللہ خاں) کے مرشد تھے۔ امیر امان اللہ خاں سے ناراض ہو کر مقام گونڈل کاٹھیاواڑ میں رہتے تھے۔ سردار نادر خاں نے ملّا شور بازار کی وساطت سے اٹلی میں بیٹھ کر شورش پیدا کی۔ اس شورش کے لیے گورنمنٹ برطانیہ نے تین کروڑ پونڈ نادر خاں کو اٹلی میں دیے۔ نادر خاں نے ملّا شور بازار کو دیے اور ملّا صاحب نے افغانستان میں شورش پیدا کر دی۔ کیونکہ ملّا شور بازار کا اقتدار پٹھان لوگوں میں بہت زیادہ تھا بچہ سقہ کی شورش محض اسی ملا اور سردار نادر خاں کی اٹھائی ہوئی شورش کا نتیجہ تھی۔ اس طرح سے امیر امان اللہ خاں والی کابل کو تاج وتخت سے محروم ہونا پڑا۔

زوالِ سلطنتِ امان اللہ خان کے اسباب

آزادی افغانستان کی تسلیم میں ایک شرط گورنمنٹ برطانیہ ہند سے یہ تھی کہ دس سال کے بعد ہندوستان کو سیلف گورنمنٹ (Self Governmet) دی جائے گی۔ یہ شرط انگریزوں کے لیے موت کے برابر تھی۔ ناچار ہو کر یہ شرط منظور کی تھی (آزادی کا حال ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں)۔

ابھی دس سال نہیں ہوئے کہ امیر امان اللہ خاں یورپ کی سیاحت کے لیے تیار ہو گئے۔ میں نے سردار محمود خاں طرزی کو سمجھایا تھا کہ تم اس بات کا ہمیشہ خیال رکھنا کہ امیر امان اللہ خاں کو جو ایک نوجوان دیوانہ ہے یورپ نہ جانے دینا۔ لیکن میرے خیال کے خلاف ان سب نے امیر صاحب کو یورپ جانے کی اجازت دے دی۔ اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خاں یورپ کی سیاحت کے لیے کابل سے رخصت ہو کر قندھار آتے ہیں۔ قندھار سے چمن (برطانوی ہندوستان) میں آتے ہیں۔ ان کی پیشوائی کے لیے وائسرائے کو فوجی استقبال کے لیے آنا تھا۔

لیکن وائسرائے ہند نہیں آئے۔ میں نے افسوس کیا کہ اب چونکہ میرا تعلق افغانستان سے نہیں تھا اس لیے وائرلیس کے ذریعہ اطلاع نہ کی۔ ورنہ میں امیر امان اللہ خاں کو خبر دیتا کہ اور آگے قدم نہ بڑھاؤ، جب تک کہ وائسرائے ہند خود استقبال کو

نہ آئے۔ اور جب وائسرائے آئے تو معاہدۂ افغانستان میں ترمیم کرو۔ اس دفعہ کو جس کے دس سال بعد ہندوستان کو سیلف گورنمنٹ دی جانی تھی، معاہدہ سے نکال دو۔ اور آئندہ جنگی معاہدہ کرو کہ جب برطانیہ کو ضرورت ہوگی ہم افغانستان سے فوجی امداد دیں گے۔ اور جب افغانستان کو فوجی ضرورت ہوگی تو برطانیہ.... اس کو فوجی امداد دے گا۔ مگر چونکہ میرا تعلق نہ تھا اور تعلق نہ رکھنے کی قسم لی جاچکی تھی اس لیے میں نے اس میں دخل نہ دیا۔ امیر امان اللہ خاں چمن سے کراچی آگئے اس وقت بھی برطانوی کمانڈر انچیف ان کے ساتھ تھا۔ کراچی میں امیر امان اللہ خاں کی ہندو مسلمانوں نے آؤ بھگت کی۔ لیکن امیر صاحب کے لیے مناسب نہ تھا کہ وہ کسی سے ملتے۔ میں یہ تمام حالات اخبار میں پڑھ کر بہت حیران ہوا کہ کیسا بے وقوف ہے میں نے خیال کیا کہ شاید امیر امان اللہ بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے یورپ جائیں گے۔ میں اس وقت حجاز میں تھا۔ اگر وہ مجھ سے آکر ملتے تو میں کہتا کہ کراچی واپس چلے جاؤ، اور معاہدے سے سخت شرطیں نکال دو۔ اس طرح تم امن وامان میں رہوگے۔ تمہارے بعد کوئی مخالف پارٹی پیدا نہ ہوگی۔ مگر افسوس وہ مکہ کی بجائے مصر چلے گئے۔ اور میرا کوئی ذریعہ ایسا نہ تھا کہ میں انھیں اپنی رائے سے مطلع کرسکتا۔ اور اگر امیر صاحب کسی ایک سی۔ آئی۔ ڈی کے چھوٹے سے چھوٹے آدمی سے بھی یہ مشورہ لیتے کہ میں ٹھیک کررہا ہوں یا نہیں تو وہ بھی مشورہ دیتا کہ آپ غلط کررہے ہیں۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ پٹھان اتنے سمجھ دار نہیں ہوتے۔

اس کے برعکس ہندوستان کے مسلم ملازمین (برطانوی حکومت کے ملازمین سی۔ آئی۔ ڈی وغیرہ) کے دلوں میں بھی اسلامی حمیت بھری ہوئی ہے۔ ایسا جذبہ ترک، عرب اور پٹھانوں میں نہیں۔ ہندی مسلمان اسلام سے کبھی غداری نہیں کرے گا۔ درست بات سمجھادے گا۔

امیر امان اللہ خاں کراچی سے سوار ہوکر مصر میں جا اُترے۔ وہاں اُن کا استقبال اور بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ مصر کا بادشاہ اور امام اور عوام بڑی محبت سے اُن سے ملے۔ یہ اُن کی تیسری غلطی تھی۔

مصر سے امیر امان اللہ خاں اٹلی چلے جاتے ہیں۔ اٹلی جانے پر اٹلی والے چھوٹے بڑے اُن کی عزت کرتے ہیں اور مسولینی جو اس وقت پریسیڈنٹ تھا اور انگریزوں کا مخالف تھا تین دن برابر تخلیے میں باتیں کرتا رہا۔ یہ چوتھی غلطی تھی۔

اگر میرا واسطہ امیر کے ساتھ ہوتا تو میں اُس کو مشورہ دیتا کہ ہر جگہ انگریزی ایڈی کانگ ساتھ رہے۔

اٹلی سے امیر صاحب فرانس جاتے ہیں اور فرانس سے انگلینڈ جاتے ہیں اور انگلینڈ کے بادشاہ سے ملاقات ہوتی ہے۔ دَورانِ ملاقات شاہ انگلینڈ امیر امان اللہ خاں سے استدعا کرتا ہے کہ معاہدۂ افغانستان میں ترمیم کرنی چاہیے۔ امیر صاحب اپنی نخوت کی وجہ سے جواب دیتے ہیں کہ افغانستان جاکر ترمیم کریں گے۔

آج تک برطانوی تاریخ میں ایسی مثال نہیں ملتی کہ شاہ انگلستان نے کسی بادشاہ سے ایسی درخواست خود کی ہو۔ امیر نے نخوت کی بنا پر غیر دانشمندانہ جواب دیا۔ میں نے اخبارات میں یہ معاملہ پڑھا تو میں نے کہا کہ امیر امان اللہ خاں کی بادشاہی کا زوال پذیر ہونا یقینی ہو گیا ہے۔

امیر امان اللہ خاں کے خشک جواب سے برطانوی قوم کے غصّے کا تھرمامیٹر بہت چڑھ گیا۔ اس کے بعد وہ سیدھا انگلینڈ سے جرمن گیا۔ وہاں ہٹلر کے ساتھ موٹروں میں سوار ہو کر پھرتا رہا۔ یہ استقبال اس کا ایسا ہی تھا جیسا کہ مصر اور اٹلی میں ہوا تھا۔ لیکن فرانس اور انگلینڈ میں نہیں ہوا۔

امیر امان اللہ خاں کے ساتھ اٹلی نے آلاتِ حرب دینے کا جتنا وعدہ کیا تھا، اس سے کہیں زیادہ آلاتِ حرب جرمن نے افغانستان کو دینے کا وعدہ کیا۔ یہاں تک کہ ابھی امان اللہ خاں سیاحت سے واپس نہیں آئے تھے کہ جرمنی کا جنگی سامان سے لدا ہوا جہاز افغانستان کے لیے کراچی بندر پر پہنچ گیا۔ جرمنی سے یہ امداد اسلحہ مفت تھی۔

امان اللہ جرمنی سے روس پہنچے۔ اس وقت ٹراٹسکی برسرِاقتدار تھا جو انگریزوں کا

مخالف تھا۔ اس سے بہت سی مخفی باتیں ہوتی رہیں۔ ان میں اسٹالن بھی شریک تھا۔ روس نے بھی بہت سا جنگی سامان افغانستان کو مفت دینے کا وعدہ کیا۔ اور روس میں وزیر خارجہ جاپان سے بھی خفیہ ملاقاتیں ہوئیں۔ جاپان اس وقت انگریز دل سے ناراض تھا۔ امیر امان اللہ روس سے ترکی میں آتے ہیں۔ اور ان کی ترکی میں بہت آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اور مصطفےٰ کمال پاشا سے اُن کی بہت ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ایک ملاقات میں امیر امان اللہ خاں نے مصطفےٰ کمال سے کہا کہ جس طرح ترکی نے ترقی کی ہے اسی طرح میں افغانستان کو ترقی دوں گا۔ جس پر مصطفےٰ کمال پاشا نے کہا کہ ترکی میں تین سو سال سے یورپ ازم چلا آرہا ہے پٹھانوں میں نہیں۔ یہ وہاں نہیں ہو سکے گا پھر ترکی سے چند ایک پروفیسر ساتھ لے کر ایران کے راستے سے افغانستان میں داخل ہوتا ہے افغانستان آکر اصلاحات شروع کر دیتا ہے اور اپنے وعدۂ ترمیم معاہدہ کو بھلا دیتا ہے۔ ایک سال تک انگریز انتظار کرتے رہے۔ برطانوی مدبروں نے اس کی اس خاموشی سے نتیجہ نکالا کہ یہ امیر امان اللہ خاں سارے جہان والوں کو ہمارے خلاف کر کے اب آرام سے بیٹھ گیا ہے۔ اب انھوں نے بھی اس کے خلاف تجویزیں شروع کر دیں۔

سردار نادر خاں، امان اللہ خاں امیر کابل کے خلاف ہو کر اٹلی میں مقیم تھا۔ اس کی وساطت سے اور پھر ملا شور بازار کے وسیلے سے افغانستان میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ برطانیہ نے امان اللہ خاں کو افغانستان سے محروم کرنے کے واسطے سردار نادر خاں کو پیسے دیئے۔ اور پہلے کی طرح پیسہ لیا دیا۔ سردار نادر خاں نے اپنے نمائندے ملا شور بازار کے ذریعہ سے شورش پسند پٹھانوں میں روپیہ تقسیم کیا۔ یہ پیسہ افغانستان میں افغانی ملک اور افغانی ملاؤں کے ذریعہ افغانستان کے عوام میں تقسیم ہوا۔

جب اعلیٰ حضرت امان اللہ خاں اپنی سلطنت کو الوداع کہہ کر ہندوستان میں آئے تو نادر خاں نے بھی اٹلی کو الوداع کہا اور کابل کی طرف چل پڑے۔ اغلب ہے کہ سردار نادر خاں اور امیر امان اللہ کے جہاز پورٹ سعید میں ملے ہوں۔ سردار

نادر خاں بذریعہ جہاز بمبئی آئے اور بمبئی میں انگریزوں کے ساتھ معاہدہ کرکے کوہاٹ چلے گئے۔ وہاں جاکر ان کو ہر قسم کا جنگی سامان مل گیا۔ بچہ سقہ کی بد عنوانیوں سے لوگ تنگ آ گئے تھے۔ کیونکہ بچہ سقہ اور اس کے ہمراہی ڈاکو تھے۔ خیر، سردار نادر خاں نے تھوڑی سی جھڑپ کے بعد افغانستان کی سلطنت حاصل کرلی۔ بعد حصول حکومت سردار نادر خاں نے امیر حبیب اللہ کی طرح کی حکومت قائم کی جس سے تمام ملک اور ملا لوگ خوش ہو گئے۔

جب میں مکہ مکرمہ میں آیا تو سردار نادر خاں اعلیٰ حضرت امیر کابل نے مبلغ ایک ہزار روپیہ مجھ کو اپنے سفیر کی معرفت پیش کیا۔ میں نے اس روپیے سے موطا امام مالک اور اس کی شرح مسوّٰی جو شاہ ولی اللہ کی تصنیف ہے طبع کرائی۔ اب حرمین کے نصاب میں یہ کتاب داخل درس ہے۔

مکہ میں آتے ہی میں نے سعودی عرب کو یقین دلایا کہ میں کانگرسی ہوں میں یہاں سعودی عربیہ میں کوئی انقلابی تحریک کا کام نہیں کروں گا۔ نجدی علما نے مجھ سے موطا امام مالک پڑھنی شروع کردی۔ انھوں نے اس درس و تدریس کے لیے کہہ دیا تھا کہ یہ میری مرضی ہے کہ میں آؤں یا نہ آؤں، آپ لوگ روزانہ ضرور آیا کریں۔

قاعدہ تھا کہ ایامِ حج میں، یعنی ذیقعد، ذی الحجہ اور محرم میں عبدالعزیز سلطان اور بڑے بڑے علما مکہ مکرمہ میں آجاتے تھے۔ ایک بار میں نے حدیث کا درس دیتے دیتے تقریر میں کہا کہ اگر سلطان عبدالعزیز میرے پاس آجائے تو میں اس کو وہ وہ تراکیب و تجاویز بتاؤں کہ اس کی سلطنت انگریزوں سے آزاد ہو جائے۔ اور یورپ کی سلطنتوں کی طرح ایک آزاد سلطنت بن جائے۔ اس پر سارے مولوی صاحبان نے سلطان عبدالعزیز سے کہا کہ وہ مجھ سے ملیں۔ اس نے کہا کہ میں مولانا سے ضرور ملوں گا۔ جب لوگوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ملنے کو تیار ہے تو میں نے کہا کہ وہ نہیں ملے گا۔ لیکن سب مولوی متفق ہو کر مجھے ٹیلیفون ایکسچینج اور لے گئے۔

ٹیلیفون کر کے انتظار کیا۔ دوبارہ ٹیلیفون کیا۔ جواب ملا آج تو مجھے کام ہے کل ملوں گا۔ دوسرے دن مولوی صاحبان نے ٹیلیفون کیا۔ وہی جواب ملا۔ تیسرے دن بھی وہی جواب ملا۔ اس کے بعد سب خاموش ہو گئے۔

ہندوستانی بڑے بڑے خصوصاً اہلِ حدیث لوگوں نے سلطان عبدالعزیز ابنِ سعود سے کہا کہ یہ مولانا عبیداللہ سندھی آپ کے پاس ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کی امانت ہے اس کو کوئی تکلیف نہ ہو۔ یہاں تک کہ مولانا عبدالقادر قصوری نے تو سلطان کو باتوں باتوں یہ سنا دیا کہ شریف حسین مکہ کو آپ نے نہیں بلکہ ہم ہندی مسلمانوں نے نکالا ہے۔ کیونکہ اس نے ہمارے شیخ الہند مولانا محمود الحسن کو گرفتار کر کے انگریزوں کو دے دیا تھا۔ اور نیز یہ بھی بتلا دیا کہ یہ مولانا عبیداللہ سندھی جناب شیخ الہند محمود الحسن صاحب کے جانشین ہیں۔ اور ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کے لیڈر ہیں۔ اس سے سلطان ابن سعود ڈر گیا۔ اور میری عزت کرنے لگا

ہمارے احباب و رفیق جو یورپ میں تھے ہماری ملاقات کے لیے گاہے گاہے مکہ مکرمہ میں آجاتے تھے۔ میں ان کی ملاقاتوں سے اکثر الگ رہتا تھا۔ اور بہت کم ملتا تھا کہ شک نہ ہو جائے۔ مصر مخملی غلاف مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے روضۂ پاک کے لیے ہر سال بھیجتا تھا۔ اب نجدیوں کے زمانے میں بھی آیا۔ اس مصری محمل کے ساتھ بینڈ دمرہ ہوتا تھا۔ اول وہ محمل عرفات پہ جاتا تھا اس کے بعد مکہ مکرمہ میں بیت اللہ شریف پر۔ جب مکہ مکرمہ میں یہ محمل آیا تو نجدی مولوی لوگوں نے پتھر مارے اور کافر کہا۔ ادھر سے فائرنگ ہو گئی۔ سلطان عبدالعزیز نے درمیان میں پڑ کر جھگڑا رفع دفع کرایا۔ لیکن مصر والے راضی نہ ہوئے اور محمل لے کر واپس ہو گئے اور آئندہ کے لیے یہ پرانی رسم ترک کر دی۔

امرت سر کے مولانا عبدالجبار غزنوی کا تعلق سلطان عبدالعزیز سے تھا اور اس کے والد سے بہت پرانے مراسم و تعلقات تھے۔ مولوی اسمٰعیل غزنوی امرت سری

سلطان عبدالعزیز ابن سعود کو اپنا چچا کہتا تھا۔ اور وہ بھی اس کو اپنا بچہ خیال کرتا۔ سلطان ابن سعود نے اس کو حکم دیا کہ ہندوستان سے بہت جلد ایسا غلاف کعبہ شریف کے لیے تیار کرائے۔ چنانچہ وہ وہ بہت جلد ہی تیار کرا کر لے گیا۔

محمد خاں کو جو خلافت تحریک ہند کا پریسیڈنٹ تھا اور اب خلافت تحریک کے ختم ہونے پر بے کار تھا مولوی اسمٰعیل اس کو بھی ساتھ لے گیا۔ محمد خاں پر غلاف کعبہ بنوانے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی محمد خاں تحریک خلافت کمیٹی کراچی کا پریسیڈنٹ تھا۔ یہ محمد خاں بہت ہوشیار آدمی تھا۔ خلافت کے زمانے میں بھی اس نے عقلمندی سے انگریزوں کے ساتھ بنائے رکھی اور خلافت سے بھی۔ یہ شخص .... میرا دلی خیر خواہ تھا۔ اور مجھ سے اس طرح ملتا تھا کہ شک تک نہ ہو اور انگریزوں سے بھی بنائے رکھی۔ حالانکہ میں انگریزوں کا سخت مخالف تھا۔

جوبندر ناتھ رائے تاشقند کے مرکز میں ہندوستانی اور افغانی جگہ میں روسی پروپیگنڈا کرنے والا تھا۔ ہمارا رفیق ظفر حسن جو اشتراکی بن گیا تھا۔ جوبندر ناتھ ناتھ کا سکریٹری بنا۔ ظفر حسن نے بڑی ایمانداری سے کام کیا۔ اور بڑے بڑے وزرأ اس سے خوش تھے۔ جوبندر ناتھ رائے کے پڑوسیوں کو شک ہوا کہ وہ انگریزوں سے ملا ہوا ہے۔ جب جوبندر ناتھ رائے کو پتہ چلا تو وہ بھاگ کر انگریزی کونسل میں چلا گیا۔ ظفر حسن سکریٹری کو بھی عتاب ہوتا۔ لیکن اس کی ایماندازی کی وجہ سے اس کو واپس کر دیا۔ ظفر حسن ایک مشہور اشتراکی تھا۔ اس کے بعد روسی حکومت کو ایک وقت پیش آئی جس کے متعلق اُن کو مجھ سے مشورہ لینا تھا۔ تو انھوں نے ظفر حسن کو مکہ بھیجا۔

ظفر حسن کا پاسپورٹ ممبئی میں بنا تھا اور جعلی تھا۔ وہ ایسے جہاز میں سوار ہوا تھا جو ممبئی سے جدہ آ رہا تھا یہ جہاز لوڈ (Load) اٹھانے والا تھا۔ یہ اس جہاز میں نکل آیا۔ دارالسلام یا عدن وغیرہ سے سوار ہوا تھا۔ اس نے عدن سے وائرلیس کے ذریعہ مولانا سندھی کو تار کر دیا۔ جب ان کو تار ملا تو وہ اس جہاز کے

آنے سے قبل ہی جدہ بندر پر آگئے۔ مولانا فرماتے تھے کہ ہم نے جہاز میں اس کو تلاش مگر وہ اس سے نہیں آیا۔ جب سب آدمی ختم ہو گئے تو ہم واپس جدہ آگئے۔ یہ ظفر حسن دوسرے دن جہاز سے اترا تو پاسپورٹ معلم کو دیا۔ معلم کو یہ پاسپورٹ دیتے ہی سیدھا موٹر پر سوار ہو کر مکہ معظمہ آگیا۔ یہ پہلے دن اُترتا تو ہم پاسپورٹ کو چاک کر کے اس کو اپنے ہمراہ لے آتے۔

جب ظفر حسن مکہ پہنچا تو مولانا صاحب کے پاس اطلاع ہوئی آپ آئے اور مل کر اس سے صرف یہ کہا کہ تم محمد خاں کے پاس چلے جاؤ۔ مولانا صاحب ہر روز محمد خاں کے ہاں جایا کرتے تھے انھوں نے ایک دن دورانِ گفتگو ظفر حسن سے کہا کہ تم مجھ سے مت ملنا۔ ایک دن دورانِ طواف اس نے اپنا مقصد بیان کیا۔ اسی دوران مولانا نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ جب وہ اپنا جواب معلوم کر چکا تو ایک دن موٹر میں سوار ہو کر روسی کونسل خانہ جدہ جا داخل ہوا۔

جب ظفر حسن انگریزوں کے دست برد سے بچ کر نکل گیا تو انگریزوں کو محمد خاں پر شک ہوا۔ کیونکہ یہ محمد خاں مولانا صاحب کا دوست، انگریزوں کا معتبر مخبر اور رنجدی کا نوکر تھا۔ مولانا صاحب فرماتے تھے کہ مجھے شک ہوا کہ ضرور مسٹر احسان اللہ وائس کونسلر برطانیہ جدہ نے محمد خاں سے یہ کہا ہو گا کہ جب یہ ظفر حسن مکہ سے باہر جائے تو اطلاع دے۔ لیکن ظفر حسن، محمد خاں کو اطلاع دیے بغیر چلا گیا۔ جس سے برطانوی نائب کونسل ناراض ہو گیا۔ اب محمد خاں اس کو خوش کرنے کی کوشش میں تھا۔ اتفاقاً فضل حسین حسرت موہانی حج کے واسطے آئے۔ مولانا صاحب سے ملے۔ آپ نے اُن کو بھی محمد خاں کے پاس ٹھہرا دیا۔ موہانی صاحب صبح کے بعد سیدھے مدینہ منورہ چلے گئے۔ مدینہ منورہ سے واپسی پر یہ خان بہادر احسان اللہ خاں برطانوی وائس کونسلر جدہ کے پاس جدہ میں جا کر ٹھہرے۔ خان بہادر صاحب کا مکان برطانوی کونسل خانہ کے قریب تھا میں ان کی ملاقات کو گیا تو معلوم ہوا کہ میری گرفتاری کی تجویزیں ہو رہی ہیں۔ یہ

سنتے ہی میرے حواس اُڑ گئے کہ ایک مسلمان انقلابی کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔ میں نے وہاں کے سکرٹری سے کہا کہ احسان اللہ خاں بہادر سے پوچھ لو تو اس نے چٹھی لکھی اور اُسے بلایا۔ وہ آگیا۔ اور اس سے رائے پوچھی کہ مولوی عبید اللہ یہاں خود آگئے ہیں۔ انھیں گرفتار نہ کر لوں۔ مکان کے درمیان صرف ایک گھنٹی ہے۔ ہم کہیں گے کہ وہ خود بخود کونسل خانے میں گھس آئے ہیں۔ خان بہادر احسان اللہ خاں نے کہا کہ وہ سیدھا سادہ آدمی ہے۔ ساری رات پاسپورٹ پاسپورٹ جپتا رہا ہے۔ اس سے جا کر پوچھتا ہوں کہ جانا چاہتا ہے یا نہیں۔ اُدھر خود بخود گرفتار ہو جائے گا۔ وہ بالکل سیدھا سادہ آدمی ہے۔ سچ سچ کہنے والا ہے۔ کونسل نے کہا کہ ہفتہ عشرہ میں پاسپورٹ دیا جائے گا۔ تو میں نے (یعنی سکریٹری) نے ناشتہ کی رخصت لے کر اِدھر آپ کو بتا دیا کہ کیا تجویز ہے۔؟ آپ کو پاسپورٹ ملے گا تو جہاز پر چڑھتے ہی گرفتار کیا جائے گا۔

پھر ہم سیدھے احرام باندھ کر مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ مولوی عبداللہ بہت انتظار میں تھے۔ انھوں نے خیر و عافیت پوچھی اور کہا کہ خیر تو گزری، ہم نے تو دیکھا کہ آپ بڑی آگ میں جا پڑے ہیں۔ آخر بچ نکلے۔ پھر میں نے کہا کہ طواف کر لوں تو باتیں بتائیں گے۔

گھر آ کر سارا قصہ رامپور رباط میں انھیں سنایا۔ اور کہا کہ اب پاسپورٹ مل جائے گا تو نجدی زبردستی کونسل خانہ برطانوی جدہ پہنچا دے گا۔ کیونکہ پاسپورٹ چاہا تھا جب ہی تو ملا۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ مولوی عبداللہ نے کہا کہ کچھ دنوں میں پاسپورٹ کا پتہ چل جائے گا۔ ہمارا خیال ہے کہ جیسے ہندوستان سے افغانستان آئے تھے اسی طرح یہاں سے بھی بھاگ نکلیں میں نے کہا کہ کیا تم بھی میرے ساتھ رہو گے! مولوی عبداللہ نے ہاں کی اور کہا۔ ہاں، ایسا ہی کیا جائے۔ پھر ہم تخلیہ میں سوچنے لگے کہ کہاں کہاں جانا چاہیئے۔ صبح کو ہم نے انھیں بتایا کہ ہم نے ایک بات سوچی ہے اگر کامیاب ہوئی تو یہاں مکہ معظمہ میں ہی رہیں گے ورنہ چلے جائیں گے۔

پھر ہم نے محمد شریف خاں سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی۔ کو بلایا جو ہر سال حج کے

موقع پر صرف ہماری جانچ پڑتا تھا کہ ہم سے کون کون ملتے جلتے ہیں۔ اس کو سارا قصہ سنایا کہ پاسپورٹ کا انتظام اسی طرح ہو رہا ہے۔ آپ کو اپنا قصہ سناتا ہوں کہ ہم نے کابل میں یہ کہا، اُس کو اور ماسکو میں یہ کیا۔

یعنی وہی قصے جو انگریزوں کو پہلے سے معلوم تھے۔ اس نے سمجھا کہ مولانا نے بالکل رازدار بنا لیا ہے۔ اور بہت خوش ہوا۔ میں نے کہا کہ ظفر حسن اس لیے آیا تھا، کہ میں باہر پھر پھرا کر بہت تنگ آ گیا ہوں اور ہندوستان واپس جانا چاہتا ہوں ہم نے اس سے کہا ہے کہ ٹھہرو ہم بھی ساتھ چلیں گے۔ ہم نے اُسے سمجھایا کہ جتنے بھی انقلابی یورپ، روس، اٹلی وغیرہ اور یہاں بھی ہیں بہت زیادہ مشکلات کا سامنا کر رہے ہیں۔ ان تمام کا خیال ہے کہ اب ہندوستان چلے جائیں۔ اِدھر جو کچھ بھی ہو، ہونے دو ہم کو ہندوستان چاہیے خواہ پھانسی ہی کیوں نہ آئے۔ پھر بھی اپنا ملک ہے۔ میرے ساتھ تقریباً دو ڈھائی ہزار انقلابی ہیں۔ اب سب تنگ ہیں۔ کونسل نے ہفتہ عشرہ کا وعدہ کیا ہے مگر میں سالانہ اٹلی کے پاسپورٹ کی تجدید کراتا رہتا ہوں اب میں اٹلی کونسل خانہ جاتا ہوں وہاں سے پاسپورٹ بنوا لوں گا اور سیدھا اٹلی جا کر یورپ میں رہتے ہوئے وہاں کے سب انقلابیوں کو جمع کر کے اور روس جا کر وہاں کے ہندوستانی انقلابی لوگوں کو اکٹھا کروں گا اور روس کے راستے افغانستان جاؤں گا اور وہاں سے ہندوستان میں جا رہوں گا۔ وہاں سب کے لیے پھانسیاں تیار ہوں گی اور ہم سب کو پھانسی پر لٹکایا جائے گا پھر اعلیٰ حضرت امیر نادر خاں اپنے باپ کا بیٹا ہی نہیں جو توپ سر نہ کرے۔ ایسے ہی روس بھی نہیں کہ جنگ میں شریک نہ ہو اور اٹلی بھی بے ایمان نہیں کہ اپنی ساری طاقت سے شریک جنگ نہ ہو۔ اتنی عالمگیر جنگ کی انگریزوں میں طاقت ہے تو ہم آج ہی بند و بست کرنے جا رہے ہیں۔ تمھارے لیے یہی اطلاع ہے۔ نہیں تو میں یہاں آرام سے بیٹھا ہوں۔ نہ کسی سے ملتا ہوں اور نہ کسی سے کوئی تعلق ہے۔

اس نے کہا کہ میں جا کر کونسل کو سمجھاتا ہوں۔ نہیں سمجھا تو ایک دن کی

مہلت دو۔ میری بات سمجھ جائے گا۔ ورنہ ان کے حکم سے بھی آپ کے پاس کبھی نہیں آؤں گا۔

محمد شریف خاں اسی دن جدہ چلا گیا اور دوسرے دن آکر کہا کہ آپ آرام سے بیٹھے رہیں۔ میں انھیں سمجھا آیا ہوں کہ ایسی بلا کو مت چھیڑو۔

ریشمی خطوط کا قصّہ

اس سے پہلے اشارۃً ذکر کیا جا چکا ہے۔ مگر اب تفصیل سے لکھتے ہیں۔

مولانا سندھیؒ نے مجھے (مولوی عبداللہ) اور فتح محمد کو کابل سے پاسپورٹ دلوایا کہ تم قندھار ہوتے ہوئے ہندوستان جاؤ۔ اور راجہ مہندر پرتاب کے بہت سے خطوط ہم کو دیے تاکہ مولوی احمد علی لاہوری کی وساطت سے جو اس وقت نظارت المعارف دہلی میں پڑھاتے تھے۔ یہ خطوط شردھانند پریسیڈنٹ آریہ سماج کے نام تھے تاکہ وہ راجہ مہندر پرتاب کے بھائی اور ماموں کو دے دیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے کاغذوں پر لکھے ہوئے خطوط بہت تھے۔ ہم نے بوساطت پنج صدہ جو صوفی جان محمد کا مرید تھا سرحد ہندوستان عبور کیا۔ اسٹیشن بوستاں سے ریل پر سوار ہوئے۔ فتح محمد عرف عبدالرحمٰن کے پاس خط نہ تھے۔ وہ بوستان سے سیدھا کوئٹہ چلا گیا۔ خطوط میرے پاس تھے میں بوستاں سے شارکو کے راستے سے سوئی پہنچا۔ پھر میں نے آگے ولہار کا ٹکٹ لیا جو ریاست بھاولپور میں ہے۔ بھار کے قریب بندور ایک مقام ہے جس میں فاضل خاں داد اپوترا بڑا رئیس ہے۔ وہاں جا پہنچا اسٹیشن ولہار سے میں نے مولوی احمد علی لاہوری کو جو اس وقت نظارت المعارف دہلی میں کام کر رہے تھے تار کے ذریعہ خبر دی کہ میرے پاس چلے آئیں۔ وہ آگئے۔ میں نے اُن کو خط پہنچا دیے اور ایک پونڈ سفر خرچ بھی دیا۔ انھوں نے خطوط شردھانند کو پہنچا دیے۔ پھر میں وہاں سے آکر خان پور اسٹیشن کے قریب اپنے پیر و مرشد ابوالسراج غلام محمد قدس سرہٗ کی جماعت میں آکر بیٹھ گیا۔ یہ واقعہ فروری۔ اپریل سنہ ۱۹۱۶ء کا ہے۔

میں نے خط کے ذریعے مولانا عبید اللہ کو کابل میں خبر دی۔ جب میں کابل ..... روانہ ہوا تو اس وقت مشورے ہو رہے تھے کہ ایک وفد روس بھیجیں۔ اور وفد بھیج دیا گیا۔ اس کا ذکر قبل ہو چکا ہے۔ وفد کامیاب ہوا۔ اس کے بعد مولانا کے حوصلے بڑھ گئے۔ انھوں نے لکھا کہ خطوط شیخ عبدالحق کو پہنچا دینا۔ اس میں ایک خط حضرت تاج محمود علیہ الرحمہ کے نام تھا جو بڑے کامل صوفی تھے۔ دوسرا خط ابوالسراج غلام محمد کے نام تھا جو کامل ولی تھے۔ تیسرا خط پیر رشد اللہ پیر جھنڈے والے کے نام تھا۔ ان خطوط میں تھا کہ آپ جہاد کے لیے امیر حبیب اللہ کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ .....

ہم نے پیر جھنڈے والے کو خط روانہ نہ کیا۔ اور ایک خط اللہ نواز خان نے اپنے باپ کو لکھا تھا تو شیخ عبدالحق نے کہا کہ اب خطوط پہنچ گئے اور میں واپس جاتا ہوں۔ اور اللہ نواز کے پاس حق نواز کو خط دوں گا۔ اور میں سیدھا کابل چلا جاؤں گا۔ میرے نام .... کا جو خط تھا کہ یہ ریشمی خطوط شیخ عبدالرحیم حیدر آبادی کو دو۔ اور ان کو تاکید کرو کہ خود مکہ مکرمہ جائے یا کسی معتمد حاجی کو دے تاکہ یہ ریشمی خطوط مولانا شیخ الہند کو پہنچ جائیں، تو واقعہ اس طرح ہوا تھا کہ جب میں دین پور میں تھا تو.... اتفاقاً تیسرے دن شیخ عبدالحق نومسلم واپس دین پور آگئے اور مجھ سے کہا کہ وہ ریشمی خطوط مجھ کو دو تو میں شیخ عبدالرحیم حیدر آبادی کو پہنچا دوں۔ ان کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریشمی خطوط خان بہادر حق نواز کو دکھانا چاہتا ہے۔ میں نے ریشمی خطوط دینے سے انکار کر دیا۔ مجھ کو شک ہو گیا۔ پھر تو یہ معاملہ مولوی عبدالقادر دین پوری کو پیش ہوا۔ انھوں نے بھی یہی کہا کہ اس کو خط نہ دینے چاہئیں۔ پھر اس (عبدالحق) نے حضرت دین پوری کی خدمت میں عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ یہ خطوط مجھ کو دے دیں تاکہ شیخ عبدالرحیم کو پہنچا دوں۔ پھر سندھ کے راستہ سے کوئٹہ اور کابل چلا جاؤں۔ حضرت صاحب نے فیصلہ کیا کہ جب مولانا عبید اللہ نے اس پر اعتماد کیا ہے تو تم لوگ کیوں اعتماد نہیں کرتے۔ میں نے عرض کیا کہ اس کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط خان بہادر حق نواز کو دکھانا چاہتا ہے۔

وہ سرکاری وفادار ہے۔ ہم آپ سارے برباد ہو جائیں گے۔ حضرت صاحب نے شیخ عبدالحق کو بلایا اور اس سے پوچھا کہ کیا تم یہ خطوط حق نواز خاں کو دکھانا چاہتے ہو۔ اس نے کہا نہیں جناب، میں تو یہ خطوط شیخ عبدالرحیم کو دے کر قندھار کے راستے سے کابل چلا جاؤں گا۔ آخر حضرت صاحب نے اس سے قسم لی کہ یہ خطوط کسی کو نہیں دکھانا۔ پھر ہم کو حکم دیا کہ خطوط اس کو دے دو۔ اور فرمایا کہ مجھ کو اعتماد ہے۔ یہ کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ پھر مولوی عبدالقادر کو جن کے پاس ریشمی خطوط تھے، حکم دیا کہ جیسے پہلے صدری میں بند تھے ویسے ہی تم بھی بند کر کے اس کو دے دو۔

مجھ سے شیخ عبدالحق نے کہا کہ تم اپنی کارگزاری لکھ دو کہ تم جو خطوط لائے تھے وہ کس کس کو دیے۔ میں نے ساری کارگزاری لکھ دی۔ حضرت صاحب نے سفر خرچ اس کو دیا تاکہ کابل واپس ہو جائے۔

میں اور صاحب زادہ عبدالہادی شیخ عبدالحق کے ساتھ رات کو خان پور جانے والی گاڑی کے لیے اسٹیشن پر گئے۔ اور حیدر آباد کا ٹکٹ خرید کر اس کو دیا اور گاڑی پر سوار کر دیا۔ ہم کھڑے تھے تاکہ گاڑی پلیٹ فارم سے چلی جائے اور ہم واپس دین پور چلے آئیں۔ ہمارے آنے پر حضرت صاحب نے پوچھا کہ ٹکٹ حیدر آباد کا دلا دیا۔ ہم نے کہا ہاں جناب۔ لیکن یہ شیخ عبدالحق رحیم یار خاں کے اسٹیشن پر اتر کر واپس ملتان چلا گیا۔ اور حق نواز خان بہادر کی خدمت میں جا پہنچا۔ اور ہم کو کوئی خبر نہ تھی۔ ہم تو یہی سمجھتے رہے کہ حیدر آباد سے ہوتے ہوئے کابل چلا گیا ہے۔ پھر عبدالقادر دین پوری کو چار پانچ دن کے بعد حکم دیا کہ سید تاج محمود امروٹی سے بعیت نامہ لکھواؤ۔ اور جلد واپس آنا۔ پھر آپ نے بھی بعیت نامہ لکھ دیا۔

ایک پٹھان جو حضرت صاحب کا مرید اور معتمد تھا کابل جانے لگا تو دونوں بعیت نامے اس کے حوالے کیے کہ تم جا کر مولوی عبدالرزاق خاں وزیر عدالت کو دے دینا۔ اس نے شاید پہنچا دیے۔ شیخ عبدالحق تقریباً مئی ۱۹۱۶ء میں آئے تھے۔

پھر مئی، جون، جولائی، اگست کے ایام تھے ایک دن عشاء کی نماز کے بعد حضرت صاحب کو خبر ہوئی کہ لاہور سے بڑی بڑی فوج آگئی ہے کہ مولوی عبداللہ کو گرفتار کرے تو آپ نے مجھ کو حکم دیا کہ تم نکل جاؤ کہ تمھاری گرفتاری کے لیے آرہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بیعت نامے ان کے ہاتھ آگئے ہیں۔ اور بیعت نامے میرے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اگر میں چلا جاؤں تو آپ اور مولوی عبدالقادر گرفتار ہو جائیں گے۔ لیکن حضرت صاحب نے مجھ کو جانے کا حکم دیا۔ میں نے باہر جاکر مولوی عبدالقادر کو کہا کہ میں فلاں جگہ جاکر چھپ جاتا ہوں۔ اگر میری ضرورت پڑے تو مجھ کو بلا لینا۔ صبح کی نماز کے بعد ریاست کا سپرنٹنڈنٹ پولیس اپنے عملہ کے ساتھ اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ سی۔ آئی۔ ڈی۔ عبدالحکیم اپنے لشکر کے ساتھ دین پور پہنچ گئے۔ پہنچتے ہی حضرت صاحب کو ایک جگہ بٹھا دیا۔ اور ان پر پولیس مقرر کر دی۔ اور مولوی عبدالقادر دین پوری کو کہا کہ مولوی عبداللہ کو پیدا کر دو۔ ورنہ تم دونوں گرفتار ہو۔ مولوی عبدالقادر نے کہا بیشک میں بتا دیتا ہوں چلو۔ جہاں میں چھپا ہوا تھا وہاں آئے اور مجھ کو گرفتار کر لیا۔ میں جس کوٹھری میں بیٹھا تھا وہاں لے گئے اور کہا کہ پیر جھنڈے والے کا خط دیدو۔ تم کو معافی ہے۔ اور سید تاج محمود کا خط بھی دے دو۔ اور کہا کہ شیخ عبدالحق گرفتار ہے۔ اس نے کہا ہے کہ یہ دونوں خط میں نے مولوی عبداللہ کو دیے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں نے دونوں خط جلا دیے۔ ان لوگوں کو نہیں پہنچائے۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ لوگ ایسے آدمی سے کہہ دیں گے جس سے بات سرکار تک پہنچ جائے گی۔ پھر مجھ کو گرفتار کیا اور بزرگ دین پور والوں کو اور مولوی عبدالقادر کو کہا کہ آپ صرف اسٹیشن پر چلیں۔ لیکن مولوی عبداللہ کو بھاولپور لے جانا ہے۔ ادھر مغرب کی نماز ہم نے خان پور کے اسٹیشن پر پڑھی۔ مجھ کو ہتھکڑی لگا کر خان پور کی جیل میں بند کر دیا۔ صبح کو کراچی سے گاڑی آئی تھی۔ میں جب اسٹیشن پر پہنچا تو دیکھا کہ وہ دونوں مذکور الصدر صاحبان بھی اسٹیشن پر تھے۔ اور ان کو سکینڈ کلاس ڈبے میں بٹھایا۔

لطیفہ :- جب مجھ کو اپنی کوٹھری میں لے آئے جو مسجد کے متصل تھی تو ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ عبد الحکیم نے کوٹھری کی تلاشی کا حکم دیا۔ جب وہ میرے کپڑوں کی تلاشی لے رہے تھے تو میری پگڑی اتار کر باہر پھینک دی۔ میں نے بھی جھپٹ کر عبد الحکیم کی پگڑی اتار لی اور اس کو باہر پھینک دیا۔ اس نے کہا یہ کیا۔ میں نے کہا۔ میں نے بھی تلاشی لی ہے۔ اس واقعے کے بعد مجھ کو بہت تکلیف ہوئی۔ مجھ کو جدا کر دیا، اور باقی حضرت صاحب اور مولوی عبد القادر ساتھ تھے۔ پھر گاڑی چلی اور سیدھی لاہور آئی۔ وہاں ہم کو اتار کر کال کوٹھری میں بند کر دیا۔ مجھ کو جو نان بائی روٹی کھلاتا تھا اُس نے کہا تمھارے دو رفیق فلاں جگہ بند ہیں۔ اور اُن سے بیان لیے ہیں (وہ روٹی کھلانے والا اُن کو بھی روٹی کھلاتا تھا) اور سنتری نے کہا کہ تمھارے کابل کے چار رفیق گرفتار ہو کر سنٹرل جیل لاہور میں آ گئے ہیں۔ میں نے نام پوچھے تو کہا کہ مولوی عبد الباری اور ڈاکٹر شجاع اللہ۔ میں نے کہا اور کون ہیں؟ کہا مولوی احمد علی۔ میں حیران ہو گیا کہ مولوی عبد الباری کیسے آ گئے۔ میں نے پوچھا مولانا عبید اللہ گرفتار ہوئے؟ کہا نہیں وہ گرفتار نہیں ہوئے۔

حضرت صاحب سے بیان لے کر ان کو سنٹرل جیل میں بھیج دیا۔ اور ان دونوں کو بھی جدا جدا کر دیا۔ پھر مجھ سے بیان لیا۔ سوائے اقبال کے کوئی چارہ نہ تھا۔ کیونکہ میرے دستخط تھے۔ ایک مہینے تک سنٹرل جیل میں رہے۔

حضرت دین پوری کی حالت

جیل خانوں میں روٹی ہندو بناتے ہیں اور حضرت صاحب ہندو کے ہاتھ کا کھانا نہیں کھاتے تھے۔ صبح کو چھولے (بھُنے چنے) ملتے تھے۔ وہ اسی پر گزران کرتے تھے۔ اور روٹی دونوں وقت کی قیدیوں کو دے دیتے تھے۔ اس طرح ایک مہینہ سنٹرل جیل لاہور میں رہے۔ اس کے بعد ہم لوگوں کو جو جدا جدا تھے نظر بندی کے لیے باہر لے گئے۔ مجھ کو پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور میں نظر بند کر دیا۔ حضرت صاحب کو نور محل

تحصیل جالندھر کے ضلع میں نظر بند کیا۔ اور مولوی عبدالقادر صاحب دین پوری کو شہر سرسہ میں بند کر دیا۔ حضرت صاحب اپنی روانگی کے متعلق فرماتے ہیں کہ مجھ کو لاہور کے اسٹیشن پر لے گئے تاکہ جالندھر کو لے جائیں۔ اسٹیشن پر انھوں نے میرے اور اپنے لیے روٹی خریدی۔ دو پولیس والے تھے۔ دونوں مسلمان تھے۔ مسلمان نان بائی بھی قریب تھا۔ مگر انھوں نے جا کر ہندو سے خریدی۔ میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے روٹی نہیں کھائی اور وہ کھا گئے۔ اور شام کے وقت بھی ایسا اتفاق ہوا کہ انھوں نے ہندو سے خریدی اور مجھ کو جالندھر کے قید خانہ میں بند کر دیا۔ قدرت سے جیل میں روٹی پکانے والے اور تقسیم کرنے والے ہندو تھے اور صبح کو بھی وہ ہندو ہی پکاتے تھے۔ لیکن میں نے نہیں کھائی۔ پھر مجھ کو قید سے نکالا اور پیادہ چلانے لگے۔ آٹھ بجے صبح کا وقت تھا۔ اتنے دن جو روٹی نہیں کھائی تھی اس لیے چلنے سے پاؤں جواب دے رہے تھے۔ لیکن ناچار عصا کے زور پر چلتا رہا۔ راستے میں جا رہے تھے کہ ایک شخص نے آکر مصافحہ کیا چار آنے میرے ہاتھ پر رکھے۔ میں نے لے لیے۔ نفس نے کہا اس سے روٹی خرید لو۔ میں نے کہا تم کو روٹی کھلاؤں گا۔ یہ حضرت صاحب کے الفاظ ہیں۔ عین دوپہر کے وقت ہم نور محل پہنچے۔ نور محل ایک تحصیل کا نام ہے۔ وہاں نور جہاں نے اپنا محل تیار کیا تھا۔ اس لیے اس شہر کا نام بھی نور محل ہو گیا۔ پھر فرماتے ہیں کہ مجھ کو انسپکٹر پولیس کے پاس لے گئے۔ اس نے مجھ کو ہدایات دیں کہ نور محل کی میونسپل اراضی میں آپ گھوم پھر سکتے ہیں شہریوں سے مل جل سکتے ہیں۔ مگر باہر سے آنے والے سے ملاقات نہیں کر سکتے۔ آپ آزاد ہیں۔ پھر مجھ کو حکم ہوا کہ جا کر شہر میں کوئی جگہ تلاش کر کے اس میں رہنا شروع کریں۔ پھر فرماتے ہیں کہ میں تھانے سے باہر نکلا دیکھا کہ ظہر کا وقت آگیا ہے۔ تھانہ کے قریب مسجد تھی۔ میں نے وضو کرنا شروع کر دیا۔ اور جو چار آنے مجھ کو ملے تھے دیوار کی سوراخدار جگہ میں رکھ دیے۔ پھر میں نے وضو شروع کیا تو ایک شخص آیا اور کہا کہ میں بھوکا ہوں۔ میں نے چار آنے والی جگہ کی طرف اشارہ کیا اور وہ لے کر چلا گیا۔ فرماتے ہیں کہ نماز سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو دروازے پر پولیس کا سپاہی کھڑا تھا۔ کہا کہ آپ کو

انسپکٹر صاحب بلاتے ہیں۔ میں سمجھا کہ شاید کوئی کام ہوگا۔ انسپکٹر دتی کا سید تھا سپاہی مجھ کو تھانے کی طرف نہیں لے گیا بلکہ ان کے بنگلے کی طرف لے گیا۔ انسپکٹر نے مجھے اندر بلایا۔ میں اندر گیا تو طعام حاضر کیا اور کہا کہ میں نے سمجھا ہے کہ آپ سوئی نہیں کھاتے ہیں۔ میں نے بلایا ہے کہ آپ روٹی کھائیں۔ وہ خود بھی میرے ساتھ روٹی کھانے لگے میں نے دیکھا کہ اس کے قلب پر رقت طاری ہوگئی۔ پھر طعام کھانے کے بعد اس نے اور اس کی عورت نے استدعا کی کہ ہم کو اللہ کا ذکر بتاؤ۔ حضرت صاحب فرماتے ہیں میں نے کہا کہ میں تو ایک قیدی ہوں۔ ذکر فکر کی کیا بات پوچھتے ہو۔ انھوں نے کہا کہ ہم کو معلوم ہے کہ آپ کون ہیں۔ اور خدا کا نام لیا۔ آپ کی سوانح عمری ہم کو پہلے پہنچ چکی ہے۔ مہربانی کر کے ذکر کی تلقین کریں۔ پھر میں نے تلقین کی۔ تلقین کے وقت ان دونوں پر جذبہ طاری ہوگیا۔ بہت روئے۔ پھر میں نے اجازت طلب کی تو انسپکٹر صاحب نے اٹھ کر ایک گٹھڑی رومال میں بندھی تھی تقریباً سو روپے تھے نذرانہ کے طور پر پیش کی۔ حضرت صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے لے لی۔ ہاتھ میں لے کر میں نے کہا کہ تلقین کا معاوضہ مناسب نہیں۔ اگر میں لے لوں گا تو آپ کو فائدہ ہوگا نہ مجھ کو۔ اصل بات یعنی جذبۂ محبت ختم ہو جائے گا۔ فرماتے ہیں کہ انسپکٹر عقل مند تھا۔ میں نے اس کو روپے واپس دیے اور اس نے لے لیے۔ پھر اس نے چارپائی بستر وغیرہ سپاہی کو دے کر کہا نور محل کے فلاں کمرے میں ان کو جگہ دو اور پان وغیرہ بہم پہنچاتے رہنا میں ادھر چلا۔ اس نے کمرہ کھولا جو بڑا ہال تھا۔ اس میں مجھ کو ٹھہرایا۔ دو چار گھنٹہ کے بعد انسپکٹر صاحب میرے کمرے میں آئے۔ کہنے لگے کہ میں نے لاہور کے بڑے افسر کو تار دیا تھا کہ اتنا بڑا آدمی تم نے نظر بند کیا ہے اس کی خوراک کی کیا ذمہ داری ہے۔ اس نے تار کے جواب میں کہا کہ اس کے لیے پندرہ روپیہ ماہوار ہیں۔ میں نے یہ روپے لے لیے۔ پھر جمعہ کے دن ...... میں جامع مسجد میں گیا۔ نور محل کے لوگ بہت سے مرید ہونے لگے۔ میری روٹی کا بندوبست پولیس مین کرتا تھا۔ ایک روز میں نور محل سے باہر نکل کر سیر کو گیا۔ راستے میں میں نے طور شاہ کو دیکھا جو میرا بہت

مخلص مرید تھا وہ دین پور میں رہتا تھا۔ شغل اشغال بہت کرتا تھا۔ بڑے مقامات اس کو حاصل تھے۔ مجھ کو دیکھ کر بہت رونے لگا۔ میں نے کہا خاموش رہو۔ روؤ نہیں۔ جاؤ انسپکٹر سے کہو کہ میں روٹی پکانا جانتا ہوں مجھ کو کام پر لگاؤ۔ انسپکٹر اس کو میرے پاس لے آئے۔ اور کہا کہ اس کو رکھ لو روٹی پکانے کا کام کرتا ہے۔ پھر تو جماعت بن گئی اور ایسا حظ آنے لگا جیسا دین پور میں تھا۔ ذکر اذکار کا حلقہ ہو گیا۔ بعض اوقات ایسی حالت طاری ہو جاتی تھی کہ میں دین پور میں بال بچوں کو دیکھ لیتا تھا۔ اور ان کا جو قلق تھا وہ ختم ہو جاتا تھا۔

فرماتے تھے کہ جب ہم سنٹرل جیل لاہور میں تھے تو ایک شخص نے کہا تمھارا ایک رفیق پھانسی پر چڑھ گیا۔ میں نے سمجھا کہ ہو نہ ہو مولوی عبداللہ ہے۔ آپ کے لیے بہت توجہ کرتا رہا۔ اور میں اُس وقت پٹھان کوٹ میں تھا۔ اور مجھ پر اس وقت ایسی حالتیں طاری ہو جاتی تھیں کہ بیان سے باہر ہیں۔ ہم تینوں کو ایک مہینہ نظر بند رکھ کر واپس دین پور لائے اور حکم دیا کہ تم دین پور میں نظر بند رہو۔ ہم اپنے گھر دین پور میں واپس آ گئے۔ ریاست بہاول پور کا پریسیڈنٹ مولوی رحیم بخش خان تھا۔ اس نے لاہور کے بڑے افسر کو لکھا کہ مولوی عبداللہ سندھی ہے۔ بہاولپور کا باشندہ نہیں ہے۔ اس لیے اس کو اپنے وطن میں نظر بند کرو۔ اس خط وکتابت کا یہ نتیجہ نکلا کہ مجھ (مولوی عبداللہ) کو دین پور سے نکال کر کراچی جیل میں نظر بند کیا۔ اور سات روپیہ مہینہ مقرر کیا کہ جیل کے اندر جو چاہو کھاؤ پیو۔ ایک سال تک میں کراچی جیل میں نظر بند رہا۔

اس کے بعد ایک روز مجھ کو سپرنٹنڈنٹ نے بلایا کہ مولوی رحیم بخش خاں پریسیڈنٹ ریاست بہاول پور اپنی ذاتی ضمانت پر تم کو پھر واپس دین پور میں رکھنا چاہتے ہیں کیا تم کو منظور ہے؟ پھر مجھ کو واپس دین پور لائے۔ پھر جنگ ۱۹۱۸ء ختم ہوئی تو اس کے ایک مہینے کے بعد ہم کو آزادی کا حکم مل گیا۔ میں پھر حضرت صاحب سے رخصت ہو کر اپنے گھر سانگھڑ آیا۔ ریشمی خطوط کا قصہ ختم ہوا۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ عَثَرَاتِنَا وَخَطَایَانَا وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ!

کراچی جیل میں میرے وارڈ کے قریب مسٹر نن گوپال گجران والے جو بڑے انقلابی تھے، دس سال کے لیے قید تھے۔ چونکہ میرے وارڈ کے قریب رہتے تھے اس لیے آپس میں باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ جب میں نے مولوی رحیم بخش خاں کی ذاتی ضمانت کی اس کو خبر دی تو مسٹر نن گوپال کہنے لگے کیا آپ گجران والے جاسکیں گے؟ میں نے کہا نہیں۔ میں نے پوچھا کیا کام تھا۔ اس نے کہا کہ میں نے آج اخباروں میں پڑھا ہے کہ مولانا حسرت موہانی گرفتار ہو گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ آپ کو پیغام دوں تاکہ میرے بھائی کو کہو کہ تین ہزار روپیہ حسرت موہانی کی عورت کو پہنچا دیں کہ وہ بے چاری عورت کہاں سے خرچ چلائے گی۔ اور کہنے لگا کہ ہم بڑے دولت مند ہیں اور مسٹر حسرت موہانی جیسے وطن دوست تھوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے معذوری کا اظہار کیا کہ میں ایک پریسیڈنٹ ریاست کی ذاتی ضمانت پر جا رہا ہوں۔ ان سے میری کوئی شناخت نہیں۔ شاید انھوں نے اللہ واسطے مجھ کو نجات دلائی ہے۔ اگر کسی طرح گورنمنٹ کو خبر ہو گئی تو وہ مصیبت در مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ اس لیے میں معذور ہوں۔ انقلابی لوگ ایثار اور وطن کی محبت میں سرشار ہوتے ہیں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ختم شد

مولانا عبداللہ لغاری مرحوم کے حالات[1]

عبداللہ بن نہال خاں، بن محمد خاں بن رستم خاں بن فتح محمد خاں لغاری ۱۲۸۸ھ (۱۸۷۱ء) میں بمقام "داد لغاری" تحصیل میرپور ماتھیلا (سندھ) پیدا ہوئے۔ اپنے پھوپھی زاد بھائی مولوی محمد یعقوب سے صرف کی کچھ کتابیں پڑھیں۔ صرف کی بقیہ کتابیں اور نحو کی کچھ کتابیں "گوٹھ پنھواری" میں مولوی عبدالقادر سے پڑھیں۔ اس کے بعد "نوشہرہ فیروز" میں قاضی محمد عالم، قاضی عبدالرزاق، قاضی عبدالحفیظ اور مولوی فیض الکریم کے یہاں تعلیم حاصل کی اور سندھ کے مشہور حکیم شمس الدین احمد صاحب (سلمہ اللہ تعالیٰ) کے چچا مولوی عبدالکریم بن مولوی محمد عثمان (جو حافظ حدیث تھے اور علامہ شوکانی کے شاگرد تھے) تعلیم پائی۔ پھر موقع ملا تو مقام "ڈبھرہ" کے قریب مخدوم غلام محمد بن مخدوم حبیب اللہ سے مستفیض ہوئے۔ اسی مقام کے قریب ایک گاؤں "تگون" ہے وہاں ایک صوفی اور مشہور خطاط مولوی عبدالقدوس تھے۔ ان سے بھی فیض حاصل کیا۔ پھر کراچی میں مولانا محمد صادق کے والد مولانا عبداللہ سے بھی کچھ کتابیں پڑھیں۔ اس کے بعد ٹھٹھا کے مشہور عالم مولانا محمد علی مرحوم کے بعض شاگردوں سے بھی استفادہ کیا۔ اور گھر واپس آئے تو مولوی محمد امین ناراض ہوئے کہ تم نے سیر و سیاحت میں اپنا وقت ضایع کیا ہے اب ملتان جاؤ۔ چنانچہ یہ ملتان کے مشہور محدث مولانا سلطان محمود کے پاس ایک سال تک علم حدیث حاصل کرتے رہے۔ پھر بھاول پور میں "صاحب السیر" کی خانقاہ میں مولوی عبدالرشید سے تعلیم حاصل کی۔ اور کچھ دن مولوی محمد عاقل سے بھی مستفیض ہوئے۔ پھر مولوی الٰہی بخش لانگاہ منطقی عمرپوری سے حدیث، فقہ اور منطق کی آخری کتابیں پڑھیں اور سلسلۂ تعلیم ختم ہوا۔ وطن واپس آئے تو ۱۳۱۶ھ (۱۸۹۸ء) میں شادی ہوئی۔ اس کے بعد "امروٹ" میں مولانا عبیداللہ سندھیؒ سے ملاقات ہوئی اور ان کی انقلابی سیاست میں رفیقِ کار بن گئے۔ مولانا کے نظریات کے نشر و اشاعت کے لیے

---

[1] یہ حالات جناب حافظ محمد صاحب (اسسٹنٹ لائبریرین۔ سندھ یونیورسٹی) سے حاصل کیے گئے ہیں۔ جنھوں نے سندھی ادبی بورڈ کے رسالہ مہران کے "سوانح حیات نمبر" (مطبوعہ حیدرآباد، ۱۹۵۷ء صفحہ ۲۷۰-۲۶۹) اصل مضمون بعنوان "مولوی عبداللہ لغاری" از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ) سے بہت کچھ اخذ کیے تھے۔

امروٹ میں ایک مدرسہ اور ایک پریس بھی قائم کیا اور ایک رسالہ "ہدایت الاخوان جاری کیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی گوٹھ "پیر جھنڈا" میں وہاں کے پیر صاحب کی حمایت سے ایک مدرسہ "دارالرشاد" قائم کیا۔ مولانا عبداللہ اس کے مہتمم مقرر ہوئے۔ اس طرح وہاں ان دونوں بزرگوں کو ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) سات سال تک طلبہ میں "ذہنی بیداری" پیدا کرنے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن علیہ الرحمہ نے مولانا عبیداللہ اور مولانا محمد صادق کو طلب کیا اور سیاسی زندگی میں حصہ لینے کی دعوت دی۔ مولانا عبداللہ بھی ساتھ گئے تھے۔ وہ بھی متاثر ہو کر واپس آئے اور شیخ الہندؒ کے مشورے کے مطابق ۱۹۱۴ء تک اس مدرسے کا انتظام سنبھالتے رہے۔ لیکن اسی سال مولانا عبیداللہ وہاں تشریف لائے اور "کابل" چلنے کے لیے فرمایا۔ چنانچہ ۱۹۱۵ء میں ان کے ساتھ کابل گئے۔ اور مولانا عبیداللہ کے رفیقِ کار اور معتمدِ خاص بن کر رہے۔

تقریباً دو سال بعد مولانا عبیداللہ نے ان کے ہاتھ اپنے اور راجہ مہندر پرتاب کے چند خصوصی خطوط بھیجے کہ وہ ہندوستان میں مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم محمد اجمل خاں وغیرہ کو پہنچا دیں۔ نیز یہ کہ دین پور، امروٹ اور پیر جھنڈا والے بزرگوں سے ایک عبارت پر (جو کہ ان کو قلم بند کرا دی تھی) دستخط لے کر انگریزوں کے خلاف جہاد کی اجازت لیں۔ مولانا عبداللہ نے دونوں کام کیے اور اجازتیں لے کر سردار عبدالرزاق (میزان العلماء) کو کابل روانہ کر دیں۔

"ریشمی خطوط" والے واقعے کے سلسلے میں مولانا عبداللہ صاحب اور چند رفقاء گرفتار کیے گئے۔ لیکن مولانا کے بیان سے وہ رفقاء بعد میں رہا کر دیے گئے۔ اور خود مولانا دو سال تک لاہور، پٹھان کوٹ، دین پور اور کراچی وغیرہ کی جیلوں میں نظر بند رہے۔ اور پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر رہا کیے گئے۔ اور جب انگریزوں کے خلاف امیر امان اللہ خاں (والیِ کابل) برسرِپیکار ہوئے تو مولانا عبداللہ کو ان کے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ کیونکہ اس جنگ کے محرک مولانا عبیداللہ سندھی ہی تھے۔ جن کے یہ رفیق تھے۔

۱۳۴۵ھ (۱۹۲۶ء) میں مولانا عبیداللہ سندھی مکہ معظمہ پہنچے۔ بعد میں مولانا عبداللہ لغاری بھی یہاں سے اُن کی خدمت میں پہنچے۔ مولانا سندھی نے تفسیر قرآن، علومِ اسلامیہ

اور فلسفۂ شاہ ولی اللہؒ پر جو تقریریں کیں وہ سب مولانا عبداللہ نے قلم بند کیں۔ بلکہ جتنی کتابیں مولانا سندھی کی افکار اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے فلسفے سے متعلق شایع ہوئی ہیں، ان سب کا مواد درحقیقت مولانا عبداللہ ہی کا جمع کردہ تھا۔ ۱۹۳۹ء میں مولانا سندھیؒ واپس تشریف لا رہے تھے تو بعض انتظامات کی خاطر مولانا عبداللہ ان کے آنے سے پہلے سندھ پہنچ گئے۔ اور ان کے آخری دم تک ساتھ رہے۔ مولانا سندھی کی وفات کے کچھ عرصہ بعد تقریباً چھ سال سندھ یونی ورسٹی کے بعض استادوں اور شاگردوں کو قرآن پاک کی تفسیر و حکمت سمجھانے کے لیے یونی ورسٹی میں وہ ڈاکٹر بلوچ صاحب اور ڈاکٹر ہالی پوتہ صاحب کے یہاں مقیم رہے۔ اور وہاں سے قرآن شریف اور حکمت ولی اللّٰہی کی تعلیم جاری رکھی۔ آخر میں سندھ یونی ورسٹی میں ایم۔ اے۔ کے طلبہ کو تفسیر پڑھانے کے لیے معلم مقرر ہوئے[۱]۔ لیکن جلد ہی اچانک ۱۳ر ستمبر ۱۹۵۸ء کو پیشاب بند ہوا تو ۱۵ر ستمبر کو سول ہسپتال حیدر آباد میں داخل ہونا پڑا۔ ۱۷ر ستمبر بروز چہار شنبہ ان کا آپریشن ہوا۔ حافظ محمد صاحب سے فرمایا کہ "دمے چند خوردیم و گفتیم و بس"۔ اس کے بعد والی شب یعنی شبِ پنجشنبہ (۴ر ربیع الاول ۱۳۷۸ھ) کو ۱۱ر بجے انتقال فرمایا۔ اور اسی روز شام کو سانگھڑ میں دفن ہوئے۔ آخری ۳-۴ سال میں محترم ڈاکٹر ہالی پوتہ صاحب کے مکان ہی پر قیام تھا۔ اور وہیں سے آپ آپریشن کے لیے ہسپتال تشریف لے گئے تھے۔ اس وقت ڈاکٹر صاحب موصوف جاپان تشریف لے گئے تھے۔ ان کی بیگم صاحبہ (آپا امینہ صاحبہ) نے اپنے مکان ہی پر غسل دلوایا اور انھوں نے نیز محترمہ خیر النساء عباسی صاحبہ نے تجہیز و تکفین کا بندوبست کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

---

[۱] علامہ آئی آئی قاضی صاحب نے اعزازیہ وظیفہ پر آپ کا تقرر فرمایا تھا۔

اشاریہ

فہرست نمبرا

کتب، رسالہ جات، اخبارات، مضامین

فہرست نمبر ۲

(ادارے، مکاتیبِ فکر، تحریکیں، قومیں، تنظیمیں)

فہرست نمبر۳

واقعات

فہرست نمبر ۴

اسماءُ الرجال

فہرست نمبر ۵

مقامات